٤٨٦

سوانح امیر مینائی رح

مولفہ

استاد السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی رح

در مطبع سیدی دار الشفا حیدرآباد دکن طبع گردید

١٣٤٧ھ

حقوق محفوظ ہیں

S. Fazlullah. A

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

از نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی خلف حضرت امیر مینائی

اس زمانے میں واقعہ نگار اور سوانح و تذکرہ لکھنے والے اچھے اچھے لوگ ہیں اور بڑا کام کر رہے ہیں۔ آئے دن کتابیں دلچسپ عبارت میں خوشخط و خوشنما طبع ہو کر نکلتی ہیں جنکو دیکھکر آنکھیں روشن ہوتی ہیں مگر باانہمہ زیبائی و رعنائی ان تالیفات میں اثر نہیں ہے ایکبار دیکھنے کے بعد مشکل سے دوبارہ دیکھنے کی نوبت آتی ہے بخلاف اس کے قدیم تالیفات باوجودیکہ اُنکی عبارت میں کوئی رنگینی نہیں اثر سے لبریز ہیں باربار دیکھنے جی نہیں بھرتا۔ اس تفاوت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگلے مولفین کی غرض و غایت تالیف سے محض اُس شخص کے حالات کا اظہار اور نمود ہوتی تھی جسکا وہ تذکرہ لکھتے تھے اور جدید مولفین کی غرض تالیف سے اپنی نمود ہوتی ہے کیونکہ قدم قدم پر اپنی معلومات کی نمایش میں زور قلم صرف کیا جاتا ہے۔

اس سوانح عمری میں جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے نہایت
سادہ طور سے اپنے اُستاد حضرت والدی ماجدی امیر مینائی کے فضل وکمال کو
اور اُن کے کلام کی منزلت کو ظاہر کیا ہے۔ کہیں نفس شاعری کی موشگافیوں
اور اپنی واقفیت کے اظہار کی کوشش نہیں کی۔ نہ کسی شاعر پر رائے زنی کی
نہ کسی کے کلام سے موازنہ کیا۔

بجز امیر و بجز خوبیِ کلامِ امیر
کسی کا ذکر نہیں ہے کسی کا نام نہیں

کسی شاعر کی سوانح عمری یا تذکرہ لکھنے میں حالات کیساتھ بڑا کام اسکے کلام
کی فراہمی اور اسکا انتخاب ہے۔ کیونکہ شاعر کی زندگی کا سرمایہ اور بقائے نام کا
باعث صرف اسکی تصنیف ہے۔ آج دُنیا کی زبان پر سعدیؔ و حافظؔ کے حالات
نہیں ہیں بلکہ اُنکا کلام ہے۔ نظر برآں جناب جلیل نے اس سوانح عمری میں
زیادہ تر اہتمام انتخابِ کلام ہی کا کیا ہے اور یہی لبِّ لباب حاصلِ کتاب ہے۔
اور خوش نصیبی سے منتخب کلام اور چوٹی کے اشعار اس کثرت سے ملے ہیں
کہ شاید ہی کسی مولف کو میسر ہوئے ہوں۔ منتخب کلام کی کثرت دیکھکے
یہ گمان ہوتا ہے کہ مولف نے زیادہ شعر لئے ہیں لیکن چھوٹے ہوئے اشعار پر
نظر کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب میں کم اشعار لئے گئے ہیں۔
حضرت امیر کے سوانح اور لوگوں نے بھی لکھے ہیں مگر جناب جلیل کی
کتاب ہر اعتبار سے مکمل و مستند ہے۔ انھوں نے حضرت امیر کا ممدوح کلام
جس عنوان اور جس حسن ترتیب سے پیش کیا ہے یہ انہیں کا حصہ تھا

منتخب اشعار جنکو جواہر آبدار کہنا مبالغہ نہیں اس کثرت سے ہیں کہ اُن کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے جس مضمون کو دیکھئے اسمیں دریا بہا دیا ہے اور ہر مضمون کا شعر ایک عالم رکھتا ہے مثلاً۔

رحمت عدالت پر غالب ہے

مرغِ عصیاں اُڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہوگیا
رنگ شاہینِ ترازوے عدالت ہوگیا

قدِ بے سایہ

کھچا ایسا پری نقشہ سراپاے محمد کا
کہ نقاشِ ازل نے آپ سایہ رکھ لیا قد کا

الف آدم میں ہے ممدود احمد میں ہے بے مد کا
سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یاں سایہ نہ تھا قد کا

شوقِ وصال

ہے وصل میں بھی شوق وہی وصل کا باقی
کہتا ہوں مدینے میں بھی میں ہاے مدینہ

بیخودی

سو جان سے اِس بیخودیِ شوق کے صدقے
جب آپ سے باہر ہوے دیکھ آے مدینہ

لذتِ دیدار

نظارہ کر کے رُخِ پاک کا جو پھرتی ہیں
بلائیں لیتی ہیں آنکھیں مری نگاہوں کی

نعت گوئی کی حقیقت

امیر اتنی حقیقت ہے ہماری نعت گوئی کی
ملا ہے مہرباں فریاد رس فریاد کرتے ہیں

سخاوت

سخی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا
مگر جو کسی کو دیا لے گیا

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

قناعت

امیر پاے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے　　کبھی نہ ہاتھ سوا غنیہ بلند ہوا

اخلاق

کیسے ناداں ہیں جو اچھے کو برا کہتے ہیں　　ہو برا بھی تو اُسے چاہیے اچھا کہنا

غربت

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب　　عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا

عید ملنے کی رسم

رسم نے ملنے کی کھو دی عید کی ساری خوشی　　تین دن تک پاؤں رہ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

ہمت

بڑھا اے آہ رسا اب کنگرۂ عرش کے پھونچی　　بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

پیری

پیری میں ضعف سے یہ نہیں رعشہ دار ہاتھ　　ہیں دامنِ قضا کے لیے بیقرار ہاتھ

قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں میں سر کو جنبش　　کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

زبانِ ضعف پیری میں چلتی رہی　　سحر ہو گئی شمع جلتی رہی

دنیا گزران ہے زندگانی فانی　　رباعی　　طفلی مہمان ہے نوجوانی فانی

پیری میں جو ہڈیاں چٹکتی ہیں امیر　　کانوں میں صدا آتی ہے فانی فانی

شرمِ گناہ

لذّتِ شرمِ گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب　　یہ مزہ چکھنے کو پیدا خلق میں آدم ہوا

لاغری

وہ ناتوان ہوں جو لیٹا کبھی میں بستر پہ — گماں ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے چادر پہ

زار ایسا میں ہوا بادیہ پیما ہو کر — ذرہ چاہے تو تھکا دے مجھے صحرا ہو کر

لاغر ہوں اسقدر مجھے پہچانتی نہیں — رہ رہ کے دیکھتی ہی قضا سر سے پاؤں تک

ہوں وہ لاغر در پہ اسکے گر پڑا — کھا کے ٹھوکر سایۂ دیوار کی

عشق و محبت سوز و گداز حسرت و یاس

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش — مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

نہ گل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں روتے ہیں — تمہیں کو بلبلو آتا نہیں انداز شیون کا

کسی گنہ پہ کوئی قتل ہو میں کہتا ہوں — کہ اس سے جرم ہوا ہو گا آشنائی کا

اے جرس تو تو نہیں قافلے والوں سے جدا — تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا

ہمارے رونے پہ آتی نہیں کسے رقت — حباب روتے ہیں آنکھوں پہ رکھکے دامن موج

سنا کسی سے جو نام دوائے درد جگر — تڑپ کے دل نے صدا دی کہ ہائے درد جگر

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں — پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

خون ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر — کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

گل نسیم سحری شمع سحر کو نہ کرے — کوئی دم میں یہ غریب آپ بجھی جاتی ہے

دل ہی نہ رہا امید کیسی — جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

پوچھتے ہیں جو شب ہجر میں ہم شمع سے حال — منہ سے کہتی نہیں کچھ اشک بہا دیتی ہے

نہ تڑپا چارہ گر کے سامنے اے درد دل مجھکو — کہیں ایسا نہو یہ بھی تقاضائے دوا ٹھہرے

رہ رہ کے اک کھٹک سی سینے میں ہو رہی ہے
شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر
دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا

غم اسکا حسرتوں سے پوچھا ہے میرے سینے میں
کہاں ہے وہ جو دل ناکام اک یہاں بیمار رہتا تھا

بیقراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی
درد دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اٹھا

کرنے کو کیا قتل مجھے یار نے لیکن
رہ رہ کے مرے خون کو تلوار سے دھویا

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہمکو امیر
کسی کی آنکھ جہاں ہم پر آب دیکھتے ہیں

کرتے ہیں جو لوگ ذکر ان کا
ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں

صیاد سے چھری کے تلے عندلیب نے
حسرت سے یہ کہا کہ غریب الوطن ہوں میں

آہ کس حسرت سے لیلی نے کہا ہنگام نزع
سونپے جاتی ہوں تجھے اے بیکسی میں قیس کو

بسملوں سے بھی ناز اٹھوائے
ہائے انداز میرے قاتل کے

میں تو روتا ہوں اپنی قسمت کو
تو بتا ابر کس کو روتا ہے

فرقت میں میہمانیِ غم کیا کروں امیر
ٹکڑے ہیں کچھ جگر کے سو وہ بھی جلے ہوئے

کہا مجنوں نے شاید ناقۂ لیلی ادھر آئے
میں اس امید پر چلتا ہوں کانٹے اس بیاباں کے

جو ہوش میں ہیں مجھے لانا ہے دوستو منظور
کہو کہ تجھکو ترے یار نے بلایا ہے

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل
اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

شورِ محشر امیر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

آج تک گور میں لیلی کو نہیں صبر و قرار
میرے مجنوں مرے مجنوں کی صدا آتی ہے

کس نگہ سے تم نے دیکھا تھا امیر
روتے روتے ان کو ہچکی لگ گئی

آپ ہی جل بجھے ہیں پروانے
شمع کی سرگذشت کون سنے

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب / مرے دونوں پہلووں میں دل بیقرار ہوتا

مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشان تک نہ رکھا / میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

پھر بیٹھے بیٹھے وعدۂ وصل اسنے کر لیا / پھر اٹھ کھڑا ہوا وہی روگ انتظار کا

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے / کبھی چمن کو کبھی سوے آشیاں دیکھا

ہمیں اے باغباں غنچوں سے کیا کام / ہم اپنا دل چمن میں ڈھونڈتے ہیں

اے اہل بزم مجکو اٹھاؤ نہ بزم سے / شمع سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہوں

کبھی بد نظر گر عاشقوں کا قتل ہو تم کو / ہمیں بھی یاد رکھنا ہم بھی تمکو پیار کرتے ہیں

ملا کر خاک میں بھی ہائی شرم انکی نہیں جاتی / نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

آکے تربت پہ مری کہتے ہیں لو اٹھ بیٹھو / اب تو مدت ہوئی ہم تمکو ستاتے بھی نہیں

امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہونچوں اُنکے پھولوں تک / کبھی جا کے قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

تجھ سے اے بادِ صبا مجکو یہ امید نہ تھی / چار پھولوں کو ترس جائیگی تربت میری

یاد آتا ہوں کبھی میں تو یہ کہہ لیتے ہیں / ایک جوڑا مرے پھولوں میں بسا رکھا ہے

بولے حسرت سے وہ تابوت کو کاندھا دیکر / بوجھ اٹھواتے ہیں اب ناز اٹھانے والے

میں ہوں وہ کعبہ نشیں جا کے دیر کے در پر / پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

موت آئے یا وہ آئے یا قیامت ہو امیر / اب یہی دو تین جینے کے سہارے رہ گئے

رتبۂ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے / قربان ہونے والے پہ قربان جائیے

ستم ہے تیرے ہوتے آب پیکاں / مرا دل بوند بھر پانی کو ترسے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو / اور معشوقوں کی ہوتی ہے اجازت کیسی

زیست کا لطف تو یاروں ہی کے دم تک ہے امیر / بیٹھ جاتا ہے دل احباب کے اٹھ جانے سے

شبِ غم مجھسے بیٹھا جائے کیونکر — تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

کھا کے تلوار جو قاتل کی فغاں کرتا ہوں — لذتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں

بعد مرگ آئے ہیں وہ تربت پر — اب کہاں جان جو نثار کروں

ٹھہر ٹھہر کے ذرا لیجیو مرا تابوت — کہاں امید کہ پھر آؤں کوے قاتل میں

پہلے زلفوں کو سنگھا کر مجھے بیہوش کرو — پھر مرے سینے سے تم تیر کا پیکاں کھینچو

اسلیے در پر صدا دیتا ہوں میں — بول اُٹھے شاید وہ اتنا کون ہے

فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے — آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں — صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے

میں جو ہر اک سے خطا اپنی بیان کرتا ہوں — ہے یہ مطلب کہ اُسے کوئی ستمگر نہ کہے

رندی و مستی

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پا گیا — اکبار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمت شراب کی — واعظ کے منہ پہ مُہر لگا دوں کباب کی

بھاری بہت ہی لاؤ گے روزِ جزا میں رند — رکھو گے سر پہ شیخ کے گٹھری گناہ کی

قتل موذی کا تو شرعاً ہے درست — ناصح اتنک کیوں سلامت رہگیا

ہماری راے میں بہتر ہے میکشی کو صباح — اب آگے قاضی و مفتی و محتسب کی صلاح

شیخ جی مر گئے ہیں اُن کے مرید — جسِ دم کا گمان کرتے ہیں

گھات میں محتسب کو رہنے دو — مست بھی ہوشیار رہتے ہیں

تجھے کیا ہم جو وصفِ ساقیِ گلفام کرتے ہیں — تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

خُم کے خُم صاف جو کر جاتے تھے دو باتوں میں — ذکرِ خیر آج تک اُن کا ہے خراباتوں میں

تقویٰ کہاں کا جام چلے آج زاہدو
خرقے اُتار اُتار کے بھٹی میں جھونک دو

نہ واعظ ہجوِ مے کر اک دن دنیا سے جانا ہے
ارے منہ ساقیِ کوثر کو بھی آخر دکھانا ہے

پیکے مے بیٹھے وعظ سُننے امیر
یہ بڑی تمنے ہوشیاری کی

مجکو زاہد نہیں حرام شراب
تیسرے دن میسر آئی ہے

تھی اپنی جانماز تو مدت سے رہنِ مے
تسبیح رکھی تھی سو وہ اب گرو ہوئی

قاضی آئے کہ محتسب آئے
ابتو ہم میکدے میں آ بیٹھے

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہدِ نافہم
ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

مجلسِ وعظ میں آنا تو نہ ممکن تھا امیر
ہمکو تھامے ہوئے یاں دستِ سبو لایا ہے

سمجھانے میں تو حضرتِ ناصح کی ایک بات
کچھ خود ہی وہ کہا کیئے خود ہی سنا کیئے

کوئی دم بے تکلف ہو کے مستو ہم اگر بیٹھے
تو جو کچھ عرش پر ہے دیکھلے زاہد وہ گھر بیٹھے

مجلسِ وعظ میں جب بیٹھتے ہیں ہم میکش
دخترِ رز کو بھی پہلو میں بٹھا لیتے ہیں

ملی ہے دخترِ رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے
جہاد کر کے جو عورت ملے حرام نہیں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہو نہیں

واعظ کو تم تو دیکھتے ہی ہنس پڑے امیر
باتیں تو ان بزرگ کی تمنے سنیں نہیں

ساقیا دخترِ رز کا تو بڑا رتبہ ہے
بے وضو میں کبھی چھوتا نہیں پیمانے کو

رندو جو ملو حضرتِ قاضی سے تو دب کے
سمجھو کہ بزرگوں میں ہیں یہ بنتِ عنب کے

خم بھی رویا مجھے پیمانہ بھی رویا مجھکو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے

جامِ مے کاتبِ اعمال کو بھی دے ساقی
وہ بزرگ آئے ہیں ساتھ اگلے زمانے والے

ہجوِ مے ہو چکی منبر سے اب اتریں نیچے
رند کچھ حضرتِ واعظ سے ہیں کہنے والے

کہیئے جو چاہیئے مسجد میں جنابِ واعظ — آپ سے ہم سے تو میخانے میں حضرت ہوگی
ہم وہ میکش ہیں کہ پی جبتک شراب — واں قاضی سے منہ پونچھا کیے
حضرت ناصح یہاں آئے تھے آج — دیر تک کچھ بیٹھے جھک مارا کیے
خدا سے مسلّم اور جو واعظ — ملے دستِ بتانِ نازنیں سے
قاضی و محتسبِ شہر سدھارے حج کو — میکشو خوب پیو حلق کے دربان گئے
زاہد و واعظ کی مجلس سے کسے ہے انکار — تم چلو پیکے میں آیا ابھی میخانے سے
لیگئے مسجد سے مجکو مغبچے — توبہ توبہ میں پکارا ہی کیا
ہے دخترِ رز حلال تجھے کیا تمیز ہے — واعظ یہ زر خرید ہماری کنیز ہے
زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے — پہلے شراب پیکے گنہگار بھی تو ہو
بیعتِ پیرِ مغاں طرفہ مزا دیتی ہے — سلسلہ ساقیِ کوثر سے ملا دیتی ہے

تشبیہات

سارا جہان نام کے پیچھے تباہ ہے — انسان کیا عقیق نگیں سے نکل گیا
ہے دل کا سرد مہریِ معشوق سے یہ حال — جیسے درخت برف سے کوئی جلا ہوا
اخگر کی طرح نیست بتدریج تن ہوا — تن پیرہن تو پیرہن اپنا کفن ہوا
نہیں ہے مہر لفافے پہ خط کے اے قاصد — یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا
ایک سے میرے حضر اور سفر کی صورت — گھر میں ہوں گھر سے نکل کر بھی نظر کی صورت
پیرِ مغاں کی بزم میں بختِ سیہ کہاں — جنت میں جیسے شام نہیں ہے سوائے صبح
سمجھے ہم پہونچی جو ابرو تک پلک اُس آنکھ کی — باڑھ دیکھی رکھکے انگلی ترک نے تلوار پر

صفتِ قطرہ کہیں ہے تاکِ چشمِ ساقی کی
گرے ہیں سیکڑوں میخوار ایک ساغر پہ

رکھا یہ تم نے پائے حنائی رکاب میں
پا پھول بھر دیے طبقِ آفتاب میں

لٹک کر وہ زلف آئی ہے تا کمر
کہ لیلیٰ ہے مجنوں کی آغوش میں

سمجھا یہ میں جو نکلے شاخوں سے گل چمن میں
صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

پلکیں دمِ جوشِ خوں فشانی
دھاریں نظر آتی ہیں لہو کی

چمکتی نہیں ابر سے برقِ تاباں
لٹکتا ہے پردے سے دامن کسی کا

بے ترے حالت ہے یہ گلزار کی
نکہتِ گل سانس ہے بیمار کی

شفقِ شام نہیں ہے یہ مرے ماتم میں
منہ کو آیا ہے کلیجا شبِ تنہائی کا

دل ہے تباہ قافلۂ اشک و آہ میں
گھیرا ہے آندھی پانی نے بیکس کو راہ میں

نہ دو رقیب کو تم داغ اپنی الفت کا
زمینِ شور سزاوارِ لالہ زار نہیں

جو نازک طبع ہیں محفوظ ہیں قہرِ الٰہی سے
کبھی چھالے حبابوں کے نہ پھوٹے خارِ ماہی سے

ہر چند کہ ہو صافِ سخن لاف ہے بیجا
ہوتی ہے گرج جانے سے گوہر کی خرابی

سزا قاضی کی کیا چھڑوائیگی مستوں سے میخواری
قلم جب باغباں کرتا ہے انگور اور پھلتا ہے

بوتلوں سے رات دن ڈھلتی ہے مے
یہ نئی بدلی نئی برسات ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے
کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ پتلی
دلھن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کے وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

حقا کہ دو جہاں میں ہے ذاتِ الٰہ ایک — دو آنکھیں جس طرح کہ ہے اِک ہی نگاہ ایک

نہیں گھبراتے پلکوں نے پیہ چشمِ مستِ دلبر کو — لیا ہے دونوں ہاتھوں سے کسی میکش نے ساغر کو

وہ ہم نازک لبوں کو آنکھ دکھلائے تو کیا گزرے — دکانِ شیشہ گر میں مست آجائے تو کیا گزرے

جینا بھی دل جلوں کو تمہارے ممات ہے — اخگر کو موت قطرۂ آبِ حیات ہے

تصوف

خلوت میں تھا تو شاہدِ معنی تھا میں امیر — خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

شبیہ مد نظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی — مٹادئے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

آوازِ کُن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے — غربت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں

فنا کیسی بقا کیسی جب اُسکے آشنا ٹھہرے — کبھی اِس گھر میں آنکلے کبھی اُس گھر میں جا ٹھہرے

ایک قطرۂ خون ہے دل پردہ قطرہ ہے امیر — غوطے کھاتے پھرتے ہیں جسمیں دو عالم آج تک

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں — تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

بیگانہ ہو کے جب چلا زاہد جو اُسکو ڈھونڈنے — مغفرت بولی اِدھر آ میں گنہگاروں میں ہوں

اِس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — [illegible] تجلی [illegible]

گناہ گر ہم سے بچا تو نہ دیکھا اے دوزخ — خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں

ابتک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی — حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہوں

پردے سے اُسکی ذات کو کیا کام تھا امیر — چھپ کر صفاتِ نامتناہی میں رہ گئی

ملیں ساتھ جسکے ڈرتے ہیں کیوں حضرتِ موسیٰ — طالب ہیں وہ خود دیدۂ دیدار طلب کے

بیرنگ اُسکی شانِ تجلی کے دیکھئے — اتنے عیاں ہوئے کہ نظر سے نہاں رہے

فنا جو سبیلِ فنا ہو بقا کی راہ ملے — یہ قلعہ وہ ہے جہاں موت سے پناہ ملے

او بندۂ بت دیکھ خدا اور ہی کچھ ہے — بت پردہ ہیں پردے میں چھپا اور ہی کچھ ہے

حق شناسی کی حقیقت کو انہیں نے جانا — اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے — سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

بے ثباتی و عبرت

پھولوں سے کہو صبا یہ خوشی کی جگہ نہیں — رونے کا ہے مقام ہنسی کی جگہ نہیں

غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار — مسکرا لینے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں

وہ گلعذار کہ ملتے تھے روز پھولوں میں — انہیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں

جو ہے بہار اسکو خزاں کا خطر بھی ہے — اے باغباں بسنت کی تجھکو خبر بھی ہے

سر راہ عدم گور غریباں طرفہ بستی ہے — کہیں عبرت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر — آئے تھے دنیا میں اس دن کیلئے

قطعہ

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت آسمان پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں

ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — وہ بھی نہ رہینگے جو رہے ہیں

دنیا کا یہ رنگ ہے اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

شوخی

مری صورت جو بدلی فرط غم سے — تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا

تو جواں لوگ کیا نہیں کرتے — دل لگایا تو کیا گناہ کیا

وصل کو ان سے جو کہیے تو کریں وعدۂ حشر — کیجیے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں

میں خار ہوں اے برق جلاتی ہے مجھے کیا — گلچیں ہیں ہزاروں کسی گلچیں کو جلا دے

ہوں میں بیمار محبت کوئی مجرم تو نہیں
میرے گھر پر ہی طبیبوں کی چڑھائی کیسی

دشت میں گھبرا کے جا نکلے جو ہم
قیس بولا پیر و مرشد خیر ہے

مرا خط پھینک کر قاصد کے منہ پر طنز سی بولے
خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں

کہتی ہے شب وصل یہ چتون کی شرارت
آج آگ لگا دونگی میں دامان حیا میں

پھر وہی میں ہوں وہی جامہ دری وحشت میں
پہلے واعظ سے ذرا دست و گریباں ہو لوں

روز آنے کو جب کہا بولے
اک تمہیں مجکو پیار کرتے ہو

پوچھتے ہیں وہ مجھ سے عید کے دن
کہو کیا مل گیا گلے مل کے

قبر کھولی تو مگر یہ مری وحشت سی ڈرا
اپنی چادر بھی نہیں دزد کفن چھوڑ گیا

حکمت مقولہ مسلمہ

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریف شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں

زمانے بھر میں پڑی ہے پکار حاتم کی
دیا ہے جسنے کہ حاتم کو اسکا نام نہیں

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

غفلت میں نہ کھو شباب اے دل
یہ رات ہے جان عمر بھر کی

جو کسی کو برا بھلا نہ کہے
وہ کسی سے برا بھلا نہ سنے

امیر ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں
نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

دنیا ہے طرفہ میکدہ بیخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

امتحانِ دوست دشمن ہے عبث ۔۔۔ یہ تو اپنے دل سے پوچھا چاہیے
جاری ہے لین دین یہ رسم زمانہ ہے ۔۔۔ دریا کا ابر۔ ابر کا دریا خزانہ ہے
حسن کھلتا ہے حسینوں کا جمے جلتی نگاہ ۔۔۔ جسقدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

طور و موسیٰ

بھیڑیں پڑ جائے تا آنکھ اس رخ پر نور پر ۔۔۔ چپ جھکے بیٹھے ہیں کلیم اللہ کوہ طور پر
جو گھر میں پھر کے ہم ان کے حضور سے آئے ۔۔۔ کلیم پھر ملاقات طور سے آئے
ای برق حسن یار یہ اچھا ظہور تھا ۔۔۔ دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا
جمال یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا ۔۔۔ کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا
موسیٰ کو یہ چڑھی ہے کہ برقِ جمال تھی ۔۔۔ اک تہہ اتر گئی تھی تمہاری نقاب کی
کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ ۔۔۔ قطعہ ۔۔۔ خود دید کی اپنی آرزو کی
تھا پردہ ظاہری جو منظور ۔۔۔ آواز بدل کے گفتگو کی
اب عشق میں کلیم کیوں ہو خاموش ۔۔۔ چھلے نہ سنبھل کے گفتگو کی
گرمیِ شوق یہ کہتی ہے چلو دیکھیں تو ۔۔۔ سنتے ہیں طور پہ بھی ایک نہال اچھا ہے
ہیں قائل آپکے روضے کا ہو وہ قائلِ طور ۔۔۔ نعتیہ ۔۔۔ کلیم سے نہ کسی دن کلام ہو جائے

کہاں ہیں جذبات کے دیکھنے والے کہاں ہیں تاثیر کے ڈھونڈنے والے کہاں ہیں صائب کی جدت و تشبیہات پر لوٹنے والے کہاں ہیں خمخانہ حافظ کے متوالے آئیں اور کلامِ امیر کو دیکھیں اور انصاف کریں کہ اسمیں کیا نہیں ہے اور کس چیز کی کمی ہے۔ میرا خیال وثوق کے ساتھ ہے کہ جس مذاق کا جس رنگ کا جس پایے کا شعر مطلوب ہو آپ کو امیر کے کلام میں ملجائے گا اور

ایک نہیں بہتیرے ملینگے ؎

کونسا گل ہے جو اس گلزارِ معنی میں نہیں

کونسا موتی ہے جو ان دریا میں نہیں

میں نے صرف امیر کے تغزل سے بحث کی ہے قصائد کی بلندی و سوخت کی گویائی جو سحر و اعجاز کا نقشہ دکھاتی ہے وہ تعریف سے بالاتر ہے حق یہ ہے کہ امیر کی زبردست شاعری۔ اُنکا علم و فضل۔ اُنکی درویشی۔ اُنکے اخلاق و اوصاف۔ اُنکا زہد و ورع آپ غور سے دیکھیں گے تو اِسکا اعتراف کرینگے کہ ہندوستان میں حضرت امیر کی ذات عدیم النظیر تھی۔ اور حیرت اِس بات پر ہوتی ہے کہ باوجود خدمت سلاطین و باوجود عبادات و ریاضات اُنہوں نے ملک کیلیے اتنا بڑا کام کیا کہ تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائیں جنمیں ہر نسخہ نسخۂ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو

خاص ملبوس اویسِ قرنی نے پایا

دین اللہ کی ہے اسمیں اجارا کیا ہے (امیر)

جناب جلیل کا مُلک پر احسان ہے کہ اُنھوں نے یہ کتاب لکھکر حجابات اٹھا دیے جس سے حضرت امیر کی ملایک قریب تصویر اور اُنکے فضائل و کمالات کا مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

مولانا حالی مرحوم نے مرزا غالب کی سوانح عمری (یادگار غالب) بہت اہتمام سے لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ سوانح نگاری میں مولانا کو ید طولےٰ حاصل تھا مگر اِسکو وہ کیا کرتے کہ انتخابِ کلام اُردو غالب کے شایانِ شان فراہم نہ ہو سکا۔

لہذا مولانا نے حصۂ اول میں غالب کی اعلیٰ شخصیت کا جو وقار قائم کیا تھا وہ حصہ
ثانی میں سرمایۂ کلام کے ناکافی ہونے سے قائم نہیں رہ سکا۔ البتہ فارسی کا
حصۂ کلام بہت شاندار ہے جو مصنّف کی پُرگوئی اور استعداد کامل کو ثابت
کرتا ہے۔ لیکن نظیری و ظہوری کے کلام سے جو موازنہ کیا گیا ہے اُسمیں کہیں
غالب کا غلبہ نہیں پایا جاتا۔

ناسخ کا رنگ شاعری اور اسکا عالمگیر اثر

سوانح عمری کے حصہ دوم میں جناب جلیل تحریر کرتے ہیں
ناسخ نے جسطرح زبان کی اصلاح کی تھی اُسیطرح
شاعری کی بھی جدید بنیاد ڈالی تھی۔ اُنھوں نے اور اُن کے ہمعصروں نے
صائب و کلیم و سلیم کی گویائی اختیار کی تخیّل کو بہت بلندی پر پہونچا دیا جس سے
شعر میں زور اور لنگر پیدا ہوگیا۔ اور بندشیں چست ہوگئیں (اور اس کے ثبوت
میں مولف نے ناسخ اور اُنکے ہمعصروں کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ قابل دید ہیں)
اِس جدّت کا اثر لکھنؤ تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمگیر ہوگیا۔ ہر قابل شاعر اسی جادہ پر
گامزن ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ملاحظہ ہو ناسخ اور ذوق کا ایک ایک مطلع

مرتبہ کم اوجِ رفعت سے ہمارا ہوگیا ۔۔۔ آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا (ناسخ)
نام یوں پستی سے بالاتر ہمارا ہوگیا ۔۔۔ جسطرح پانی کنویں کی تہ میں تارا ہوگیا (ذوق)

اِس بیان کا منشا ناسخ کو اربابِ دہلی پر ترجیح دینا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے
کہ ناسخ کا اگر کوئی پایہ نہ ہوتا تو اکابر شعراے دہلی کلامِ ناسخ کے جواب دینے اور
اُن کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کیوں کرتے۔ اِس اعتقاد کے مدِ نظر میں مناسب
سمجھتا ہوں کہ اساتذۂ دہلی کی چند غزلیں نقل کردوں جو ناسخ کے رنگ میں

کہی گئی ہیں۔

ذوق

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

صراطِ عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دمِ شمشیرِ قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا

ہوا یہ سینہ یکسر خارزارِ دشتِ غم میرا
کہ آیا پاس خوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ اعظمِ وحشت
کہ ہے بکھرے ہوئے رونے میں گو پیچ و خم میرا

نشانِ بے رواجی گر دکھاے زور مٹ جائے
چھپک ہو دیدۂ صراف کی نقشِ درم میرا

وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہو
برنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

نہ ہو بے درد ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے ذوق کب تہ ہو علم میرا

شوقِ نظارہ ہے جب سے اس رخِ پرنور کا
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

اے صنم گر پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اندیشہ ہے مقدور کا

وادیِ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا
پھر اک شعلہ سا ہے سو بھی آپ چراغِ طور کا

تیرے کوچے میں تنِ لاغر ترے رنجور کا
اک غبارِ ناتواں ہے کاروانِ مور کا

باندھتے ہیں مضموں جو اپنی شوربختی کا کوئی
ہو زمینِ شعر میں عالم زمینِ شور کا

تفتہ دل وہ ہوں کہ میرے داغِ سوزاں کے لیے
گرمیِ مرہم سے اڑ جائے اثر کافور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہکن بھی نام اک مزدور کا

بل بے وحشت اب تلک بھی شاخِ آہو کی طرح
پیچ کھاتا ہے دھواں میرے چراغِ گور کا

دیکھنا زہرابِ پیکانِ محبت کا اثر
چشمِ افعی بنگیا روزن ہر اک ناسور کا

ذوق راہِ عشق وہ کوچہ ہے جسکی خاک میں
ہے درِ تاجِ سلیماں بیضہ بیضہ مور کا

مومن

نہ کیونکر مطلعِ دیوان ہو مطلع مہرِ وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرعِ انگشتِ شہادت کا

بچاؤں آبلہ پائی کو کیونکر خارِ راہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا

سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتۂ طاقت کا

نہ یہ دستِ جنوں ہی اور نہ یہ جیبِ جنوں کو شایاں
کہ ہو دستِ شرہ سی چاک پردہ چشمِ حیرت کا

تند سے تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کو طعنے
کہ صفہای خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

نہ پوچھو گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی
بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا

نمک تھا بختِ شورِ فکر خوانِ مدحِ شیریں کو
کہ دندانِ طمع نے خون کیا ہی دستِ حسرت کا

عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل
کہ جسکا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

جراحت زار اک جاں دے کہ جسکی ہر جراحت سے
نمکداں شورِ الفت سے مزا آوے عیادت کا

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

لے اڑی لاشہ ہوا لاغر زبس تن ہو گیا
ذرۂ ریگِ بیابان اپنا مدفن ہو گیا

بن ترے ای شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا
شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا

تھی کمینِ غارتِ بوسِ دہن ہنگامِ خواب
شب کی بیداری سحر کا خوابِ رہزن ہو گیا

ایک ہی جنبش میں تھی صد راحتِ خوابِ عدم
طفلہائے اشک کو گہوارہ دامن ہو گیا

میرے جلنے پر جو رویا غیر تیری بزم میں
سوزِ دل کو آبِ اشکِ آتش پہ روغن ہو گیا

پاؤں زنداں سے اٹھ گیا، سر اٹھا سکتے نہیں — حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہو گیا

شہر میں ہے شہرہ کس قدِ قیامت زا کا کیوں — جلوہ گاہِ حشر ہر کوی و برزن ہو گیا

ہم یقینی جوشِ وحشت سے فلک پر پہنچتے — خارِ دامنگیر، عیسیٰ کی سوزن ہو گیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

خاک اڑانی میں لیے کیا طرزِ جنونِ قیس کی — شاہجہاں آباد سارا نجد کا بن ہو گیا

داغ سینے سے دل و جاں و جگر سب پھک گئے — تھا چراغِ خانہ ہم کو برقِ خرمن ہو گیا

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور سو منہ زور لیا — دو ہی دن میں یہ تو کیا ماہرِ فن ہو گیا

مرزا غالب

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا — کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو — لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے — کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ — سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا — قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نقش فریادی ہے کسکی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غالب کا یہ مقطع بھی قابلِ لحاظ ہے جس میں ناسخ کے مصرع پر مصرع لگا کر اُن کے پایۂ اعتبار کا اعتراف کیا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

غالب نے اِس ایک شعر پر اکتفا نہیں کی بلکہ عودِ ہندی اور نثرِ پنج آہنگ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ عودِ ہندی صفحہ ۱۲۰ میں لکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی
ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔

نثرِ پنج آہنگ میں غالب کے کئی خط ناسخ کے نام ہیں ایک خط میں اپنے کلام کا ذکر لکھا ہے جو تحفتہً ناسخ کو بھیجا ہے اور آرزو کی ہے کہ اُنکی نظر پڑ جائے۔ عبارت یہ ہے ملاحظہ ہو صفحہ (۷۲)

این ورقہا ے بخونِ جگر نگاربستہ ارمغانیست از غالب
جگر خستہ بحضرتِ خداوالامقام سخن سنج معنی پناہاں
امیدگاہِ تطاحی نظام و ظہوری ظہور نظیری نظیر فیضی فیض ضمیری ضمیر

شانی شان نوائی نوا، فغانی فغاں در علم صاحب و در عمل
راسخ مخدوم معظم و مطاع مکرم مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ
اوست و در ریختہ نقش بدیع انگیختۂ او فرستادنِ ایں فہرست
ناوانی بداں دانا آموزگار نہ ازاں روست کہ طبع آہنگ نمائش
وہمت بعرضِ تجمل گرایش دارد بلکہ نامہ نگار دریں پردہ سگالی است
کہ نیز بختِ ایں تیرہ سرانجامانِ قلم و تحریر بلمعانِ نگاہِ قبولِ مولانا روشنی
اندوزد و آنچہ بہ گزلکِ انصاف قابل ازیں اوراق بستردہ
رسیدہ است بغازۂ تحسینِ مخدوم رخِ امتیاز افروزد۔"
صفحہ ۱۱۳ میں لکھتے ہیں۔

سبحان اللہ سخن بر روزگارِ مخدوم بپایۂ بلند رسید وار دورا
رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ نارسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جاے
گرفت و شکوۂ آن بزبانِ قلم رفت مرا آبرو افزود و وارزشِ مرا
در نظرم جلوہ گر ساخت خوشا من کہ در آن چشم و دلم جاے باشد الخ

شعرائے لکھنو کی قادر الکلامی شکاری پرند جب بڑے بڑے شکار مارنے کا خوگر
ہو جاتا ہے تو چھوٹے جانوروں کا شکار اسکے نزدیک کوئی بات نہیں ہوتی اسطرح شاعر کے
شہبازِ فکر کو جب عنقائے بلند پروازِ معانی کے صید پر قدرت ہو جاتی ہے تو ان کے
ساتھ معمولی مضامین جو عصافیر کا درجہ رکھتے ہیں خود بخود آکر اسیرِ دام ہو جاتے ہیں
تلاش کی حاجت نہیں ہوتی بقولِ حضرت اسیرؔ

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے ۔۔۔ خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

تشبیہات میں فکرِ صائب کی فلک پیمائی سب پر ظاہر ہے اُن کے بلند و پُرزور مضامین پہاڑوں کی چوٹیوں سے رفیع تر ہیں جیسے یہ اشعار ؎

دامن کشیدن از کفِ عشاق سہل نیست
یوسف ازیں گناہ بزنداں نشستہ است

صائب زملا یک مطلب رتبۂ انساں — آئینۂ بے پشت چہ دیدار نماید
صائبا خجلتِ سائل بزر و سیم در گرد — سبزہ ای کرد بن اُنچہ لبِ غاروں زر کرد
دست سوال پیشِ کساں کردہ دراز — پل بستہ کہ بگذری از آبروے خویش
سینہا را خامشی گنجینۂ گوہر کند — یاد دارم از صدف این نکتۂ سربستہ را
دہد ثمر زرگ و ریشۂ درخت جنر — شگفتہ ہائے پدر از پسر شود پیدا
حریص را نکند نعمتِ دو عالم سیر — ہمیشہ آتشِ سوزندہ اشتہا دارد

مگر باوجود اسکے ذیل کا رنگ بھی جسکو نشتر کہنا چاہیے ان کے یہاں بکثرت ہے

ہر دم آرزدگی عنب سبب را چہ علاج — ما گزشتیم ز لطفت تو غضب را چہ علاج
فرض کردم کہ بیادِ تو دلم خرسند است — لیکن این دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج
می تواں کرد نہاں عشق زمردم لیکن — زردیِ رنگِ رخ و خشکیِ لب را چہ علاج

زباں زگفتہ بیجا بجاں رساند مرا — لبِ خموشیِ بدار الاماں رساند مرا
زبیکسی چہ شکایت کنم بپیش کسے — کہ بیکسی بہ کسِ بیکساں رساند مرا

یہی حال شعرائے لکھنؤ کا تھا کہ وہ عالی خیال بھی تھے اور سحر مقال بھی بلکہ ناسخ کو اُردو کا صائب کہتے ہیں۔ اصل چیز فکر میں قوتِ معنی آفرینی پیدا کرنی ہے وہ لوگ کسی رنگ میں بند نہ تھے ریختی کہی تو انشا اور رنگین کو طاقِ نسیاں پر

بٹھا دیا۔ واسوخت کیطرف توجہ کی تو صدہا باغ لگا دیے۔ مرثیہ گوئی پر آئے تو
دریا بہا دیا۔ یہ سب اسی قوتِ فکریہ کا نتیجہ تھا جو اُس دور نے ہر طبیعت میں
پیدا کر دی تھی۔ ایک وقت میں رعایتِ لفظی کا بھی وہاں چرچا ہو گیا تھا چنانچہ
امانت نے اسی رعایت کیساتھ تین سو سات بند کا واسوخت کہا جسکی مقبولیت
کے نقوش دلوں سے آجتک محو نہیں ہوئے۔ نواب فردوس مکاں کے ایک
واسوخت میں بہار کا مضمون تھا اُسکی اصلاح میں حضرت امیر نے وہ وہ گل کھلائے
کہ پورا واسوخت تختۂ گلزار بن گیا جو لفظ ہے سدا بہار پھول ہے جو حرف ہے گلاب
کی پنکھڑی ہے۔ مرزا دبیر سے لوگوں نے غیر منقوط مرثیہ کہنے کی فرمائش کی انہوں نے
پورا مرثیہ غیر منقوط لکھکر فکرِ عالی کا اعجاز دکھا دیا اس مرثیے میں تخلص عطارد موزوں
کیا ہے۔

معتبر ذرایع سے یہ حکایت مجھ تک پہونچی ہے کہ مرزا غالب کو اُن کے احباب نے
مرثیہ کہنے پر مجبور کیا دو ایک بند اور کچھ مصرع کہے تھے کہ اس اثنا میں ایک شخص نے
آکر مرزا دبیر کا یہ مصرع پڑھ دیا۔

آہوئے کعبۂ قربانیِ داور ہے حسینؓ

اسپر مرزا غالب لوٹ گئے جو کچھ لکھا تھا پھاڑ کے پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ
انہیں لوگوں کا حصہ ہے۔

شعرائے لکھنؤ کے وہ اشعار جو مقبول ہوکر زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں
اُنمیں سے چند شعر میں اس جگہ لکھدوں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

مصحفی

تھمتے تھمتے تھمینگے آنسو　　رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی — مصحفی

حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کی روئیے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے — 〃

اے مصحفی میں رو دوں کیا اگلی صحبتوں کو — بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں — 〃

دعویٰ کیا تھا گل نے اس گل سے رنگ و بو کا — دھولیں صبا نے ماریں شبنم نے منہ پہ تھوکا — 〃

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے — [illegible]

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا — آتش

پھر بہار آئی چمن میں زخمِ دل آئے ہرے — [illegible] داغ ہائے آتشیں [illegible] — 〃

یہ اسکے ہی ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم — [illegible] تیغِ قضا سے [illegible] — 〃

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے — تماشا ہے کہ آتش میں دھواں ہے — 〃

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں — لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں — آتش

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے — زمیں جس کی چہارم آسماں ہے — 〃

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا — جو آنکھیں [illegible] نظارہ [illegible] — 〃

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا — 〃

دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے — منزل آخر ہوئی شورِ جرس باقی ہے — اسیر

روح کے ساتھ ہی قالب میں قضا بھی آئی — شمع آئی مرے گھر میں تو ہوا بھی آئی — 〃

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا — ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی — 〃

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد — نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد — [illegible]

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں — شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد — 〃

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر — [illegible]

یہی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے	اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر	خواجہ وزیر
نہ گیا نہ بچ گیا چھوڑ کے بسمل قاتل	دہنِ زخم پکارا کیا قاتل قاتل	״
مرچھی نظر دل سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو	کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو	״
جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں	ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں	״
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے	فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے	״
ستمگر نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی	رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی	اختر شاہ
آنکھیں یہ چھینے دیں گی تری بیوفا مجھے	ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے	نجم
نہ پیادہ ہیں رکتے تمہاری مژگاں سے	ستم کی فوج کھڑی ہے پرا جمائے ہوئے	״
کہا کسی نے نہ اتنا ہمارے دفن کے وقت	کہ ان پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں نہائے ہوئے	״
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے	خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے	صبا
سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے	اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے	رند
دکھایا کنجِ قفس مجکو آب و دانے نے	وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد	״
آ عندلیب ملکے کریں آہ و زاریاں	تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل	״
بہارِ عیش ہوتی ہے خزاں پیری ہی آنے کو	جوانی روٹھی جاتی ہے کہیں کس سے منانے کو	قلق
ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا	بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا	״
اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا	سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے	علی حیدر
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے	جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے	نسیم لکھنوی
دونوں کی رہی نہ جان تن میں	کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں	״
کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن ان کا	دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن ان کا	تغیر

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے — سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا — درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

جوبن ابھار پر ہے چمن کو نہ جائیے — بادِ صبا لگائے گی چوری انار کی

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا — دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

فنا کیسی بقا کیسی جب اسکے آشنا ٹھہرے — کبھی اس گھر میں آ نکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

ذیل کے اشعار بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں لیکن مصنفین کے نام یاد نہیں رہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس — یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہیں سیدھا الٹا

محبت ہو کسی سے یا عداوت — مزا دیجائے گی جو دل سے ہوگی

غمِ صیاد و خوفِ باغباں ہے — دو عملے میں ہمارا آشیاں ہے

دربارِ رامپور۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کے دیوانِ دوم کا جو رنگ ہے وہ پہلے دیوان کا نہیں ہے۔ اور اسکی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ دربارِ رامپور میں اجتماعِ شعرا ہونے سے اہلِ دہلی کا اثر لکھنؤ والوں پر پڑا اور حضرت امیر نے داغ کا رنگ اختیار کیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ اسکے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ

دربار رامپور میں بعہدِ نواب خلد آشیاں لکھنو کے شعرا کثرت تھے امیر، امیر، جلال، بحر، قلق، ظہیر، ذکی، عروج، تسلیم، شرف، جان صاحب وغیرہ اور دہلی کے صرف فصیح الملک داغ تھے۔ اور ایک صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا جنکی کوئی نمود نہ تھی۔ فطرت کا مقتضی ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں رہتا ہے اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ نسیم دہلوی کا رنگِ شاعری اسکا شاہد ہے جو لکھنو میں جاکر رہے تھے۔ اسیطرح رامپور کی زبردست سوسائٹی کا اثر داغ پر ہونا لازم تھا اور ہو کر رہا۔ خصوصاً حضرت امیر کی صحبت سے جناب داغ نے معتدبہ فائدہ اٹھایا۔ زبان کی صفائی کلام کی چستی اُسی کا نتیجہ ہے۔ دہلی کی شاعری قابل تعریف مسلّم مگر اُسمیں صفائی نہیں ہے مضامین اندھیری رات میں جگنو کیطرح چمک جاتے ہیں بخلاف اسکے لکھنو کی شاعری ایسی ہے جہاں روشنی ہی روشنی ہے جسمیں شاہدِ معنی کے خط وخال صاف نظر آتے ہیں۔ داغ نے جو اس صاف اور روشن شاعری کو دیکھا تو اُس تاریکی سے نکل آئے اور صاف شعر کہنے لگے۔

تلامذہ ذوق کے کلام اور خود ذوق اور مومن اور غالب وغیرہ شعرا کے دہلی کے دواوین میں ذیل کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

چلون (چلمن) بنھانا (نباہنا) نہوری نظر (نیچی نظر) پیار بروزن بہار آوے جاوے۔ کیجیو لیجیو۔ کشتی عاشق۔ آن پڑی۔ بیداد سوا (بیداد کے سوا) طہور (مے طہور) ولے (مگر) کیونکہ (کیونکر) جا رہے ہے۔ آئے ہے۔ لائے ہے۔ کہے ہے وغیرہ لیک (لیکن) کہوے (کہے) دیکھ (دیکھکر) مت (نہ) ٹک اس رنگ (اس طرح) نے (نہ) پیاس بروزن مراس کسو کے (کسی کے)

چاہیے ہے (چاہیے) قلم مونث (خامہ)۔ شرابی والے (شرابی)
بس چلیں۔ حسرت ارمان۔ فخرِ جہاں۔ استاکھٹ۔ (ناز نخرہ)
(باعلان نون) (باعلان نون)
داغ کا کلام ان الفاظ اور ترکیبوں سے بالکل پاک ہے۔

ظہیر دہلوی تلمیذ ذوق جب حیدرآباد آئے اور حضرت داغ سے ملے ہیں اسوقت موجود تھا جناب ظہیر نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی سننے کے بعد حضرت داغ نے ظہیر سے فرمایا کہ تم نے غزل بڑی فکر سے کہی ہے اور معلوم ہوتا ہے بہت زور لگایا ہے مگر قسم لو جو میں ایک شعر بھی سمجھا ہوں۔ اس سے ناظرین اندازہ کر لیں کہ ظہیر دہلوی کی شاعری سے جو دتی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی داغ کو کسقدر بیگانگی تھی۔

حضرت امیر کی شہرت و مقبولیت ان کے دیوان اول ہی سے ہو چکی تھی اسی شاعری کی بدولت رامپور طلب کیے گئے اور اسی کی بدولت نواب فردوس مکان نے اپنے کلام میں اصلاح لی۔ اور اسی کی بدولت نواب خلد آشیاں نے اپنی استادی کیلئے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ میں امیر کو انتخاب فرمایا اس کے بعد کون سی ضرورت مجبور کر سکتی تھی کہ امیر اپنا طرز سخن چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کرتے۔

نواب خلد آشیاں لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے صرف دلدادہ ہی نہ تھے بلکہ اسمیں ان کو انتہا کا غلو تھا۔ سوا شعرائے لکھنؤ کے کسی کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے دربار میں دلی کی شاعری کا ذکر بھی نہ آیا تھا۔

حضرت داغ کو زمرہ شعراء میں نہیں رکھا گیا۔ [illegible] کے [illegible] کا [illegible]
[illegible] بنا رکھا تھا۔ انہیں [illegible] تخلص
اور صلع مشرب کو یہ [illegible] سمجھ لیا۔

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہارِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اب رہی یہ بات کہ حضرت امیر کے اول و دوم دیوان میں فرق کیوں نظر آتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دیوانِ دوم محض ایک رنگ میں ہے اور دیوان اوّل میں بمقتضائے دورِ ناسخ اور رنگ کے اشعار بھی ہیں۔ اگر وہ اشعار دیوانِ اوّل سے نکال دیے جائیں تو اول و آخر کے دیوان میں کوئی فرق نظر نہ آئیگا۔ جناب جلیل نے اسکے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور دیوانِ اوّل کے بکثرت اشعار نقل کرکے ثابت کردیا ہے کہ دیوان دوم کا یہی رنگ ہے دونوں ایک ترکش کے تیر ہیں۔ اس تفصیل کو حصہ دوم سوانح عمری کے صفحہ ۸۴ تا ۸۷ میں ملاحظہ فرمایئے۔

اختر مینائی
معتمد و ناظم امور مذہبی [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

لکھنؤ جب لکھنؤ تھا تو اسکی آبادی بہت گنجان اور طول و عرض چودہ پندرہ کوس تھا۔ شرفا کی آبادی بہت زیادہ تھی ہر قوم اور ہر طبقے کے شریفوں کا مامن و مسکن اور گلشن بے خزاں کہا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ فردوس منزل کے امام باڑے کے سامنے جس میدان میں اس وقت حضرت قطب الاقطاب مخدوم شیخ محمد شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار ہے یہاں ایک محلہ مینا بازار نام آباد تھا اسی محلے میں جناب مولوی شیخ کرم محمد مینائی ایک عالم باعمل زہد و ورع میں مشہور بزرگ رہتے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔

عہ مینا تعظیم و محبت کا ایک لفظ ہے جو اس زمانے میں استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں میاں کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ طریقت چار واسطوں سے حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے اس طور سے کہ مخدوم شاہ مینا مرید ہیں حضرت شیخ سارنگ رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت شیخ قوام الدین لکھنوی رح کے اور وہ مرید ہیں مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا

مولوی شیخ کرم محمد مینائی کے چھوٹے صاحبزادے حضرت منشی امیر احمد امیر مینائی ہیں۔ جنکی مختصر سوانح عمری اس وقت میں لکھ رہا ہوں۔

امیر کے مورثِ اعلیٰ شیخ عثمان عرب سے ہندوستان آئے اور دارالخلافہ دہلی میں رہے وہاں سے جونپور اور قصبۂ دلمؤ میں قیام کرتے ہوئے لکھنؤ آئے اور اقامت پذیر ہوئے انہوں نے اپنے فرزند شیخ قطب کو یادگار چھوڑا جنکی پشت سے ایک آفتابِ ہدایت طالع ہوا جس کے انوار سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں یعنے شیخ محمد عرف مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ نسب کی ترتیب یہ ہے، امیر احمد ابن شیخ کرم محمد ابن شیخ محمد معظم ابن شیخ محمد اعظم ابن شیخ خواجہ احمد ابن شیخ صالح ابن شیخ خواجہ ابن شیخ مبارک ابن شیخ حسین ابن شیخ گدائی ابن شیخ نظام ابن شیخ الہداد ابن شیخ ابراہیم ابن شیخ قطب الدین جانشین و برادر زادہ مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ ابن شیخ نصیر الدین ابن شیخ قطب ابن شیخ عثمان۔

مولوی شیخ کرم محمد اپنے خاندان کی قابلِ فخر یادگار اور جانشین تھے۔ یہ خاندان علم و فضل اور درویشی کی حیثیت سے معزز و محترم تھا۔ علاوہ عوام الناس کے شاہی خاندان میں بھی وہ موقر تھا۔ اطمینان اور آزادی کے ساتھ علوم و فنون۔ مجاہدہ اور مشاہدہ میں مصروف تھے۔ مولوی شیخ کرم محمد نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑ کر انتقال فرمایا اور لکھنؤ ہی میں دفن ہوئے۔ امیر مرحوم اپنی ایک بہن سے بڑے باقی سب بھائی بہنوں سے چھوٹے تھے۔

بھائیوں میں سب سے بڑے مفتی طالب حسن مرحوم تھے پہلے یہ عدالت دیوانی لکھنؤ میں ملازم رہے پھر وہیں کی نظامتوں میں میر منشی ہوئے۔ جب غدر کا طوفان اٹھا تو یہ رامپور چلے آئے اور اکیس برس عدالت دیوانی کے اعلیٰ حاکم رہے۔ بہتر سال کی عمر میں بمقام میو رقعات کی ادر وہیں دفن ہوئے۔ بہت ہی کریم النفس اور عمدہ صفات کے بزرگ اور منشیِ

بے بدل تھے۔

شیخ عنایت حسین منجھلے بھائی کا نام تھا۔ یہ جید عالم تھے تمام عمر درس و تدریس میں بسر کر دی ان کا حافظہ اسقدر قوی تھا کہ قرآن مجید ایک مہینے میں حفظ کر کے سنا دیا تھا۔ لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیم و تربیت

حضرت امیر کی ولادت ۱۶ شعبان روز دوشنبہ ۱۲۴۴ھ میں بعہد دولت نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئی۔ بہت ہی کم عمری میں ابتدائی تعلیم شروع کی گئی اور جیسا کہ دستور ہے ایک مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم کا آغاز کرایا، عام لڑکوں کے خلاف مستعدی اور تعلیمی شوق و ذوق ایک طرف تو قدرت نے عطا کیا ہی تھا دوسری طرف اس موثر تربیت کا نتیجہ تھا جو مولوی شیخ کرم محمد اپنے ہونہار فرزند کو دے رہے تھے۔

اس زمانے میں عربی علوم و فنون کی تکمیل ضروری سمجھی جاتی تھی خصوصاً اس نامور اہل علم کے خاندان میں تو عربی کی تعلیم لازمی تھی جس کے اکثر افراد عربی علوم و فنون کے ماہر تھے گیارہویں برس امیر مرحوم نے عربی زبان کی ابتدائی کتابیں اپنے منجھلے بھائی مولوی حافظ عنایت حسین سے شروع کیں جو اپنی آبائی مسند پر متمکن ہو چکے تھے۔ اور فیض تعلیم ان سے جاری تھا۔

امیر مرحوم کی عمر ابھی نو برس چھ مہینے کی تھی کہ ان کو یتیمی کا داغ نصیب ہوا یعنی ان کے والد شیخ کرم محمد نے دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ یہ ایسا سخت حادثہ تھا جس سے غالباً امیر مرحوم کی آیندہ تعلیم و تربیت پر خراب اثر پڑتا مگر خوش نصیبی سے ان کے بڑے

بھائی مفتی طالب حسن مرحوم جو اُس وقت میر منشی نظامت اور برسرِ عروج تھے چھوٹے بھائی کی پرورش اور تربیت میں شفیق باپ کی طرح مصروف رہے چنانچہ امیر مرحوم خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"بڑے بھائی کے تادمِ حیات مجھے کبھی اس کا موقع نہیں ملا کہ میں اپنے والد ماجد سائہ شفقت سر سے اٹھ جانے کا اثر محسوس کرتا"

الغرض مفتی طالب حسن مرحوم کے حسنِ توجہ سے امیر کا سلسلۂ تعلیم ٹوٹنے نہ پایا بلکہ انہوں نے بیش از بیش اُن کی تربیت و تعلیم پر توجہ کی۔ عربی صرف و نحو کی تکمیل امیر نے اپنے منجھلے بھائی سے کی اسکے بعد دیگر اساتذہ سے مختلف علومِ عربیہ کی تکمیل کا قصد کیا۔ فرنگی محل میں علم و فضل کے چشمے اُبل رہے تھے۔ حضرت امیر کو بھی اِس آبِ حیات سے سیراب ہونے کا موقع ملا۔ مفتی محمد یوسف صاحب اور مولانا عبدالحکیم صاحب سے آپ نے منقولات کی تحصیل کی اور معقولات مفتی سعد اللہ صاحب سے پڑھے۔ اور مولوی تراب علی صاحب لکھنوی سے ادب کی تکمیل کی۔ یہ بات اُس وقت خواصِ شہر میں مشہور ہو گئی تھی کہ ادب کی طرف مولوی امیر احمد مینائی کا رجحان زیادہ ہے اور یہ معانی و بیان کی کتابیں نہایت صفائی سے طلبہ کو پڑھاتے ہیں۔ جامع العلوم ہو کر اور سندِ فضیلت حاصل کرنیکے بعد آپ نے علمِ طب کی طرف توجہ کی اور نواب حکیم محمد حسن خاں بریلوی سے اِس فن کو بھی حاصل کیا۔ نواب صاحب حکیم مرزا محمد علی صاحب کے شاگردِ رشید تھے اور اُس وقت مرزا محمد علی سے زیادہ نامور طبیب کوئی دوسرا نہ تھا اُن کے قصے زبانوں پر آجتک ہیں۔ گو علم جفر امیر نے کسی سے پڑھا نہیں بلکہ مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ علمِ جفر کے ماہر ہو گئے تھے۔ اِس علم میں آپ نے دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ رمز الغیب

اور رموزِ غیبیہ۔ ان دونوں کا نام ہے غرضکہ جملہ علوم پر آپ کی نظر عالمانہ و فاضلانہ تھی انیس ۱۹ بیس ۲۰ برس کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

سلوک و درویشی

فقر اور درویشی آپ کی گھٹی میں پڑی تھی کیونکہ وہ خاندان ہی درویشوں کا تھا؛ زہد و تقوے کے دامن میں اُنھوں نے پرورش پائی۔ ریاضت و عبادت کے آغوش میں تربیت ہوئی ہوش سنبھالا آنکھ کھول کر دیکھا تو گھر میں سب کو اسی رنگِ درویشی میں ڈوبا ہوا پایا۔ امیر مرحوم نے مزار حضرت شاہ مینا رح سے فیضِ باطن حاصل کرنا شروع کیا بیشتر اوقات مزار پر بیٹھے مراقب رہا کرتے تھے اور ذکر و اشغال طریقۂ آبائی میں مشغول رہ کر بطورِ خود ریاضت کرتے تھے۔ مخدوم شاہ مینا رح کی روح پرفتوح تعلیم باطنی کی طرف متوجہ تھی اور اُسی جانب سے بعنایت الہی امیر کی تربیّت ہوتی رہی۔

ہنوز کسی شیخ سے بیعت ظاہری کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک دن مراقبے میں معلوم ہوا کہ حضرت شاہ مینا رح نے ایک درویش کی صورت اُن کو دکھا کر ارشاد فرمایا کہ تم ان کے ہاتھ پر بیعت کر لو بعد ازاں خواب میں بھی اس واقعہ کو کئی بار دیکھا اور منتظر رہے کہ وہ درویش جن کی صورت دکھائی گئی ہے مل جائیں تو ارشادِ مخدوم صاحب رح کی تعمیل کیجائے۔ مزار پر کثرت سے درویش نزدیک و دور کے حاضر ہوا کرتے تھے اور ہر ایک نئے آنیوالے سے امیر مرحوم ملتے تھے اور اپنے مقصود کے جویا رہتے تھے۔ اسی اثنا میں اسی صورت کے ایک بزرگ جنکی تلاش تھی مزار پرانوار پر حاضر ہوئے۔ یہ درویش

امیر شاہ نامی ریاست رامپور کے رہنے والے سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے شیخ تھے۔ امیر مرحوم نے انکو پہچان لیا اور بے اختیار اُن کی طرف متوجہ ہوئے میاں امیر شاہ بھی اُن کو دیکھکر مسکرائے اور کہا کہ اب وقت تمہاری بعیت کا آگیا ہے غرض اُن کے ہاتھ پر بعیت کی اور سلسلۂ صابریہ کے اشغال میں حسبِ ہدایتِ شیخ مشغول ہوئے امیر شاہ صاحب آستانۂ مبارک پر بہت عرصے تک مقیم رہے اور حسنِ اتفاق دیکھئے کہ جب لکھنو مٹ گیا تو امیر رامپور ہی میں جا کے مقیم ہوئے جو اُن کے شیخ کا مسکن تھا۔ گویا یہ کشش شیخ ہی کیطرف سے ہوئی جب تک شیخ زندہ رہے دونوں یکجا رہے اور امیر نے تمام مدارج سلوک طے کر کے خلافت نامۂ شیخ سے حاصل کر لیا۔ آپ نے مخصوص اشخاص کو مرید کیا اور سلوک کی تعلیم دی لیکن بوجہ مشغولیِ خدمتِ سلاطین سلسلہ پیری مریدی بڑھایا نہیں۔

ابتدائے سلوک میں امیر پر ایسی محویت طاری ہوئی اور ایسا استغراق ہوا کہ دنیا کے سب کام کاج سے معطل ہو گئے یہ حال دیکھ کے اُن کی والدۂ ماجدہ نے شیخ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ ایسی توجہ فرمائے کہ اس حالت میں سکون ہو اور

ع امیر شاہ صاحبؒ علم و فضل میں اور بالخصوص درویشی میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے، ان کے تصانیف میں ایک بڑی کتاب تعلیم الخواص ہے جو سلوک میں نہایت بسیط اور جامع اور سالکین کیلئے چراغ ہدایت ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے فارسی میں اُن کے اشعار زیادہ ہیں۔ اردو میں کم۔ ایک مشہور غزل اکثر سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی ہے جسکے چند شعر یہ ہیں ؎

یہ جو صورت ہے تری صورتِ جاناں ہے یہی — یہی نقشہ ہے یہی رنگ ہی ساماں ہے یہی
بسترِ ٹاٹ کا دو پارچے کمل کی کلاہ — تاجِ خسرو ہے یہی تختِ سلیماں ہے یہی
اپنی ہستی کے سوا غیر کو سجدہ ہے حرام — مشربِ پیرِ مغاں مذہبِ رنداں ہے یہی

دنیاوی امور کیطرف بھی امیر متوجہ ہوں شیخ نے اپنی کلاہ سر سے اُتار کے بھیجی اور کہا کہ اس کو امیر کے سر پر رکھو۔ اُس کلاہ کے رکھنے سے اُس حالت سے افاقہ ہوگیا اور استغراقی کیفیت میں جو شدت تھی وہ جاتی رہی۔ امیر کو اُس کیفیت کے جانے کا صدمہ ہوا کیونکہ اسمیں لذت ہی اور تھی۔ اپنے پیر سے اسبارے میں عرض کیا۔ پیر نے فرمایا کہ تمہارا لطف جاتا نہیں ہے اس وقت مصلحت ایسی ہی تھی آیندہ یہہ کیفیت پھر عود کرآئے گی چنانچہ آخر وقت میں شیخ کے ارشاد کا ظہور اچھی طرح دیکھا گیا۔

مخدوم صاحب کے مزار پر سماع کا جلسہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور اب تک جاری ہے امیر مرحوم سماع کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے مگر رامپور میں کبھی نہیں دیکھا کہ سماع میں شرکت کی ہو بات یہ ہے کہ درویش دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ارباب تلوین کہلاتے ہیں اور ایک ارباب تمکین حضرت امیر کو لکھنؤ میں ارباب تلوین کی صحبت حاصل رہی لہذا سماع کے جلسوں سے فائدہ اٹھانے میں کچھ تامل نہیں کیا۔ بخلاف اس کے رامپور میں زیادہ تر صحبت اربابِ تمکین کے ساتھ رہی مثلاً میاں سید حسن شاہ صاحب محدث۔ میاں سید محمد شاہ صاحب محدث حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی وغیرہ سے مجاورت اور رات دن ملنا جلنا رہا لہذا زہد و ورع اور عزلت نشینی کے ساتھ ریاضاتِ ظاہری و باطنی اور مراقبات و عبادات اور اتباعِ سنت و تلاوتِ قرآن میں مصروفی رہی۔ سماع کی طرف جانیکی ضرورت نہیں ہوئی۔

لذت سماع کی اسقدر تھی کہ جہاں کسی خوش گلو کو کچھ پڑھتے سُن لیتے تھے بے اختیار ہوجاتے تھے۔ نعتیہ کلام اکثر لحن کے ساتھ پڑھواتے تھے اور بجائے خود وجد کرتے تھے۔

حفاظ و قرار کے پڑھنے پر خاص کیفیت ہوتی تھی کہ بیان میں نہیں آسکتی جو حافظ مل جاتا تھا اُس سے فرمائش قرآن سُنانیکی ہوتی تھی اور سفر و حضر میں ہر جگہ ہمیشہ یہی معمول رہا اور یہ لذت اُن کی روحانی قوت کا نتیجہ تھی ۔

امیر مرحوم میں ایک معصومیت کی شان پائی جاتی تھی جو اعلیٰ درجہ کی درویشی اور فقر کی حالت میں علی العموم پائی جاتی ہے یعنی دنیا کی چالوں اور ترکیبوں اور دنیا سازی سے وہ بالکل ناآشنا تھے باوجودیکہ فراست ظاہری و باطنی اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے اور یہ معصومیت فطری تھی ۔ بعض واقعات کے بیان میں بسبیل تذکرہ اُن کی زبان سے سُنا گیا کہ میں نے مدت تک یہ نہیں جانا کہ روپیہ پیسے کی لوگ کیوں بہت قدر کرتے ہیں اور کیوں اُس کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ میں ذی ہوش تھا ۔ ایکمرتبہ میں نے بیرونی مکان کے طاق پر جہاں میری کتابیں رکھی تھیں زیادہ مقدار میں روپیئے رکھدیئے تھے ایک شخص کو معلوم ہوا تو اُس نے روپیہ چھپا کر لینا چاہا اتنے میں میں باہر سے آگیا ۔ وہ شخص روپیے لیکر بھاگا اور کچھ روپیے زمین پر گر بھی گئے ۔ میں نے جو یہ واقعہ دیکھا تو مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس نے روپیے لیلئے تو چھپایا کیوں اور پھر بھاگا کیوں ۔ کہتے تھے کہ مجھ کو بہت دنوں تک اسپر استعجاب اور تحیر رہا اور یہ بھی اُن کی زبان سے سنا کہ مدت تک مجھے اس بات کا یقین نہیں ہوا کہ لوگ فریب بھی کرتے ہیں اور جھوٹ بھی بولتے ہیں ۔

حصول سلوک کے اثنا میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ اُن کی قوت خیالی بہت بڑی ہوئی تھی یعنی جس بات کا تصور جزم کے ساتھ کر لیتے تھے اُس کا ظہور فوراً ہو جاتا تھا ۔ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ گھر میں بہت عسرت تھی جو درویشی کی خاص شان سے ہے ۔

اُس زمانے میں کبھی کبھی اُن کی والدہ کہتی تھیں کہ امیر آج نہایت تنگی ہے۔ یہ کہتے فلاں طاق پر روپیے رکھے ہیں۔ وہ اُس طاق سے روپیے لے لیتی تھیں۔ یہ واقعہ میں نے ان کی زبان سے سُنا ہے۔

آپ کا سلسلہ طریقت حضرت خواجہ بزرگ تک اس طرح پہنچتا ہے کہ امیر مینائی مرید اور خلیفہ میاں امیر شاہ چشتی صابری کے ہیں اور وہ خلیفہ غلام شاہ کے ہیں اور وہ شاہ عبدالکریم کے اور وہ شیخ عنایت جی کے اور وہ حضرت شاہ بھیک کے اور وہ شاہ ابوالمعالی کے اور وہ شیخ داؤد کے اور وہ شیخ محمد صادق کے اور وہ شاہ ابوسعید کے اور وہ شیخ نظام الدین بلخی کے اور وہ شیخ جلال الدین تھانیسری کے اور وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اور وہ شیخ محمد جی کے اور وہ شیخ عارف جی کے اور وہ حضرت شیخ احمد عبدالحق رُدولوی کے اور وہ شیخ جلال الدین کے اور وہ شیخ شمس الدین ترک پانی پتی کے اور وہ حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر کے اور وہ بابا فرید گنج شکر کے اور وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اور وہ خلیفہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔

شاعری

قدرت نے یہ طے کر دیا تھا کہ ہونہار اور فاضل اجل امیر ایک زمانے میں ملکِ سخن کے بادشاہ ہوں گے اور امیر الشعرا کہلائیں گے اس لیے امیر کی طبیعت بہت کم سنی ہی سے شعروسخن کی طرف مائل تھی ان کا زمانہ طالب علمی بھی شعر گوئی سے خالی نہ تھا اور اگرچہ انہوں نے ظاہر طور پر اشعار نہیں کہے لیکن اندر ہی اندر وہ شاعری کے نشے سے سرشار رہتے تھے۔

علوم عربیہ کی تکمیل کے اثنا میں انہوں نے علم معانی و بیان اور ادب کی تحصیل اور اُس کے نکات کے حل کرنے اور موشگافیاں کرنے میں زیادہ نام پایا۔ علم ادب کے استاد مولوی تراب علیصاحب کہتے تھے کہ ادب کا امیر ماہر کامل ہے، کچھ شک نہیں کہ شاعر کی طبیعت قدرت الٰہی کا مظہر ہوتی ہے اور اُس پر انوار قدس کے تجلیات روشن ہو کر ایک خاص قسم کا سوز و گداز پیدا کر دیتے ہیں جسکی وجہ سے جذبات باطنی کا اظہار شعر گوئی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر اُس پر طرہ یہ کہ لکھنؤ کی آب وگل میں مذاق سخن پڑا ہوا تھا عہد شاہی میں شاعری بھی ہر دلعزیز اور اوج کمال پر تھی اور نظم میں پایہ پانیوالے چاروں طرف نظر آتے تھے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کو یکساں مذاق تھا اور بادشاہ سے لیکر معمولی شخص تک شعر گوئی کا والہ وشیدا تھا۔ مزید براں حکومت کی قدر دانی اور سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی اور اسیر۔ وزیر۔ انیس و دبیر وغیرہ کی موجودگی نے شاعری کے جسم میں تازہ روح پھونکدی تھی خود امیر مرحوم کے والد اور بھائی شعر کہتے تھے ایسی حالت میں امیر کا اس کم عمری میں شعر کہنا کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔

اگرچہ امیر پوشیدہ طور پر ابتدا میں شعر کہتے تھے اور کسی کو سناتے نہ تھے لیکن یہ بات پوشیدہ کیونکر رہ سکتی تھی۔ شدہ شدہ ان کے والد ماجد کو خبر ہوگئی چنانچہ ایک رات جبکہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور چاندنی کھلی ہوئی تھی اُن کے پیرانہ سال والد عشا کی نماز پڑھکر جانماز پر لیٹ گئے۔ سعادتمند بیٹا پاؤں دبا رہا تھا۔ والد نے شفقت سے پوچھا کہ میاں امیر میں نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو میں بھی تو سنوں کہ کیسے شعر کہتے ہو۔ امیر نے شرم سے انکار کیا مگر اُدھر سے اصرار رہا۔ بالآخر بصد ادب یہ شعر پڑھا اسوقت آپ کی عمر نو برس کی تھی ؎

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اِس غم سے مرے آنسوؤں کی ہے یہ روانی

والد بزرگوار ہونہار بیٹے کی طباعی کا اندازہ کر کے دل میں تو ضرور خوش ہوئے ہونگے مگر بہت دیر تک نصیحت کرتے رہے کہ بیٹا ابھی پڑھنے لکھنے کا وقت ہے علم و فضل حاصل کرو تاکہ خاندان کی عظمت قایم رہے۔ بعد فراغ تحصیل جیسا جی چاہے شعر کہہ لینا۔ سعادتمند بیٹے نے سکوت اختیار کیا مگر فطرتی جوش کہیں روکے سے رک سکتا ہے زمانۂ تحصیل علم ہی میں اُنھوں نے اس فن میں بڑی حد تک ترقی حاصل کی اور اُس قدرتی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو امیر مرحوم تحصیل علم میں مصروف تھے دوسری طرف شعر گوئی کا مشغلہ ترقی استعداد کے ساتھ بڑھتا گیا مولوی تفضل حسین فتحپوری کے مشاعروں میں آزادی کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ شاعروں میں امیر کے کلام نے بڑا نام پایا اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس مشاعرہ میں اکثر ذی استعداد اور کاملین فن شریک ہوا کرتے تھے درحقیقت امیر مرحوم کی شاعری کی ترقی کا آغاز یہیں سے ہوا اور ان کے اشعار کی چاروں طرف سے تعریفیں ہونے لگیں اور بیس پچیس شاعر اُن سے کلام میں اصلاح لینے لگے۔ آپ نے اپنا تخلص اپنے نام کے ایک جز کو کیا تھا جسکو وہ بہت پسند کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر — یہ بڑا حُسنِ خداداد مرے نام میں ہے

ایک غزل کے مقطع میں حضرت نے اپنا پورا نام نظم کیا ہے۔

پیاس اِسکی جو بجھے گی تو مئے کوثر سے — ظرف عالی ہے امیر احمد مینائی کا

ایک اور شعر میں بطور سجع کے اپنا نام موزوں فرمایا ہے۔

سے اے امیر احمد مرسل کے جو ہیں چار وزیر   چار یاری ہوں سمجھے ہیں یہ بڑا بچار دل

امیر کی یہ خدا داد ذہانت اور فطرتی موزونیت تھی کہ وہ اسوقت تک بغیر کسی استاد کے اصلاح لئے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ابتک انہوں نے کوئی استاد منتخب نہ کیا تھا لیکن شوقِ ترقی سخن نے انہیں ترغیب دلائی کہ کسی استاد سے اصلاح کلام کی درخواست کرنا چاہیے۔ چنانچہ نذیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں بہادر اسیر کے سامنے اپنا کلام اصلاح کیلئے پیش کیا اسمیں کوئی شک نہیں کہ امیر نے استاد کا کلام اور ان کی قابلیت اور ان کے طریق اصلاح کو دیکھکر اپنی استادی کے لئے انہیں منتخب کیا تھا جیسے جیسے وہ اپنے کلام میں اصلاح لیتے گئے یہ انتخاب قابل قدر ثابت ہوتا گیا۔

حضرت اسیر نے ہونہار شاگرد کی طرف نہایت توجہ کی اور ان کی ذہانت اور طباعی کے گرویدہ ہو کر بزرگانہ شفقت کے ساتھ اصلاح دینے لگے جب امیر سا قابل شاگرد ملے اور حضرت اسیر سا استاد جو مراتب تحقیق میں کمال رکھتا ہو تو شاگرد کے کلام میں استاد کی اصلاح ایسی ہوتی ہے جیسے سرو و صنوبر کی پیرایش کے لئے باغبان کی والا نظری۔ یا چمن شاداب کی نشو و نما کے واسطے ابر بہاری کا ترشح یا آئینے کی جلا کے لیے صیقل چنانچہ روز بروز کلام میں فرق نظر آنے لگا پہلی غزل جو استاد کے سامنے بغرض اصلاح پیش کی گئی اُس کا مطلع یہ ہے۔

دل میں اپنے جب خیالِ زلفِ جاناں ہو گیا
آنکھ میں خوابِ پریشاں سنبلستاں ہو گیا

امیر مرحوم بیان کرتے تھے کہ جناب اسیر نے غزل دیکھکے فرمایا کہ سب شعر اچھے ہیں۔ اصلاح کی حاجت نہیں سمجھا ان کے فرمانے سے بجائے خود یہ گمان ہوا کہ

ان اشعار میں تصرف کی گنجایش نہیں ہے مگر اس پر بھی میں نے استاد سے اصرار کیا تھا کہا کہ آپ اس میں اصلاح دیں۔ وہ میرے خیال کو سمجھ گئے اور اکثر شعروں میں ایسا تصرف کیا جسکی امید مجھے ہرگز نہ تھی۔

اس موقع پر امیر مرحوم کو ایسا خیال جو پیدا ہوا اُسکی دو وجہیں قیاس کیجا سکتی ہیں اوّل تو یہ کہ وہ غزل پیش کرنے سے پہلے اہلِ سخن سے اپنے کلام کی داد پا چکے تھے دوسرے یہ کہ استاد کا فرمانا کہ اصلاح کی حاجت نہیں دال تھا کہ کلام میں سقم نہیں مگر استاد کی نظرِ تحقیق نے شاگرد کے اصرار سے اپنا پایۂ استادی دکھا ہی دیا۔

اسیر کی استادی اور اصلاح سے امیر کا کلام جسقدر چمکا اُس کے بیان کرنے کی مطلق حاجت نہیں مگر چونکہ وہ پہلے پہل اصلاح کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور کبھی کسی استاد سے مشورہ نہیں کیا تھا اسلیے اصلاحِ کلام کے حُسن و قبح سے ماہر نہ ہوئے تھے۔ جوشِ طبیعت سے جو کچھ کہتے تھے۔ اُسکے الفاظ اور معانی کی صحت کا اندازہ علمی معلومات سے کرتے تھے مگر نشستِ الفاظ۔ ایک لفظ کی ترقی اور دوسرے لفظ کا تنزّل ترکیب کی خوبی وغیرہ کے اندازہ کرنے کا موقع نہ آیا تھا اور جیسا کہ ایک ذہین اور لایق شاگرد کا طریقہ ہوتا ہے استاد کی ہر بات پر بجائے خود غور کرتے اور اسمیں باریکیاں نکالتے تھے۔ چنانچہ امیر نے استاد کی اِصلاح اور اصلی اشعار کو اپنے طور پر جانچا جسمیں کہیں کہیں اسیر کے تصرفات کو ناپسند کیا۔ اِس بارے میں امیر مرحوم کا بیان حسبِ ذیل تھا۔

"میری پہلی غزل میں جو اصلاح ہوئی سب تصرفات مجھے پسند نہ آئے میں نے جو جوہِ تصرف کی نسبت کچھ کہنا چاہا اس پر جناب اسیر نے فرمایا کہ تم اصلاحِ کلام جمع کرتے جاؤ چند روز کے بعد اس پر نظر ڈالنا

اور کوئی شبہ پیدا ہو تو مجھ سے دریافت کر لینا میں نے اسی پر عمل کیا
اصلاح لیتا رہا۔ اور اُس کو رکھتا گیا۔ ایک عرصے کے بعد اُن تصرفات کو
دیکھا تو ایک ایک نقطہ پر جی لوٹ گیا۔"

اُس زمانے میں جو لوگ ممتاز اور سربرآوردہ شاعر مانے جاتے تھے اُن میں خواجہ
وزیر نہایت مؤثر تھے۔ قاعدہ ہے کہ ہم فن اور ہم مذاق ہی کی صحبت پسند کی جاتی ہے
امیر مرحوم بھی ابتدا ہی سے خواجہ وزیر کے پاس اکثر نشست و برخاست رکھتے تھے
اوّل تو خواجہ وزیر با کمال شاعر تھے دوسرے یہ کہ اُن کا مکان بھی قریب ہی تھا
یعنی ہم محلّہ تھے۔

کبھی کبھی امیر مرحوم خواجہ صاحب کے سامنے اپنا کلام بھی پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب
اُن کی ذکاوت اور طبّاعی کے دلدادہ ہو گئے۔ بعض اوقات بطور پیشین گوئی کہتے تھے
کہ یہ تھوڑے ہی زمانے میں شاعری کی دنیا کو آباد کریں گے اور اپنے اخوان پر گوے
سبقت لیجائیں گے۔

خواجہ وزیر کی خواہش تھی کہ امیر مجھ سے تلمذ اختیار کریں۔ مگر خواجہ صاحب کا
طریقۂ اصلاح اچھا نہ تھا۔ وہ بجائے اشعار درست کرنے کے بیشتر خود اشعار کہکے
غزل میں شامل کر دیتے تھے۔ اس طریقۂ اصلاح کو امیر مرحوم نے پسند نہ کیا۔

امیر جب حضرت اسیر کے شاگرد ہوئے تو خواجہ وزیر نے بزرگانہ شکایت کی کہ
تم نے جو گرمیِ طبیعت اور بلندیِ خیال پائی ہے اُس کا مقتضیٰ یہ نہ تھا کہ تم اسیر کو
اپنا کلام بغرضِ اصلاح دکھاؤ مگر امیر مرحوم تو بجائے خود پہلے ہی اس کا فیصلہ کر چکے تھے۔
اس گفتگو سے اُن کا خیال کیوں کر پلٹ سکتا تھا وہ اس کا امتحان کر چکے تھے کہ اسیر کا

مرتبۂ شاعری کیا ہے۔ علمی سرمایہ اور فضل و کمال کی کیا شان ہے اور استاد کی محققانہ نظر شعر و سخن میں کہاں تک بڑھی ہوئی ہے۔

ایک مشاعرہ میں خواجہ وزیر اور حضرت اسیر بھی موجود تھے۔ امیر نے یہ شعر پڑھا

دل ہی نہ رہا امید کیسی
جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

اس شعر پر امید سے بڑھ کر امیر مرحوم کو داد ملی۔ خواجہ وزیر اس شعر کو سن کر بے اختیار بول اُٹھے "امیر بڑے خوش نصیب ہو خوب اسیر کیا"۔

اُستاد نے ڈیڑھ دو برس کے بعد اصلاح کی قید اٹھا دی تھی مگر امیر مرحوم باصرار برابر اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اور جب تک حضرت اسیر زندہ رہے یہی عمل جاری رہا۔

تدبیر الدولہ حضرت اسیر شاہ اودھ کے میر منشی خاص یا پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ اور مصاحب بھی تھے۔ اب امیر مرحوم اکثر اوقات انہیں کی خدمت میں رہنے لگے جتنی فرصت بڑھی اتنی ہی مشق سخن میں ترقی ہوئی بہت سا وقت تحقیق رموزِ فن میں صرف ہونے لگا اور استاد کے ساتھ فتح الدولہ برق۔ آفتاب الدولہ قلق مقبول الدولہ مقبول سے بھی صحبتیں گرم ہونے لگیں۔ یہ سب شعرائے نامور خوش لیاقت خوش فکر بالانشینِ دربارِ واجد علی شاہ تھے۔ اب امیر کی شرکت مشاعروں میں حوصلے اور دعوے کیساتھ ہونے لگی۔ ہر بار یہی ارادہ ہوتا تھا کہ مشاعرہ ہمارے ہاتھ رہے۔

ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے مکان واقع سرائے معالی خاں پر جلسۂ شعر اکثر رہتا تھا۔ حضرت اسیر اکثر وہاں بیٹھا کرتے تھے اور اپنی غزلیں پڑھکر موردِ تحسین و آفریں ہوتے تھے، اسی جلسہ میں پڑھی ہوئی ایک غزل کی بیحد تعریف کی گئی جسکا مطلع یہ ہے۔

بہار آئی عجب حالت ہے ان روزوں ہر کے دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی

دوسرا مشاعرہ نہایت اہتمام اور دہوم دہام سے نواب غضنفر الدولہ بہادر داماد نواب محمد علیشاہ کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس میں بھی امیر اکثر شریک ہو کر طرحی غزلیں سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی غزل کا مصرع طرح یہ ہے

بڑی سرکار میں پہونچے بڑے دربار میں آئے۔

امیر کی طباعی۔ نازکخیالی معنی آفرینی اور قدرت کلام نے اسوقت کے نامور شعرا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور شعرا کے حلقہ میں انکی قدر بڑہتی گئی۔

مرزا رجب علیبیگ سرور مصنف فسانہ عجائب امیر کے گہرے دوست تھے۔ اکثر مرزا صاحب کے مکان پر امیر کی نشست و برخاست رہتی تھی منشی سلیم الزماں صاحب خواہرزادہ امیر مینائی بیان کرتے تھے کہ میری عمر اس وقت گیارہ برس کی ہوگی میں بھی اکثر حضرت امیر کے ہمراہ سرور کے مکان پر جاتا تھا اور شعر و سخن کے تذکرے ہوتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور اسی زمانہ میں فسانہ عجائب کی تالیف میں مصروف تھے چنانچہ جس قدر وہ روزانہ لکہتے تھے امیر صاحب کو سنایا کرتے تھے۔

مشاعرے میں امیر کا معمول تھا کہ طرحی غزل کے علاوہ ایک غزل غیر طرح پیش خوانی میں پڑہتے تھے۔ نسیم دہلوی کے فرزند نے یہ ڈہنگ اختیار کیا کہ جس زمین میں امیر پیش خوانی کی غزل پڑہتے اسی زمین میں وہ بھی غزل کہتے اور آیندہ مشاعرے میں پڑہتے۔ دیر تک یہ سلسلہ قایم رہا امیر کو ناگوار ہوا اور ناگوار ہونے کی بات ہی تھی آپ نے اپنے استاد سے اس کا ذکر کیا انہوں نے رائے دی کہ تم ایک ہی زمین میں

مسلسل غزل پڑھنے جاؤ دیکھو وہ کہاں تک چلتے ہیں غرض امیر نے ایک طرح میں کئی سو شعر کھ لیے اور ہر مشاعرے میں ایک ایک غزل پڑھنی شروع کی دو تین مشاعرے تک تو نسیم کے صاحبزادے نے بدقت وضعداری کو نباہا۔ آخر معذرت کی اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ ناسخ انتقال کر چکے تھے۔ آتش موجود تھے لیکن انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر کے شاعری ترک کر دی تھی۔ البتہ شیخ ناسخ اور آتش کے نامور شاگرد چمنستانِ سخن کی آبیاری کر رہے تھے۔ دوسری طرف مرزا دبیر اور میر انیس کی مقابلتہً مرثیہ گوئی تمام اہلِ سخن کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے تھی۔ انیس و دبیر کی معرکہ آرائیاں شعرائے موجودہ کے شوقِ سخن کو اور تیز کر رہی تھیں۔ اُس وقت اکثر غزل گو شعرا نے مرثیہ میں تو قدم نہیں رکھا مگر واسوخت کی تصنیف میں طبع آزمائی کی ان میں سے سحر کے کئی واسوخت خاص طور پر پسند کیے گئے۔ حضرت اسیر نے لوگوں کی فرمایش سے مرثیہ کی طرف توجہ کی۔ بہت سے مرثیے کھ ڈالے مگر رکھا ایک بھی نہیں۔ امیر نے بھی نہایت دھوم سے واسوخت تصنیف کیے چنانچہ سات واسوخت یکے بعد دیگرے انھوں نے کہے جنمیں سے چھ واسوخت مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئے ہیں۔ پانچویں واسوخت میں امیر نے سراپا لکھنے میں کمال دکھایا ہے اور ایک بند بینی و ابرو کی تشبیہ میں ایسا کہا کہ تمام معاصرین تحسین و مرحبا کہہ اُٹھے۔

اس واسوخت کے قبل صرف دو تشبیہیں بینی و ابرو کی کہی گئی تھیں ایک تو مرزا دبیر نے کہی تھی اور دوسری میر انیس نے۔

مرزا دبیر کا مضمون یہ ہے کہ ایک علم ہے اور اس کے اوپر دو تلواریں آویزاں ہیں۔ قاعدہ ہے کہ بعض بڑے علم جو نکالے جاتے ہیں ان کے سرے پر دو جانب دو تلواریں

آویزاں کیجاتی ہیں اور میر انیس نے کہا ہے کہ بینی ایک روشن شمع ہے اور کوچۂ زلف سے جب ہوا آتی ہے تو اُس سے شمع کی لو کبھی اِدھر جھک جاتی ہے اور کبھی اُدھر یعنی شمع کی لو کا دو جانب جھکنا ابرو کی صورت پیدا کرتا ہے۔ بہت ہی نازک خیالی کیگئی ہے۔

اِن دونوں تشبیہوں سے جداگانہ پہلو امیر نے نکالا ہے۔

چاندنی رات ہے افشاں سے وہ گیسوئے سیاہ | دیکھنے ہوں جسے تارے وہ کرے خوب نگاہ
ایسا مضمون بندھا ہے ابرو و بینی کا کہ واہ | تو تیغیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
واہ کیا شکلیں ہیں قائل ہیں یہ تصویروں کے | دیکھو نکلی ہے زچہ سائے میں شمشیروں کے

یہ ایک قدیمی رسم ہے کہ زچہ جب اوّل اوّل زچہ خانے سے تاروں کی چھاؤں میں باہر نکالی جاتی ہے تو دونوں طرف سے اُسپر برہنہ تلواروں کا سایہ کیا جاتا ہے۔

گویا بینی ایک زچہ ہے اور دونوں ابرو تلواریں ہیں کہ بینی کو اپنے سائے میں لئے ہوئے ہیں۔

اس عجیب و غریب تشبیہ کی ہر طرف سے داد دی گئی۔ چنانچہ میر انیس تک جب یہ بند پہونچا تو وہ امیر کی طبّاعی اور نازک خیالی کو دیکھکر اسقدر خوش ہوئے کہ اپنے ایک عزیز کو امیر کے مکان پر بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ اب تک صرف دو تشبیہیں ہوئی تھیں ایک مرزا دبیر نے کہی تھی اور ایک میں نے مگر آپ نے جو جدید اور نازک تشبیہ پیدا کی ہے اس پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اوپر لکھا جاچکا ہے کہ اسیر مرحوم واجد علی بادشاہ کے سکرٹری اور ان کے مصاحب خاص تھے۔ امیر کی گرما گرم طبیعت کو دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ دربار شاہی میں امیر کو لیجانا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے امیر سے اس کا ذکر کیا کہ کوئی قصیدہ مدحیہ تیار کرلو تو

ہیں تم کو بادشاہ کے پاس لے چلوں گا۔ امیر نے اس گفتگو کے قبل بھی چند قصاید اور مسدسات مدح میں کہے تھے اور ایک فارسی کی نہایت لطیف اور عجیب صنعت کی مثنوی کہی تھی کہ کہیں الفاظ کے نیچے نقطے ہیں اور کہیں مسلسل اوپر ہی نقطے ہیں کہیں ہر مصرع تاریخ پر مشتمل ہے کہیں اشعار منقوط ہیں کہیں غیر منقوط۔ مگر کسی کے پیش کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

اس موقع پر امیر نے بجائے قصیدہ کہنے کے کبوتر نامہ لکھا کیونکہ واجد علی شاہ کو کبوتروں کا نہایت شوق تھا۔ الغرض اسیر اپنے لایق شاگرد کو ایک روز قیصر باغ میں کہ شاہی جلوہ گاہ تھا لیگئے یہ واقعہ سنہ ۱۲۶۹ھ کا ہے۔ امیر مرحوم بیان کرتے تھے کہ یہ گرمیوں کا مہینا تھا دیوان عام میں جس کو مصاحب منزل کہتے تھے پہونچکر استاد اور میں دونوں ٹھہر گئے اور استاد نے شاہی خواجہ سرا کو بلوا کر کچھ کہا تھوڑی دیر کے بعد خواجہ سرا پھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ چلئے جہاں پناہ یاد فرماتے ہیں میں کچھ خوف زدہ کچھ متحیر کہ یہ پہلا موقع ہے ایسا نہو آداب شاہی کے خلاف کوئی بات ہوجائے خواجہ سرا کے ساتھ چلا۔ اسیر اسی جگہ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کئی درجے طے کرکے میں ایک نہایت عالیشان کمرے میں پہونچا جہاں کہ شاہ اودہ باجاہ وجلال جلوہ افروز تھے یہ ایوان فلک نشان ساون بھادون کے نام سے موسوم تھا؛ اس کی چھت سے ننھی ننھی پھوہار پڑتی تھی۔ برسات کا سماں تھا اور تمام مکان سرد ہو رہا تھا۔ سلطانی جلوہ گاہ کی آرایش وزیبایش وہاں کا سامان اور ٹھاٹھ اور چمک دمک اور خدام ذکور واناث کے زرق برق لباس غرض ایک ایسے برق سوز نظارے سے دفعتہً سابقہ پڑا کہ میری نگاہ خیرہ ہوگئی میں متحیر ہو گیا کہ کیا کروں اتنے میں خواجہ سرا آگے بڑھکر باواز بلند پکارا

"آداب بجا لاؤ" میں ہوش و حواس درست کر کے باقاعدہ آداب بجا لایا اور بڑھ کر نذر پیش کی۔

بادشاہ نے ارشاد کیا کہ تمہارا ہی نام امیر ہے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا جہاں پناہ فقیر ہی کو امیر کہتے ہیں اسکے بعد کبوتر نامہ جو خوشخط لکھا ہوا پاس موجود تھا ادب سے پیش کیا بادشاہ کبوتر نامے کو لے کر نہایت خوش ہوئے اور کچھ دیر تک اس کو ملاحظہ فرماتے رہے اور حکم دیا کہ صلے میں خلعت فاخرہ عطا کیا جائے چنانچہ مجھ کو خلعت مرحمت ہوا جسمیں ایک پالکی بھی تھی میں آداب بجا لا کر رخصت ہوا۔

اس وقت امیر کی عمر پچیس برس کی تھی اور یہ دربار میں حاضر ہونے کا پہلا موقع تھا۔

اس باریابی کے چند دن بعد بادشاہ نے امیر کی لیاقت اور شاعری سے خوش ہو کر فرمایا کہ شہزادہ نادر مرزا کو تعلیم دیں۔ چنانچہ منشی سلیم الزماں صاحب بیان کرتے تھے کہ شہزادہ کی تعلیم کے لئے عشق منزل میں قیام تجویز ہوا تھا۔ میں بھی دس پانچ مرتبہ ساتھ گیا ہوں۔ امیر نے شہزادہ کو پڑھانے کے لئے انشائے نادری لکھی تھی۔

واجد علی شاہ کے دربار کی رسائی اور شاہی تعلقات نے اُن کی شہرت اور ناموری کو اور چار چاند لگا دیے۔ ان کی وقعت تمام مقربان شاہی اور امرائے ملک میں بڑھ گئی اور ہر جگہ وہ عزت و توقیر کے ساتھ لیے جانے لگے۔

عشق منزل میں شہزادہ کو تعلیم دینا شروع کیا تھا کہ امیر کو شاہی فرمان ملا کہ خاص کچہری (عدالت دیوانی) تمہارے متعلق کیگئی۔ چنانچہ وقت معینہ پر تعلیم دینے میں مصروف رہتے اور عدالت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

اگرچہ امیر مینائی نے اب دنیا کے کاروبار میں قدم رکھا تھا اور ملازمت سرکاری نے

اُن کو بہت کچھ بہ عزم عزیمت کر دیا تھا لیکن تصنیف و تالیف اور شعر گوئی کا شغل اسی ذوق و شوق اور تندہی کے ساتھ جاری رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اس کے علاوہ انھوں نے شاہ اودھ کی ایک کتاب موسوم بہ صوت المبارک کی شرح لکھی اور اس کا نام نغمۂ قدسی رکھا۔ یہ گراں بہا تالیف بیشگاہ شاہی میں بہت پسند کی گئی۔

مطالعہ کتب میں امیر کا بیشتر وقت صرف ہوتا تھا وہ ان تمام کاموں کے ساتھ سنسکرت کا مطالعہ بھی کرتے تھے اور انھیں اتنی معلومات مہیا کی تھی کہ سنسکرت کے استادوں کے کلام کی ایک شرح بھی انھوں نے اردو میں تالیف کی۔ ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور اب کہ دربار شاہی کے متوسلین میں شمار ہوتے تھے کوئی مشاعرہ لکھنؤ کا ایسا نہ تھا جس میں وہ نہ بلائے جاتے ہوں۔

باوجود اس اعزاز کے امیر کے درویشانہ عادات و خصائل میں جو انھیں ورثہ میں ملے تھے کوئی فرق نہیں آیا۔ اور ریاضات روحانی کی مشق بھی جاری تھی۔ وہ اکثر مقابر اولیا پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ردولی شریف میں سالانہ عرس حضرت شیخ احمد عبدالحق قدس سرہٗ کا نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا وہاں امیر مینائی بھی پابندی کے ساتھ ہفتہ عشرہ کیلئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ردولی کے مخدوم زادے شاہ محمود احمد صاحب بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ امیر کی آمد کے نہایت مشتاق رہتے تھے اور عرس کے قریب آتے ہی اُن کے قیام کا عمدہ انتظام کرتے تھے جب وہ تشریف لاتے تو ہمارے اصرار سے شعر و سخن کا مشغلہ بھی ہوتا تھا اور یہیں مصرع طرح تجویز کیا جاتا اور مشاعرہ ہوتا۔ اور ہم چند لوگ جو شاعری سے شوق رکھتے تھے امیر سے اصلاح لیتے تھے۔ امیر کی یہ غزلیں

جگر کس کا ہے اثر کس کا ہے اور سنبھل جاتے مچل جاتے ردولی ہی کے شاعرے کی ہیں
اور شاہ صاحب موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ امیر کی بہت سی غزلیں جو ہمارے سامنے
کہی تھیں دیوان میں نظر نہیں آتیں غالباً وہ ہنگامۂ غدر کے نذر ہوئیں چنانچہ یہ غزل
انہیں کی ہے جو زبانوں پر ہے ؎

جتنا جی چاہے ستائے ستم ایجاد مجھے	صورتِ تصویر ہوں آتی نہیں فریاد مجھے
آنسے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے	خاک اڑانے لگے جیب کر بیکے برباد مجھے

سنہ ۱۲۷۱ھ میں حسب الحکم شاہ اودھ دو کتابیں امیر نے تصنیف کیں جن کا نام ہدایۃ السلطان
اور ارشاد السلطان ہے جب یہ دونوں کتابیں بادشاہ کے روبرو پیش ہوئیں تو خوش ہو کر
شاہانہ نوازش مبذول فرمائی اور خلعتِ فاخرہ عطا فرمایا۔

ایک دن بادشاہ نے سرِ دربار امیر سے فرمایا کہ اس مضمون کا شعر فی البدیہہ کہو:
"معشوق نے میری تواضع حقہ سے کی اور
رقیب کو بوسہ دیا کیا بے انصافی ہے"
امیر نے اسی وقت فکر کی اور یہ قطعہ موزوں کر کے سنا دیا جس پر بڑی
تحسین و آفرین ہوئی۔

قطعہ

مجھکو حقہ دیکے ٹالا غیر کو بوسہ دیا	دیکھتا جا اُس مرے دمباز اپنے طور کو
کس کا حصہ دیدیا کسکو ذرا انصاف کر	دو دو بے حلوا مجھے حلوا ے بے دود اور کو

بادشاہ ایک روز گلی (ایک قسم کا حقہ) پی رہے تھے۔ امیر سے ارشاد ہوا کہ گلی کی تعریف
میں کوئی شعر ہونا چاہیئے۔ امیر نے فی الفور تعمیلِ ارشاد کی اور یہ قطعہ پیش کیا۔

قطعہ

ساقیا پھول سے کیا کام کہ پیتے ہیں   جسکی بو ہمسری نشۂ مل کرتی ہے
دیکھنے میں تو ہے اک شاخ مگر وا برشاخ   دہن تنگ کو غنچہ کبھی گل کرتی ہے

امیر مینائی کے لئے اب پریشانی کا وقت آلہے یعنی انتزاع سلطنت اودھ کی کارروائی اسی سال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے عمل میں لائی گئی اور اس کا نتیجہ ہوا کہ تمام مقربان و متوسلان شاہی منتشر ہو گئے بہت سے لوگ تو معزول شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور بہت رہ گئے۔ اس واقعۂ قیامت خیز سے امیر کو بہت تشویش ہوئی اسکے بعد ہی ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوا اور اسکی چنگاریوں نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی۔ لکھنؤ بھی کہ اس وقت واجد علی شاہ کی معزولی پر ماتم کدہ تھا باغیوں کے زیر اثر آگیا اور اس کا نتیجہ لکھنؤ کی عام بربادی اور تباہی ہوا۔

اس طوفان غدر کے برپا ہوتے ہی لکھنؤ کے باشندے متفرق ہونے لگے اور اکثر اپنی حفاظت کے لئے جدھر موقع ملا چلے گئے۔ چنانچہ امیر مینائی نے بھی سراسیمگی کی حالت میں مکان اور اثاث البیت کو چھوڑا۔ اور سب مرد وزن کسی گاؤں میں چلے گئے اور غدر کے فرو ہونے تک وہیں قیام پذیر رہے۔

جب غدر کا انسداد اور قیام امن کی خبریں چاروں طرف پھیل گئیں تو بھاگے ہوئے لوگ اپنے اپنے مکانات کو واپس آنے لگے۔ مگر امیر مینائی سیدھے کاکوری گئے اور وہیں ٹھہر گئے کاکوری سے ایک دن اپنے مکان کی حالت دیکھنے لکھنؤ آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام محلہ مینا بازار میں آگ لگی ہوئی ہے اور مکانات جل رہے ہیں۔ ان کا مکان بھی جل کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ امیر کا بیان حسب ذیل ہے۔

محمد محسن کی فکر کے بعد اس پر طبع آزمائی کی گنجائش ہی کیا رہی تھی مگر امیر کی طبع رسا نے ایسی غواصی کی کہ بحر معانی سے بیش قیمت موتی نکال ہی لیے امیر کا قصیدہ (۱۲۸) شعر کا ہے اور پھر اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک دو غزلہ بھی اسی زمین میں کہا۔ مولوی صاحب موصوف کہتے تھے کہ امیر صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ مؤید من اللہ ہیں اور یہی قول مولوی محمد محسن کی نسبت امیر کا تھا۔

امیر مینائی کا کوئی بیس برس سن تھا کہ رامپور سے منجانب نواب یوسف علیخاں بہادر اُن کی طلب ہوئی اور وہ رامپور کو روانہ ہوئے اس طلبی کے وجوہ یہ تھے کہ جنت آرامگاہ نواب محمد سعید خاں والی رامپور ایک زمانہ میں عرصہ تک لکھنؤ میں رہے تھے اور اُن کے ساتھ اُن کے صاحبزادے نواب یوسف علیخاں بھی تھے جنکی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی مولوی کرم محمد صاحب والد ماجد امیر مینائی اُن کے استاد تھے اور انہیں نے کتب درسیہ کی تعلیم دی تھی جب نواب یوسف علیخاں بہادر سنہ ۱۲۷۱ھ میں سریر آرائے حکومت ہوئے تو اُن کو شاعری کی طرف رجحان پیدا ہوا اُستادی کے لئے مرزا غالب کو انتخاب کیا مرزا غالب کبھی دلی میں رہتے تھے اور کبھی رامپور آتے تھے۔ ایک وقت مومن مرحوم بھی رامپور میں وارد ہوئے تھے اُن کی شاعری کو بھی نواب یوسف علیخاں بہادر نے بہت پسند کیا اور انکو بھی کچھ کلام دکھایا۔ غالب کو اس کے بعد ترک کیا تھا۔

اسی اثناء میں امیر کی شاعری کا غلغلہ رامپور تک پہنچا۔ نواب صاحب کو تفتیش ہوئی کہ یہ امیر کون ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امیر مولوی شیخ کرم محمد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نواب صاحب نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے استادزادے ہیں۔ ہمکو انہیں کے والد بزرگوار نے تعلیم دی ہے۔ ہمارا اُن پر حق ہے اور اُن کا حق

ہم پر ہے۔ العرض نواب صاحب موصوف کا طلب کرنا امیر کے لئے بشارت غیبی ہوا اور یہ بڑی خوشی کے ساتھ رامپور تشریف لے گئے اسوقت امیر کی عمر بتیس سال کی تھی اور سنہ ۱۲۷۵ھ آخر تھا۔

جب امیر مرحوم وارد رامپور ہوئے اور شرف باریابی بندگان حضور حاصل کیا تو نواب صاحب نہایت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ آپ کیا ملے گویا میرے استاد ملے۔ یہ اشارہ تھا امیر کے والد مغفور کی طرف۔ امیر نے مدح میں ایک قصیدہ سنایا۔ نواب صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ میں آج ہی سے اس کے صلہ میں عدالت دیوانی کا حاکم اعلی یعنے مفتی مقرر کرتا ہوں۔ علاوہ اس معزز عہدہ کے اپنا مصاحب بھی بنایا۔ العرض نواب صاحب کیطرف سے اسقدر مراعات اور الطاف وعنایات ظہور میں آئے کہ انتزاع سلطنت لکھنؤ کے بعد جس قدر پریشانیاں امیر نے اٹھائی تھیں اُن کی تلافی ہوگئی۔ سرکاری مکان رہنے کو دیا گیا اور خدام وسپاہی مقرر کردئے گئے مقصود یہ تھا کہ امیر لکھنؤ کو فراموش کر کے رامپور ہی کو اپنا مسکن بنائیں۔ اور یہی ہوا۔ امیر مینائی عدالت دیوانی کے انفصال مقدمات میں نہایت تندہی کے ساتھ مصروف رہتے تھے اور وقت معینہ پر نواب صاحب کی مصاحبت بھی کرتے تھے۔

امیر نے دربار رامپور میں باریاب ہوتے ہی اپنے استاد اسیر کو یاد کیا۔ یعنی نواب صاحب کی خدمت میں ایسی تحریک کی کہ انھوں نے اسیر کی طلبی کا حکم فوراً جاری کردیا۔ یہ گویا امیر نے حق شاگردی اپنے استاد کے ساتھ ادا کیا۔ اب کیا تھا اسیر بھی رامپور آگئے۔ شاعری کی صحبتیں گرم جوشی کے ساتھ ہونے لگیں۔ نواب صاحب نے اپنے کلام میں اسیر سے اصلاح بھی لی۔ چنانچہ امیر مرحوم تذکرہ انتخاب یادگار میں

لکھتے ہیں۔

منشی مظفر علی صاحب اسیر کو جو آج لکھنؤ میں سحبانِ عصر اور یکتائے دہر ہیں
نواب موصوف کلام دکھانے لگے۔ پایۂ شاعری کو ایسا بلند کیا کہ روح القدس نے
بھی پسند کیا دو بار آپ کے نتائج افکار مطبع حسنی رامپور میں طبع ہوئے ہیں۔
اول مرتبہ دیوان مختصر جو صرف مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا ہوا تھا چھپا ہے
اور دوسری مرتبہ وہ کلام جو منشی مظفر علی صاحب امیر کی نظر سے گزرا تھا
"کلام اولین میں شریک ہو کر طبع ہوا ہے"

امیر تو بالاستقلال مع متعلقین رامپور میں مقیم ہو گئے مگر اسیر مثل غالب کے کبھی رامپور میں
رہتے تھے اور کبھی لکھنؤ میں۔ چونکہ اسیر کا قیام رامپور میں مسلسل نہیں رہتا تھا لہٰذا کچھ دنوں کے
بعد نواب صاحب نے اپنے کلام میں امیر سے مشورہ کرنا شروع کیا اس کا ذکر امیر اللغات
کے دیباچہ میں امیر نے کیا ہے۔

" اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی مجھ سے متعلق تھی اور نواب "
" فردوس مکان اپنے کلام میں مشورہ بھی فرماتے تھے۔"

امیر کے واسوخت ملاحظہ کر کے نواب صاحب کو بھی واسوخت کہنے کا شوق ہوا چنانچہ ایک
واسوخت بہاریہ انھوں نے کہا اور امیر کو دکھایا۔ اس واسوخت میں اول سے آخر تک
بہار کا تلازمہ باندھا ہے اور خوب نباہا ہے۔ حق یہ ہے کہ امیر نے بھی اصلاح میں ایسی
توجہ کی کہ پورا واسوخت بہار کے سانچے میں ڈھل گیا۔ نواب کا شوق اس سے اور
بڑھا۔ متواتر چار واسوخت کہے اور وہ چاروں مطبع نول کشور لکھنؤ میں مجموعۂ واسوخت
موسوم بہ شعلۂ جوالہ میں طبع ہوئے جو قابل دید ہیں اور امیر کے رنگ کی جھلک دکھاتے ہیں۔

نواب صاحب ممدوح ۱۲۸۱ھ میں بعارضۂ سرطان مبتلا ہوئے شوال کے مہینے میں
نوروز کے دن غسل صحت کیا اور باغ بے نظیر میں جشن منایا گیا۔ حضرت امیر نے غسل صحت
کے مواقع پر یہ قطعہ پڑھا ہے

شرف وال مہر کو ہے یاں عروجِ ماہِ دولت ہے | عجب صحت عجب جلسہ عجب شادی کی ساعت ہے
کہ سالِ ہمایوں ہاتھ آتا ہے امیر ایسا | تہنیت جس کا نوروز کا دن غسلِ صحت ہے

۹۵ ۱۸ ۶

افسوس ہے کہ مرض کا استیصال اچھی طرح نہ ہوا تھا طبیعت پھر ناساز ہو گئی اور
۲۲ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۶۵ء جمعہ کے دن ٹھیک بارہ بجے انتقال فرمایا۔
حضرت امیر پر اس واقعہ کا جو اثر ہوا ظاہر ہے اور آپ نے اپنے جذباتِ دلی کو
اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔

در فراقِ ناظمِ معجز بیاں یوسف لقا | جوش زد سیلابِ خوں از دیدۂ گریانِ من
تاب از دل رفت و دل از دست و دست از کار رفت | رفت از ضبطم بہم تن و سر و سامانِ من
تیرہ شد چوں شامِ ماتم در نظر ایں خاکداں | چاک شد مانندِ دامانِ سحر دامانِ من
شکرِ نعمت ہائے او ایمانِ خود دانستہ ام | ذکرِ او تا بود وردم بود ست حرزِ جانِ من
بسکہ از شورِ فغانم محشرے برپا شدست | می شود شورِ قیامت ہر نفس قربانِ من
گریہ ام در ماتمش تنگِ فراوانی گرفت | می چکد طوفانِ نوح از گوشۂ دامانِ من

بہرِ سالِ آں عزیزِ مصرِ دلہا گفت امیر
مسند آرائے جناں شد یوسفِ دورانِ من

۱۲۸۱ھ

نواب کلب علیخاں کی مسند آرائی
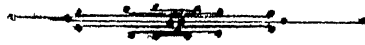
نواب یوسف علیخان نے وفات سے پہلے نواب کلب علیخاں بہادر کو نصیحت کی تھی کہ اپنے دادا کے انتظامات کو بحال رکھنا جس کو ہم نے بحال رکھا ہے اور اُنکی وصیت کو پیش نظر رکھکر نظم و نسق ریاست میں خلل دینا جس وقت میرا دم نکلے لاش چھوٹے صاحب (کاظم علیخان) کے سپرد کرنا اور تم فوراً مسند حکومت پر بیٹھ جانا۔ نواب کلب علیخاں نے ایسا ہی کیا کہ جنازہ چھوٹے صاحب کے سپرد کیا خود مسند نشین ہو گئے اور چونکہ جمعہ کا دن تھا مسجد میں نماز پڑہنے چلے گئے۔ سید رستم علیصاحب پیش امام نے ایسا عبرت انگیز خطبہ پڑھا کہ نواب کلب علیخان رو دیے بعد ختم نماز جب ایوان حکومت میں تشریف لائے تو تمام اہلکاروں اور ملازموں کو جمع کرکے سب کی تشفی کی اور سب کو اطمینان دلایا تاکہ کوئی پریشان نہ ہو۔ ۱۰ رجون ۱۸۶۵ء کو مسٹر جان انگلس ایجینٹ نے رامپور آکر دیوان خاص میں گورنمنٹ کی جانب سے باضابطہ مسند نشین کیا اور حضرت امیر نے یہ قطعہ پڑھا۔

قطعہ تاریخ مسند آرائی

آفتاب سپہر حشمت نے | تخت پر جب جلوس فرمایا
فرط بالیدگی سے وقت جلوس | پایۂ عرش تخت نے پایا

عرشیوں نے کہا مبارک ہو — فرشیوں کے سروں پہ یہ سایا
سایہ اس سایۂ الٰہی کا — ابر رحمت کی طرح سے چھایا
تختِ دولت پہ ماہِ دولت نے — مہر ہو کر جلوس فرمایا
مہر کا رنگ ہو گیا پھیکا — ماہِ کامل فلک پہ شرمایا
نذر کو آسماں درِ انجم — طبقِ ماہتاب میں لایا
نور سے طور ہو گئی ... کوٹھی — پرتوِ حسن نے یہ چمکایا
کیوں نہ خوش ہوں محمدی مشرب — عہدِ خُلقِ محمدی آیا
اس سلیماں نے خُلق سے اپنے — خاتمِ دل پہ نقش بٹھلایا
جی اٹھا جس سے چار باتیں کیں — رنگِ اعجازِ تازہ دکھلایا
جھک گئے میکشانِ بزمِ سوال — جامِ جود و کرم جو چھلکایا
نئے سر سے جواں ہوا اقبال — نخلِ دولت مراد پر آیا
ہے یہ سرتاج تاجداروں کا — اس پہ اللہ کا رہے سایا
واقعی ہے امیر سالِ جلوس — دَورِ دَورِ فلاحِ خُلق آیا

۱۲۸۱ ھ
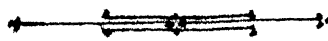
نواب کلب علیخاں بہادر کی مسند آرائی اور ملکہ معظمہ کے حضور سے جو خلعت گورنر جنرل کی معرفت آیا اُن دونوں موقعوں پر دو قصیدے حضرت امیر کے قابلِ ملاحظہ ہیں جو مراۃ الغیب میں چھپ گئے ہیں۔

اب یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ نواب کلب علیخاں بہادر نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں مفتی امیر احمد صاحب سے اپنے باورچی کے لئے سفارش کی تھی جس پر عدالت میں

مقدمہ تھا مگر حضرت امیر نے بلحاظ روداد مقدمہ فیصلہ باورچی کے خلاف کیا اور ولی عہد صاحب نے سنا تو فرمایا کہ اچھا دیکھا جائے گا۔

حضرت امیر کو اس بات کا خیال رہا مسند نشینی کے بعد حضرت امیر نے رام پور سے روانگی کی تیاری کی کہ یہاں قیام مناسب نہیں ہے۔ اسکی خبر کسی طرح نواب کلب علیخاں کو ہو گئی۔ حضرت امیر کو بعد مغرب بلا کر فرمایا کہ میں نے سنا ہے آپ یہاں سے جا رہے ہیں اس کا کیا سبب ہے حضرت نے عرض کیا "مجھے حضور کی ناخوشی کا علم اپنی نسبت ہے"۔ نواب صاحب نے فرمایا "واقعی اُس وقت مجھ کو ناخوشی ہوئی تھی مگر اب آپ کی اُس کارروائی کا مجھ سے زیادہ کوئی قدر شناس نہیں ہے۔ جب آپ نے میرا اثر نہ مانا تو امید ہے کہ آپ انصاف کے جاری کرنے میں کسی کا لحاظ نکریں گے اطمینان سے یہاں رہیے"۔ حضرت امیر نے ارادہ فسخ کر دیا اور سمجھ گئے کہ نواب کلب علی خان اعلیٰ مراتب صوری و معنوی حاصل کرنے والے ہیں۔

ولی عہدی کے زمانہ سے نواب صاحب کو شعر و سخن سے رغبت تھی اب آزادی ملی تو اسطرف انہماک بڑھ گیا۔

دلی اور لکھنؤ کے اہل کمال کو بلا کر اپنی مصاحب منزل کی رونق بڑھائی۔ لکھنو اور دہلی کی سلطنتوں کا خاتمہ ہو ہی چکا تھا اور اہل کمال کی صورت حال گویا تھی ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے　　　　اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

اسیر۔ امیر۔ جلال۔ بحر۔ عروج۔ قلق۔ تسلیم۔ زکی۔ شرف۔ جان صاحب شعرائے لکھنو اور حیا و داغ دہلوی کا مجمع رامپور میں ایک عالم پیدا کر رہا تھا جسکی نظیر اُس وقت کہیں نہیں ملتی تھی یہ صحبتیں رام پور کے فرماں فرما کو اپنے وقت کا مامون الرشید بنائے ہوئے تھیں۔

نواب صاحب نے حضرت امیر کو اپنی اُستادی کے لئے منتخب فرمایا۔

شعر و سخن کی شمع روشن ہوگئی اور انجمنِ ادب میں گلفشانی اس طرح شروع ہوئی کہ نواب صاحب نظم و نسق ملکی میں جس طرح نئے نئے قانون اور ضابطے جاری کرتے تھے اسی طرح قلمروِ سخن میں بھی سکہ جاری کر دیا۔ اب حضرتِ امیر کو مسندِ افتا کا سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ حکمرانوں کی شاعری لڑکوں کی شاعری نہیں ہوتی آخر نواب صاحب سمجھ گئے کہ امیر جس ذمہ داری سے عدالت کی مسند پر کام کرتے ہیں اب وہ ناممکن ہے۔ آپ کو عہدۂ مفتی سے سبکدوش فرما کر آپ کے بڑے بھائی مفتی طالب حسین صاحب کو مفتی عدالت کر دیا سب سے زیادہ خدمت خاص شعر و سخن کی تھی اور اس کے ساتھ حضرت امیر ہی سے وہ اہم خدمت بھی متعلق تھی جو ایک فارن سکریٹری اور پرایویٹ سکریٹری انجام دیا کرتا ہے غدر کے کرشمے تمام ہندوستان میں نظر آتے تھے۔ رامپور بھی مستثنیٰ نہ تھا مگر خدا کی مہربانی شاملِ حال تھی کہ جو خط و کتابت برٹش گورنمنٹ اور دربارِ رامپور میں ہوتی تھی وہ دونوں میں مزید اتحاد اور استحکام کا سبب ہوتی گئی۔

نواب کلب علی خان بہادر کا ذوق و شوق سخن نواب یوسف علی خان بہادر سے بھی بڑھا ہوا تھا اور باوجود کثرت مشاغل ملکی و انتظاماتِ ریاست وہ شاعری کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ روزانہ شعر کہتے تھے اور اصلاح لیتے تھے۔ اکثر رات کو بارہ بجے اور ایک بجے تک جستہ جستہ اُن کا کلام امیر کے پاس آتا تھا اور اسی وقت اصلاح کے بعد واپس ہوتا تھا۔ اس محنت اور متفرق طور پر اصلاح کو دیکھ کر حضرت امیر فرماتے تھے کہ امیر نواب کی استادی درحقیقت تمہیں سے ہو سکتی ہے۔"

رازداری کے امور کی انجام دہی کے واسطے ایک خاص وقت مقرر تھا اُسوقت نواب اور امیر کے سوا دوسرا کوئی موجود نہ رہتا تھا اور دوسری ملاقات عام دربار میں ہوتی تھی۔

نواب اُن کی رایوں اور رازداری سے بنہایت درجہ محفوظ اور مطمئن تھے۔

دربار نواب کلب علیخان بہادر

مصاحب منزل آراستہ ہے۔ فرش تکلف بچھا ہے اور اُس پر وہ لوگ رونق افروز ہیں جو انتخاب روزگار سمجھے جاتے ہیں اور فی الواقع ہیں۔ ایک جانب فضلا اور حکماے عصر کی نشست ہے ایک طرف شعراے نامدار کی جماعت بیٹھی ہے آپس میں مزے مزے کی مکالمت ہو رہی ہے۔ خصوصاً علمی تذکرہ وہ لطف دیرہا ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے اور دل تروتازہ ہوتا ہے۔ کبھی شاعری چھیڑ جاتی ہے۔ اشعار آبدار پڑھے جاتے ہیں کبھی مسایل علمی وادبی پر بحث ہوتی ہے۔ الفاظ ومحاورات کی تنقید ہوتی ہے غرض یہ وہ پاکیزہ صحبت ہے جو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ نواب نامدار کلب علیخاں بہادر جوان باکمالوں کے جامع ہیں ایوان خاص میں تشریف رکھتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک چوبدار مصاحب منزل میں داخل ہوتا ہے اور وہ یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے۔ "سرکار یاد فرماتے ہیں" اس کے سنتے ہی وہ مجمع مصاحب منزل سے اُٹھ کر ایوان خاص میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نواب صاحب جلوہ فرما ہیں۔ ہر روز صبح ہوتے ہی مصاحب منزل میں اہل دربار آجاتے تھے وہاں بیٹھ کے نواب صاحب کے

یاد فرمانے کا انتظار کرتے اور علمی مباحث میں وقت گزارتے تھے۔ نواب صاحب ضروریات سے فارغ ہوکر ان سب کو اپنے سامنے طلب کرتے تھے اور دیر تک دربار گرم رہتا تھا۔ اس دربار میں بھی یہی مباحث اور یہی مشاغل رہتے تھے تحقیق لغات اور تنقید زبان کا بھی نواب صاحب کو بہت شوق تھا۔ اکثر نواب صاحب اپنا کلام حضار دربار کو سنانے کا حکم دیتے تھے اور ان کا کلام امیر پڑھا کرتے تھے۔

مشاعرۂ رامپور
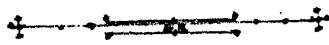
اس زمانے میں مشاعرے نہایت سرگرمی اور اہتمام سے ہوتے تھے۔ ہندوستان کے تمام مشہور اور مستند شعرا کی موجودگی نے عام طبائع میں شاعری کا اثر پیدا کر دیا تھا۔ شہر میں یوں تو اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر ایک مشاعرہ خاص صاحبزادہ مہدی علیخاں کے یہاں مسلسل ہوتا تھا۔ یہ مشاعرہ سرکاری کہا جاتا تھا جو خاص امیر کی نگرانی میں منعقد کیا جاتا تھا۔ تمام دیگر مشاعروں سے یہ مشاعرہ اس بات میں امتیاز رکھتا تھا کہ اس کے سامعین میں علما اور فضلا اور صلحا بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی اور اسی طرح دیگر حضرات اکثر شامل ہوا کرتے تھے۔

ان مشاعروں میں حضرت اسیر بھی جب وہ رامپور میں ہوتے تو شریک ہوتے اور صدر مشاعرہ وہی ہوتے تھے کیونکہ شعرا میں ہر اعتبار سے اسیر کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا اور نواب کلب علیخاں بہادر کے استاد الاستاد تھے سب کے آخر میں غزل

پڑھتے تھے اور انہیں کی غزل پر مشاعرے کا خاتمہ ہوتا تھا۔

اکثر مشاعروں میں ردیف وار طرح ہوتی تھی اور کبھی یہ التزام نہیں بھی ہوتا تھا۔ نواب صاحب کی غزل بھی مشاعرے میں آتی تھی اور امیر ہی پڑھتے تھے۔ مشاعرے کے بعد نواب صاحب موصوف امیر کی غزل طلب فرماتے تھے خود دیکھکر لطف اٹھاتے تھے اور پڑھکر حاضرین دربار کو سنایا کرتے تھے چنانچہ امیر کی یہ غزل جو مشاعرے میں پڑھی جا چکی تھی۔

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا
جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

نواب ممدوح نے طلب کرکے ملاحظہ کی تو استاد سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس غزل کے کہنے میں آپ کا جی نہیں لگا حضرت امیر کو خیال ہوا کہ نواب صاحب کو غزل پسند نہیں آئی۔ امیر نے پھر فکر کی اور دوسرے وقت دوسری غزل پیش کی۔ نواب صاحب نے دیکھا اور کہا کہ آپ نے یہ غزل بھی توجہ سے نہیں کہی۔ اس پر امیر نے تیسری غزل تیسری دفعہ پیش کی۔ نواب صاحب نے تیسری غزل دیکھ کر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی اچھی نہیں ہے اس پر امیر کو پھر وہی خیال ہوا اور پھر فکر کرکے چوتھی غزل چوتھی بار پیش کی یعنی چار غزلیں کہیں۔ پھر تو نواب صاحب سے رہا نہ گیا بے اختیار ہو کر فرمایا کہ میں نے محض آپ کی فکر کا اندازہ کرنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ پہلی غزل دیکھکر مجھے خیال ہوا کہ اب اسمیں گنجایش نہیں ہے مگر آپ ہی کو خدا نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ اس زمین میں متواتر چار غزلیں ایک سے ایک بڑھکر کہہ لیں۔“ میرے خیال میں نواب صاحب نے جلدی کی کہ چار ہی غزل پر اپنا منشاء

ظاہر کر دیا اگر زیادہ دیر تک یہ سلسلہ قایم رکھتے تو البتہ امیر کی قوتِ فکریہ کا پورا پورا اندازہ ہوجاتا ۔ ان غزلوں کے مطالع حسب ذیل ہیں ۔

یہ رفتہ رفتہ ضعف سے احوالِ تن ہوا ۔۔۔ سائے کی بھی نگاہ سے غائب بدن ہوا

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا ۔۔۔ جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

اخگر کیطرح نیست بتدریج تن ہوا ۔۔۔ تن پیرہن تو پیرہن اپنا کفن ہوا

وہ مست ہوں نصیب مجھے تب کفن ہوا ۔۔۔ جب رہن مے فروش کے گھر پیرہن ہوا

چھیڑا جو میں نے یار کو گرمِ سخن ہوا ۔۔۔ پیدا مری زبان سے اُس کا دہن ہوا

ظالم بدل کے بھیس سوار راہزن ہوا ۔۔۔ پتھر بنا جو شیشہ تو توبہ شکن ہوا

سو رنگ سے میں مستِ بہارِ چمن ہوا ۔۔۔ جو گل نیا تھا جامِ شرابِ کہن ہوا

باہم جو ذکرِ زلفِ شکن در شکن ہوا ۔۔۔ برہم تمام سلسلۂ انجمن ہوا

مر کر علوے قدر سے عریاں بدن ہوا ۔۔۔ حوروں میں قدسیوں میں تبرک کفن ہوا

دل عشق میں یہ جاذبِ رنج و محن ہوا ۔۔۔ مانندِ داغ درد بھی جزوِ بدن ہوا

کس کا رخِ صبیح یہ پرتو فگن ہوا ۔۔۔ آئینہ دار مالکِ نہرِ لبن ہوا

مشاعرہ لکھنؤ

سنہ ۱۳ھ میں حضرت امیر لکھنؤ گئے ہوئے تھے ۔ حضرت اسیر کی رحلت کو تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا فرزندانِ حضرت اسیر مرحوم ہمعصر شعرائے لکھنؤ میں

ممتاز تھے جنکی نسبت حضرت امیر نے فرمایا ہے۔

خدا رکھے کیا ہے نام کیا استاد کا روشن

امیر استاد زادوں پر ہم اپنے فخر کرتے ہیں

حضرت امیر کے ورود سے شعرائے لکھنؤ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مدت کے بعد اُنکا یہاں آنا ہوا ہے اس موقع پر ایک مشاعرہ کیا جاے چنانچہ یہ طرح دیگئی۔

جادو بھرا ہوا ہے کسی کی نگاہ میں

اس مشاعرے کی اطلاع دینے جناب حکیم وجناب افضل حضرت امیر کے پاس اُسوقت آئے جبکہ مشاعرے میں بہت کم وقت رہگیا تھا۔ حضرت امیر نے کمی وقت اور ناسازیِ مزاج کا عذر کیا تو کہا گیا کہ آپکے فکر کی ضرورت نہیں ہے اس زمین میں آپ کی تین غزلیں چھپی ہوئی مراۃ الغیب میں موجود ہیں چند شعر اُس میں سے آپ پڑھ دیں تو مشاعرے کی عزت افزائی ہوگی۔ یہ سنکر حضرت امیر رضا مند ہوگئے مگر شاگردانِ امیر نے اطلاع پاکر اصرار کیا کہ اگر حضرت مشاعرے میں شرکت فرمائیں تو نئی غزل ہونی چاہئے۔

غرض حضرت نے تھوڑے وقت میں صرف ایکدن باقی رہگیا تھا فکر کی اور نئی دو غزلیں لکھکر اس وعدے کے ساتھ مشاعرے میں شرکت فرمائی کہ میں بوجہ نادرستی مزاج مشاعرہ ختم ہونے کا انتظار نہ کرسکونگا۔ امیر کی وجہ سے مجمع بہت بڑھگیا تھا یہ مشاعرہ لکھنؤ میں ایک یادگار مشاعرہ تھا پھر ایسا مشاعرہ کوئی نہیں ہوا جس میں وہ صورتیں نظر آتیں جو چالیس برس پہلے موجود تھیں۔

بعض لوگوں کو یہ گمان تھا کہ امیر اپنی پرانی غزل پڑھینگے مگر جب شمع حضرت کے

ملتفت آں اور حضرت نے غزل تازہ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں

لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مشاعرے کا رنگ بدلگیا۔ ایک ایک شعر نے بجلی کا کام کیا۔ حضرت کے بعد کسی شاعر کو غزل پڑھنے کی جرأت نہوتی تھی۔ کسی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں چاک کرکے شمع کے نذر کردیں کہ اب غزل پڑھنا بیکار ہے اور اسی وجہ سے مشاعرے میں تھوڑی دیر تک سکوت رہا کچھ وقفہ کے بعد شاعرے کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور یہ شاعرہ دوسرے دن ختم ہوا۔

منشی عبدالرحمن صاحب بسمل کا بیان ہے کہ حضرت امیر ہنوز مشاعرے میں تھے کہ اُن کے اشعار مشاعرے سے باہر نکل گئے اور لوگوں کی زبانوں پر دور تک پہونچے یہاں تک کہ میں نے چوک میں لوگوں کو حضرت کے شعر پڑھتے اپنے کانوں سے سُنا۔

اُستاد کی عظمت

حضرت اسیر نے امیر کے کلام پر ڈیڑھ دو برس سے زیادہ اصلاح نہیں دی مگر امیر کی سعادتمند و عقیدت کا یہ حال تھا کہ جب تک جناب اسیر زندہ رہے امیر حتی الوسع کلام دکھاتے رہے چاہے اصلاح ہوئی ہو یا نہو۔ جس وقت جناب اسیر کا انتقال ہوا حضرت امیر کے رنج و تعب کی انتہا نہ تھی اسی پریشانی اور غم میں

قطعۂ تاریخ تصنیف فرما کر دل کی کلفت نکالی جس کے ہر شعر سے جذباتِ دلی کا اظہار ہوتا ہے۔

افسوس کہ از گردشِ این چرخِ کہن — حاصل ز حیات نیست جز رنج و محن
نازادہ کس از مادرِ ایام کہ مرگ — آمادہ نکرد بہرِ او گور و کفن
تا آمدہ کس ز نیستی در ہستی — گور انتمودند نخستین مدفن
نشگفت گلے بہ فرودیں اندر باغ — کافسردہ و پژمردہ نشد در بہمن
خوش بود زمانِ گل و ایامِ بہار — گر بادِ خزاں نیامدے در گلشن
این طرفہ کہ چوں خزاں آید در باغ — او دل فگند بخاک سوری و سمن
نازادہ کس از خاک کہ گلشن نگرفت — از کینہ در آغوش و نیفشرد ش تن
گر چرخ بخاکیاں شود دشمن خاک — نو بادہ خویش را چرا شد دشمن
خوں ریز تر از چرخ نباشد جلاد — خونخوار تر از خاک نباشد رہزن
ہر روز غمے زاید و ہر شب المے — تا مادرِ ایام بود در زادن
ہر شام چو مہ کشد سر از جیبِ افق — ہر صبح کشد چو روز از شب دامن
رسمِ ستمے تازہ نہد سیرِ نجوم — طرحِ محنے نو فگند چرخِ کہن
ماتمکدہ است سطحِ این خاک دژم — کز سوگِ بزرگاں ہمہ اندر شیون
فارغ نبود ہیچ دل از سوگِ جہاں — خاصہ دلِ من ز سوگِ آن فخرِ زمن
شاہنشہِ اقلیمِ معانی کہ بیاں — قاصر بود از وصفِ کمالش چوں من
تا میر مظفر علی از این بنگاہ — بربستہ سبک رخت و گراں گشت حزن
او اوج گرفت و فضل و دانش پستی — او زندہ جاوید شد و مردِ سخن

استادِ جہاں بود بشاگردیِ او — زیباست اگر فخر کنند اہلِ زمن
جز راہِ حق نداشت پیدا و نہاں — جز روے باو نداشت در سرّ و علن
از بعد ہزار و اند زیں سال گہرے — از نسلِ علی آمدہ با خلقِ حسن
عمرے باید ملے بلالے ز حبش — پیدا شود و اویسؑ آید بقرن
تا زیست چناں نزیست کہ می باید زیست — چوں رفت چناں رفت کہ باید رفتن
چوں دید دریں جہاں غریب است ورا — باشد وطنِ دیگر و دیگر مامن
بگذاشت مرا بغربت اندر بے یار — خود یک تنہ راند و کرد رو سوے وطن
او رخت بروں بُرد ازیں دارِ فنا — من در غمِ او چاک زدم پیراہن
گفتم پئے تاریخِ وفاتش گویم — یک مصرعِ موزوں کہ دہد بوئے حزن
دیدم بفغاں و نالہ میگفت امیر — سلطانِ سخن امامِ فن قبلۂ من

۱۲۹۹ھ

نواب کلب علیخاں کی رحلت

نواب صاحب کی امارت و قیادت اور ریاست کی بہت شہرت تھی اور رامپور مجموعہ تھا ایسے اصحاب کا جن کی قابلیت اور علمیت اپنی اپنی جگہ خاص طور پر بہت زیادہ شہرت رکھتی تھی باوجود فارغ البالی اور اطمینان کامل کے نواب صاحب کی صحت اچھی نہ تھی اور یہ اُن کی کمال خوش نصیبی تھی کہ باوجود خرابی صحت مکہ معظمہ کو تشریف لیگئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک خیر و خیرات بیں

اسقدر روپیہ صرف فرمایا کہ آج تک وہاں کے لوگ اُن کو یاد کرتے ہیں۔

نواب صاحب کی رحلت ۲۷ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۴ھ روز چہارشنبہ کو ہوئی اور وہ جیسے نیک اور کامل الاوصاف تھے خدا نے ویسا ہی انجام کیا یعنے نزع میں دم آخر تک اسم ذات کا ورد جاری تھا۔ رامپور کیا ہندوستان سے عرب تک ان کی موت کا رنج و الم سب کو ہوا ظاہر ہے کہ حضرت امیر سے زیادہ کس پر اس سانحہ ہوش رُبا کا اثر ہوا ہوگا۔ حضرت امیر نے جو قطعۂ تاریخ اس حادثۂ جانفرسا پر لکھا ہے اُس کے ہر شعر سے ان کے دلی کیفیات ظاہر ہوتے ہیں۔ اسکو پڑھکر اب بھی پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری ہو جاتا ہے۔ اب وہ نواب خلد آشیاں کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

نواب صاحب کی وفات کی تاریخ جن جذبات اور دردِ دل کے زیر اثر حضرت نے کہی ہے اُس کو پڑھکر کوئی سنگدل بھی آنسوں کی چادر قبر پر چڑھائے بغیر نہیں رہسکتا۔ قبر گو رامپور میں ہے مگر جس جگہ کوئی ہوگا اس تاریخ کو پڑھکر روئیگا۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ یہ شعر دل سے نکلے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ امیر سے زیادہ دوسرے پر اس حادثے کا اثر کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا۔

قطعۂ تاریخِ وفاتِ نوابِ خلد آشیاں

الامان از برق تازیہائے چرخِ چنبریں الحفیظ از فتنہ سازیہائے ایں آفت کمیں

جائے عبرت باشد ایں آشوب گاہِ پرفتن چشم بکشا و دمے نیرنگِ دنیا را ببیں

کافتاب آسمانِ شوکت و جاه و جلال ‏ ‏ ماهِ چرخِ دولت و اقبال و فیض و داد و دین
فخرِ اربابِ سلف سرمایهٔ نازِ خلف ‏ ‏ افتخارِ اولین و اعتبارِ آخرین
حق پرست و حق پذیر و حق پژوه و حق شنو ‏ ‏ حق شناس و حق پسند و حق گذار و حق گزین
شاغلِ ذکر و نماز و عاملِ حج و زکوٰة ‏ ‏ پیروِ شرعِ حبیبِ خاصِ ربُّ العالمین
خوش مذاق و خوش بیان و خوش خصال و خوش جمال ‏ ‏ خوش خط و خوش گوی و خوش گفتار و خوش روی و حسین
وارثِ بے وارثان و چارهٔ بے چارگان ‏ ‏ میهمان پرور مسافر دوست غمخوارِ حزین
از درِ فیضش اعالی چون ادانی بهره یاب ‏ ‏ اغنیا از خرمنش همچون گدایان خوشه چین
دوست دشمن هر دو منقاد و مطیعِ حکمِ او ‏ ‏ زانکه رایاتش مظفر بود و آیاتش مبین
پیشِ قدرش آسمان انداخته رفعت بخاک ‏ ‏ با وقارش کوه تمکین ساختنے نذرِ زمین
چون نشستے بر سرِ تخت از پئے جود و نوال ‏ ‏ جم بُدے بر آستان و یم بُدے در آستین
شیر دل کلبِ علی خان بهادر نامور ‏ ‏ مالکِ طبل و علم رونق دهِ تاج و نگین
آنکه با یک کاروان از تابعانِ خویش گشت ‏ ‏ زائرِ بیت الحرام و روضهٔ سلطانِ دین
آنکه اندر عهدِ او شد رام پور آرام پور ‏ ‏ مصطفےٰ آباد شد در دورِ او این سرزمین
در هزار و دو صد و پنجاه پیدا گشته شد ‏ ‏ در هزار و دو صد و هشتاد و یک مسند نشین
در هزار و سه صد و چار از جمادی الآخره ‏ ‏ بست و هفتم چارشنبه بود و ساعت چارمین
ناگهان زد کوسِ رحلت سوے دارِ آخرت ‏ ‏ ذوقِ دین میداشت از دنیا برافشاند آستین
چشمِ حق بینش نیفگندے نظر جز سوے حق ‏ ‏ حق چو او را شغل با خویشتن دید این چنین
خواند در پیشِ خودش تا موردِ رحمت کند ‏ ‏ حق پرستی روحِ او را برد تا عرشِ برین
تیره تر شد از فراقش روزِ روشن همچو شب ‏ ‏ شد سیه پوش از وداعش هر کهین و هر مهین

چہرہ ہمہ بے نور گشت و جان و دلہائے سرور — آسماں شد پر غبار و خاک بر سر زد زمیں

رفتہ رفتہ تا حرم چوں رفت ازیں ماتم خبر — در حریمِ مہر ہے چوں محرماں غم شد مکیں

وائے قسمت ناگزیر دارم ز دنیا رفتِ من — زندہ ام اندر جہت ماتم ز حسرت تا یقیں

بدترم از مردگاں اما نمی میرم ازاں — رہ نمی یابد اجل سوئے منِ اندوہگیں

ہر نفس در سینہ از تیرِ مژہ گیہائے الم — می کشد تصویرِ حسرت چوں نگاہِ واپسیں

عہدِ پیری راحت افزوں خواہد و راحت کجا — میکند راحت رساں آرام در زیرِ زمیں

تا بہ کے افسانۂ ایں درد نالیہا امیر — تا کجا اظہارِ سوزِ دل بہ آہِ آتشیں

دست زن در دامنِ رحمت با خلاصِ نیاز — تا دہد جائے بزرگش حق بفردوسِ بریں

وز پئے سالِ وفاتِ آں شہِ خلد آشیاں — محوِ دیدارِ جمالِ رحمۃ للعالمیں

نقش کن از خامۂ حسرت بہ لوحِ مزار — خوابگاہِ حامیِ اسلام امیر المومنیں

۱۳۰۴ھ

نواب مشتاق علیخاں بہادر

گورنمنٹ ہند کی طرف سے مسٹر کولنگ کمشنر روہیلکھنڈ و پولیٹیکل ایجنٹ ریاست نے ۲۵ مارچ کو یہ اعلان کیا کہ ۲۳ مارچ کو نواب کلب علیخاں نے وفات پائی ان کی جگہ ان کے صاحبزادہ ولیعہد نواب مشتاق علی خاں کو گورنمنٹ ہند نے ریاست رامپور کا مالک اور رئیس تسلیم کیا ہے۔ جنرل اعظم الدین خاں نے ایک تقریر حسنِ انتظام برقرار رکھنے پر کی اور نظم و نثر میں تہنیت نامے پیش کئے گئے۔

حضرت امیر نے مسند نشینی کے موقع پر جو قصیدہ پڑھا وہ قابلِ دید ہے۔ قصائد میں

اُسکو دیکھیے گا۔

افسوس کہ نواب مشتاق علیخاں عوارضِ صعب کی وجہ سے دو سال تین مہینے حکمرانی فرماکر ۲۵ر فروری ۱۸۸۹ء دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت رحلت فرما گئے۔ آپ کا لقب بعد وفات نواب عرش آشیاں ہوا۔

حضرت امیرؔ نے ذیل کی تاریخ جس درد اور جوش میں لکھی ہے اس کو ایک سخنورِ قدیم ہی لکھ سکتا تھا۔

قطعہ تاریخ رحلت نواب عرش آشیاں

دنیا ہے عجب مقامِ عبرت   یہ حسرت و یاس کا مکاں ہے
اس گھر میں کہاں ثبات کو دخل   اس گھر میں جو ہے وہ میہماں ہے
اس گھر میں ہے ایک شب بسیرا   آیا ہے جو آج کل رواں ہے
دروازے ہیں حسرتوں کی بیٹھک   دیواروں سے بیکسی عیاں ہے
ہو اہلِ زمیں کو خاک راحت   گردش میں ہمیشہ آسماں ہے
فانی ہے یہاں کا عیش و آرام   ہے آج بہار کل خزاں ہے
دیکھو کہ جمادی الآخر کی   چوبیسویں کی یہ داستاں ہے
نواب وہ جن کا نام نامی   مشتاق علی کے ساتھ خاں ہے
رحلت فرما ہوے جہاں سے   بسمل اس غم سے اک جہاں ہے
ہے رنگ جو آسماں کا نیلا   آہوں کا گھٹا ہوا دھواں ہے
مانند زمیں ہے خاک بر سر   اس درجہ مکدر آسماں ہے

ہے ماتمیوں کا دودِ دل ... وہ — جس پر کہ سحاب کا گماں ہے
بتّیس برس کی عمر پائی — مرجانے کی عمر یہ کہاں ہے
انصاف و سخا و خُلق سب کا — شاہد ہر پیر و ہر جواں ہے
احساں جو کئے ہیں حد سے باہر — باہر امکان سے بیاں ہے
احسان کا بندہ ہے ہر انساں — تعریف سے خَلق تر زباں ہے
جاتا ہے سلوک رائیگاں کب — اب ساتھ وہ جُود و امتناں ہے
صبر آئے اسیر دل کو کیونکر — یہ ماتم مرگِ نوجواں ہے
اس غم میں چلا میں سوائے صحرا — جو خاص مقامِ وحشیاں ہے
ہر دم تھا یہی مری زباں پر — آقا مرے ہائے تو کہاں ہے
عبرت ہوئی راہبر اُدھر کو — حسرت کا خاص جو مکاں ہے
دکھلا کے بہت سی کہنہ قبریں — بولی یہ نشانِ رفتگاں ہے
ہیں ملکِ عدم کے سب مسافر — ہے پیر کوئی کوئی جواں ہے
شیخ ان میں ہے کوئی کوئی سید — کوئی ہے مغل تو کوئی خاں ہے
دارا و سکندر و فریدوں — سب مردوں کا یہی نشاں ہے
پوچھ ان سے کہاں وہ شان و شوکت — پوچھ ان سے کہاں وہ عز و شاں ہے
پوچھ ان سے کہاں ہے وہ چھپر کھٹ — پوچھ ان سے کہاں وہ سائباں ہے
کیوں دھوپ میں خاک پر پڑے ہیں — ہے چتر نہ تخت کا نشاں ہے
یہ دیکھ کے چیخ اٹھا میں بے تاب — ہے ہے یہ عدم کا کارواں ہے
پھرتا تھا اِدھر اُدھر تڑپتا — کہتا ہوا ہائے وہ کہاں ہے

میں جس کی تلاش میں ہوں برباد — جس کے لئے دل مرا تپاں ہے
آیا نظر اک زمیں کا تختہ — سمجھا میں کہ تختۂ جناں ہے
فردوس کے پھول ہیں سر قبر — ابر رحمت کا سائباں ہے
دولہا سا بنا ہے کوئی لیٹا — تربت پر سیج کا سماں ہے
دوڑا پئے فاتحہ سوئے قبر — سمجھا کہ یہی وہ آستاں ہے
آئی یہ ندا ادب سے آنا — یہ مرقد عرش آشیاں ہے

۱۳۰۶ ھ

نواب حامد علیخاں بہادر

آپ کی ولادت باسعادت ۲۹ رجب ۱۲۹۲ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۸۷۵ء کو ہوئی اور مسند نشین ریاست ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ ۲۷ فروری ۱۸۸۹ء کو ہوئے اور مسٹر نیل ایجنٹ ریاست نے منجانب گورنمنٹ دربار کر کے آپ کو تخت نشیں کیا۔ نواب صاحب نے مسٹر نیل کے جواب میں فرمایا کہ خدا نے چاہا تو اسی طرح عمل درآمد ہوگا جس طرح میرے آبا و اجداد اس بار عظیم کو اٹھاتے رہے ہیں۔ حضرت امیر نے نواب صاحب کی خدمت میں یہ قطعۂ تاریخ مسند آرائی پیش کیا۔

قطعۂ تاریخ جلوس

بارک اللہ جلوہ گر شد بر سریر سروری — نامور حامد علیخاں سروری را مستحق

آنکہ باشد حق پرست و حق پسند و حق پژوہ — آنکہ باشد حق شناسِ قدرداں را احق

فیض باشد از کتابِ خلقِ او یک صفحۂ — خلق از مجموعۂ اوصافِ ذاتش یک ورق

ابرِ جودش گر نبارد بر سرِ کشتِ امل — تخمِ ہر امید را باشد چو گندم سینہ شق

غازہ مالد در طرب گاہش فلک بر روئے خویش — مردم از ناآگہی خوانندش از نامِ شفق

گر پرِ پروانہ را سوزد شبے در بزمِ او — داغ گردد شمع و سرتا پا شود غرقِ عرق

پیشِ دستِ ہمتش آساں شود ہر مشکلے — ناخنِ فکرش کند حل ہر معمائے ادق

در میانِ گرزہائے گاؤ سر خصمش بود — صورتِ لامیکہ باشد در دو قافِ قلق

ملک و دولت یافت از بارِ نگاہ لطفِ او — رشتۂ شیرازہ بہرِ دفترِ نظم و نسق

سالِ ہجری و مسیحی زد رقم کلکِ امیرؔ
گوہرِ تاجِ ریاست ۔ ابرِ رحمت ظلِّ حق
۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء

علاوہ اس قطعۂ تاریخ کے حضرت امیرؔ نے تہنیت مسند نشینی میں ایک زبردست قصیدہ بھی کہکر پیش کیا جسکی تشبیب میں بہار و خزاں کا قابل دید معرکہ ہے وہ قصیدہ حصۂ دوم میں ناظرین کے ملاحظہ سے گزریگا۔

اس عہد میں ابتک بفضل خدا حضرت امیرؔ کا خاندان رامپور میں زیر سایہ نواب صاحب دعاگوئی میں مصروف ہے اور حضرت کے بڑے صاحبزادے جناب مولوی محمد احمد صاحب صریرؔ مینائی حق رازداری و خیر خواہی اسی طرح ادا کر رہے ہیں جس طرح ان کے والد مرحوم حضرت امیرؔ ادا کرتے تھے اور نواب صاحب کو اسقدر بھروسہ ان کی ذات ستودہ صفات پر ہے کہ شاید کسی اور پر ہو اپنا استادِ فنِ شعر بھی ان کو کیا ہے اور حضرت امیرؔ کے رنگ سخن کی اکثر تعریف فرمایا کرتے ہیں۔

حضرت امیر نے جو قصائد مسند نشینی اور جشن میں کہے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کے ساتھ حضرت کے خیالاتِ وفادارانہ کیا تھے۔

سفر بھوپال

امیر کی شہرتِ کمال نے تمام ملک سے اون کو روشناس کر دیا تھا حتی کہ بیشتر روساے ہند بھی انکی اعلی شخصیت سے بخوبی واقف تھے اور جس رئیس کو شعر وسخن کی لذّت تھی اُسکا میلانِ خاطر امیر کی جانب تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال نوراللہ مرقدہا شاعرہ بھی تھیں تاجور تخلص تھا انکی صحبت میں امیر کا ذکر اکثر آیا کرتا تھا جسوقت اُنھوں نے اپنا دیوان مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا ہے اسکا ایک نسخہ تحفۃً امیر کو بھی بھیجا حضرت امیر نے اُسکا شکریہ ادا کیا۔ امیر اللغات کی دونوں مطبوعہ جلدیں بتوسط منشی امتیاز علی صاحب وزیرِ بھوپال سرکارِ عالیہ کی خدمت میں گزرانی گئیں اُنھوں نے اس عظیم الشان تالیف کو بنظرِ قدر دانی ملاحظہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں رسمِ خط وکتابت جاری رہی۔

حضرت امیر کے بھانجے شیخ حافظ علی عذر کے بعد بھوپال چلے گئے تھے اور پھر پلٹ کر وطن نہیں آئے یہ امیر کی بڑی بہن کے فرزند اور اُنکے تقریباً ہمسن تھے اُنسے ملنے کا خیال حضرت امیر کو مدت دراز سے تھا۔

اتفاق سے ۱۸۹۰ء میں حضرت امیر نواب سید بنیاد حسین خاں جاہ کے

اصرار پر کانپور تشریف لیگئے جو حضرت امیر کے عمدہ تلامذہ میں ہیں۔
اُستاد کی تواضع و تکریم میں نواب صاحب موصوف نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔
چار پانچ روز وہاں قیام فرماکے بعض اعزہ کی رائے سے حضرت نے سرکار عالیہ کو
تار دیا کہ میں بھوپال کا قصد رکھتا ہوں سرکار عالیہ نے اسپر اظہار مسرت فرمایا۔
اور اُنکے قیام کے لئے باغ فرحت افزا تجویز کیا گیا۔ جسوقت حضرت کی گاڑی بھوپال
کے اسٹیشن پر پہونچی ہے سرکاری گاڑیاں اور ارکانِ دولت پیشوائی کے لئے وہاں
موجود تھے۔ اور حضرت کے اعزا احبا و شعرا کا بھی ہجوم تھا۔ اعزاز کے ساتھ فرحت
افزا میں مہمانِ سرکار کئے گئے۔ سرکار عالیہ کی طرف سے روزانہ جو مدارات تھی
وہ بہت ہی قابل قدر اور پرشان و شکوہ تھی۔ زیادہ دن تک قیام رہا اور ایک
ملاقات سرکار عالیہ سے لطف کے ساتھ ہوئی۔

سرکار عالیہ نے عبدالجبار خاں بہادر سی۔ آئی۔ ای۔ وزیر ریاست کو ایما فرمایا
کہ امیر مینائی ہمارے مہمان ہیں آپ اُن سے ملئے۔ چنانچہ وزیر صاحب موصوف
فرحت افزا میں آکر ملے جو علاوہ اور قابلیتوں کے بہت باخدا بزرگ تھے۔
حضرت امیر سے ملکر انکے گرویدہ ہوئے۔ بار بار ملاقات ہوتی رہی۔

عید اضحیٰ کا موقع آگیا۔ امیر صاحب نے مسجد فرحت افزا میں دوگانہ عید
ادا کیا۔ وہاں شعر کہنے کا بھی سلسلہ رہا بعض مواقع پر کچھ اشعار بھی ملاحظہ سرکار
عالیہ سے گزرانے گئے۔ چنانچہ فرحت افزا میں فروکش ہوتے ہی یہ قطعہ
تصنیف فرمایا۔
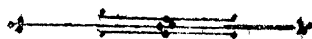
قطعہ

باز سر کردہ بہ طوفِ حرمت آمدہ ام — جاں بکف بھرِ نثارِ قدمت آمدہ ام
من ہم اے ابرِ کرم ہمچو صدف بردرِ تو — باامیدِ رشحاتِ کرمت آمدہ ام

رباعی تہنیت عید اضحی

عیدِ قرباں تھی سال بھر سے بعید — تھی زیست سے قطعاً اُسے قطعِ امید
عیدی اُسے دی گلے لگا کر شہ نے — کہنے لگی عید آج ہوئی میری عید

آم عطا ہونیکا شکریہ

آم آئے ہیں سرکار سے کیا تازہ و تر — ہیں شیرۂ جان سے میرے حق میں بہتر
ظاہر ہے آمیران کی سرسبزی سے — یہ آم ہیں فیضِ عام کے خاص ثمر

شکریہ مہمان نوازی

پامالوں نے کب یہ سرفرازی دیکھی — بیچاروں نے کب یہ چارہ سازی دیکھی
مجھ سے ہے تو ملا کے آنکھ کہدے کوئی — کس آنکھ نے یہ بندہ نوازی دیکھی

رباعی

از سوئے من ست یاس و حسرت اے شاہ — وز جانبِ تو نوید صد عزت و جاہ
من غرقِ ندامتم ز تقصیرِ سپاس — بحرِ کرمت بجوش سبحان اللہ

باریابی کے موقع کو سرکار عالیہ ٹالتی تھیں اس خیال سے کہ باریاب ہوتے ہی امیر صاحب چلے جائینگے۔ اس موقع پر آپ نے یہ رباعی کہکر پیش کی۔

رباعی

آئینہ دل میں گرد کلفت نہ رہے | محرومی بخت کی شکایت نہ رہے
حاضر ہو سلام کو درِ دولت پر | ہے عمر اخیر یہ بھی حسرت نہ رہے

باریابی ہونے پر حضرت امیر نے ایک مسدس تازہ پڑھا اور سرکار عالیہ نے بیحد تعریف فرمائی۔

باریابی کے بعد بھی پھر واپسی کی اجازت نہیں ملتی تھی اسکے لئے حضرت امیر نے یہہ رباعی گذرانی۔ جسکے ملاحظے کے بعد اجازت ملی اور باعزاز رخصت کئے گئے۔

رباعی

اس در پہ مسافر جو پہنچ جاتا ہے | بھولے سے بھی گھر یاد نہیں آتا ہے
مہمان جو دیکھتا ہے یہ شانِ کرم | رخصت کا نام لیتے شرماتا ہے

سفر بنارس

حضرت غفران مکان نظام الملک آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں طاب ثراہ کا تخلص آصف تھا جنہیں شاعری کا خاص ذوق تھا۔ امیر کے تصانیف مطبوعہ اکثر ملاحظہ فرماتے تھے۔ سنا گیا کہ داغ جب اُستادِ حضور ہوئے اور خطاب و منصب

سرفراز کیے گئے تو اعلیحضرت نے فرمایا کہ کیا امیر اب بھی یہاں نہ آئینگے مصاحبین ہیں بعض لوگ مثلاً جناب داغ و نواب داور الملک و نواب محبوب یار جنگ بہادر وغیرہ حضرت امیر سے رسم خط و کتابت رکھتے تھے حضرت کے نئے تصانیف جو سرکار میں نہ تھے جناب داغ نے حسب ایما طلب کر کے پیش کیے اور حضرت امیر کو یہ بھی لکھا تھا کہ یہاں میری اور آپ کی غزلیں ملائی جاتی ہیں اور کانٹے میں تولی جاتی ہیں خصوصاً یہ غزل ع کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا۔

پورا مطلع حضرت امیر کا یوں ہے۔

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا　　کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

ایک مرتبہ سرکار کے ایما سے جناب داغ نے یہ مصرع سرکاری

"یہ چوٹی کسلئے پیچھے پڑی ہے"

امیر صاحب کو بھیجا اور لکھا کہ فوراً اس طرح میں غزل لکھکے بھیجیے اور تلامذہ سے بھی کہلوا لیجیے چنانچہ حضرت نے اس فرمائش کو فی الفور پورا کیا۔

یہ غزل صنمخانہ عشق میں چھپی ہے اس جگہ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

غضب کی پھوٹ الفت میں پڑی ہے　　ملا ہے دل جو آنکھ اس سے لڑی ہے

نظر کس چشم فتان سے لڑی ہے　　کہ آنکھوں کو لیے نرگس پڑی ہے

شب غم مجھ سے بیٹھا جائے کیونکر　　تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

فلک کو پھونکتی ہے آہ دل کی　　ذرا سی شمع لو اتنی بڑی ہے

بڑی جھگڑالو ہے انکی حیا بھی　　کہ اک اک بوسہ پر پہروں لڑی ہے

ملا کر خاک میں آئے ہوس کو　　یہ کیسی گرد دامن پر پڑی ہے۔

لگاہِ ناز ہوتی ہے برآمد　　سلامی کو صفِ مژگاں کھڑی ہے
میری بیعت کو ٹھکرا کر وہ بولے　　کہاں کی نیند تمکو جھپٹ پڑی ہے
نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ پتلی　　دلھن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

جب یہ تازہ افکار ملاحظے سے گزرے تو حضرت غفران مکان کو حضرت امیر کی جانب جو توجہ تھی اُسمیں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور مصاحبین جو حضرت امیر کو یہاں آنے پر مجبور کر رہے تھے انکو اس امر میں اور بھی اصرار کا موقع ملا مگر امیر کے یہاں آنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی ایک تو پیرانہ سالی دوسرے یک درگیر محکم گیر پر انکا عمل تھا۔ نواب کلب علیخاں خلد آشیان کی رحلت سے اہلِ کمال کا شیرازہ منتشر ہوگیا تھا بعض شعرا بھی رامپور چھوڑ کر اپنی اپنی طرف راہی ہو گئے تھے داغ صاحب حیدرآباد چلے آئے تھے مگر امیر کی وضعداری نے ریاست کو اور ریاست کے تعلقات نے امیر کو نہ چھوڑا۔ البتہ امیر کو جس بات کی خواہش تھی وہ یہ تھی کہ امیر اللغات کی تکمیل ہو جائے۔ اور اُسکے ساتھ یہ بھی خیال رہتا تھا کہ لڑکے جو خدمت کے قابل ہیں انکا کہیں ٹھکانا ہو جائے۔

۱۳۱۷ھ میں حضرت غفران مکان مع اسٹاف وخدم وحشم کلکتہ تشریف لیگئے۔ امیر صاحب کو اطلاع دیگئی کہ کلکتہ سے واپس ہوکے بنارس میں اعلیحضرت قیام فرما ہونگے آپ اس موقع پر بنارس آکر مل لیجیے چونکہ یہ موقع حسن اتفاق سے ہاتھ آیا تھا حضرت امیر چند اعزہ و احباب کو لیکر بنارس تشریف لیگئے حضور اقدس اعلیٰ جب ہزہائنس مہاراجہ بنارس کی کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے مصاحبین نے عرض کیا کہ امیر مینائی حاضر ہیں۔ یہ سنکر اعلیحضرت اندر سے باہر آگئے اور فرمایا

کہاں ہیں آئیے صاحب حضرت حاضر ہوئے تو حضور والا ہاتھ پکڑ کر اندر لیگئے
اس موقع پر حضرت امیر نے سرکار کے ارشاد سے ایک مسدس پڑھا جو اسی سفر میں
کہا تھا۔ ہر شعر پر اعلحضرت بیحد تعریف فرماتے تھے۔ جب مسدس ختم ہوا تو فرمایا
کہ آپ ہمارے ساتھ حیدرآباد چلیئے۔ حضرت نے عرض کیا کہ میں قدیم نمکخوار ریاست
رامپور کا ہوں وہاں سے اجازت لینا ضروری ہے معہذا میں اسوقت حیدرآباد
کیلئے تیار ہو کر نہیں آیا۔ مصاحبین نے عرض کیا کہ بیشک امیر صاحب کو چلنا
چاہیئے اور ضرور چلینگے۔ اسکے بعد دربار برخاست ہوا سب باہر آئے اور مصاحبین
کے ڈیرے میں محفل احباب گرم ہوئی۔

داغ صاحب نے اپنی غزل سنانی شروع کی جسکے چند شعر یہ ہیں۔

خار حسرت بیان سے نکلا — دل کا کانٹا زبان سے نکلا
عذر اُنکی زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا
فتنہ گر کیا مکان سے نکلا — آسمان آسمان سے نکلا
کھا گئے تھے وفا کا دھوکا ہم — جھوٹ سچ امتحان سے نکلا
تم برستے رہے سر محفل — کچھ بھی میری زبان سے نکلا
پڑ گیا جو زبان سے تیری حرف — پھر نہ وہ اپنے کان سے نکلا
مر گئے ہم مگر ترا ارماں — دل سے نکلا نہ جان سے نکلا
وہ ہلے لب تمہارے وعدے پر — وہ تمھاری زبان سے نکلا
میرے آنسو کی اسنے کی تعریف — خوب موتی یہ کان سے نکلا
ذکر اہل وفا کا جب آیا — داغ اُن کی زبان سے نکلا

حضرت نے تعریف کی اور سب حاضرین نے داد دی بعد ازاں امیر صاحب سے فرمایش کیگئی کہ آپ بھی کچھ فرمائیں۔
امیر نے ایک مطلع اور چند شعر ایک دوسری زمین کے پڑھے۔ اور سامعین کو بسمل کر دیا۔

زبان ضعف پیری میں چلتی رہی — سحر ہوگئی شمع جلتی رہی

پہلو بچاؤں اُس سے جو دل کو سنبھال کے — مارے چھری وہ بات میں پہلو نکال کے
آئے ہیں سر میں عطر دلھن کا وہ ڈال کے — کیا کیا سہاگ ہیں مرے روزِ وصال کے
مشکل بہت پڑیگی برابر کی چوٹ ہے — آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کے
دستِ اجل سے عشق میں گلبازیاں ہیں — سر رکھدیا ہے دار پہ ہمنے اُچھال کے
ای جان اپنے غمزے کو تم روکتے نہیں — بیدرد لیچلا ہے کلیجا نکال کے
میرے تمھارے بیچ میں آتا ہے بار بار — کمبخت پاؤں بھی نہیں تھکتے ملال کے
دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا — دل لیجیئے مگر مرے ارماں نکال کے
آئی سحر اِدھر کہ اُدھر شام ہو گئی — دو دو گھڑی کے ہونے لگے دن وصال کے
راہِ فنا نہ گردِ رواں سے بھی طے ہوئی — شعلے بھی رہگئے ہیں زبانیں نکال کے

اعلیحضرت کا اسپیشل حیدر آباد روانہ ہوا اور گلبرگہ شریف پہونچکر حضرت امیر کی یاد ہوئی۔ مصاحبین نے عرض کیا کہ وہ بنارس میں حیدر آباد کیلئے تیار ہو کر نہیں آئے تھے اب جلد حاضر ہونگے۔

مسدس جو پڑھا گیا تھا ایک سو بند کا تھا۔ اس جگہ تمہید کے چند بند درج کیے جاتے ہیں۔

اللہ اللہ نیا رنگ ہوا عالم کا — پرتوِ مہر سے ذرّے کا ستارہ چمکا
بڑھ گئے قطرے سے طلا بحرِ کرم حاتم کا — آئینہ دل کا بنا جامِ جہاں بیں جم کا
آسمانوں سے نئے در فتح و ظفر کھول دئے
سر پہ نسرین ہما بن گئے پر کھول دئے

چترِ اقبال نے پامال پہ سایہ ڈالا — فخر کا تاج ہوا پائے طلب کا چھالا
بن گئے داغِ جگر پھول کھلا گلِ لالا — ہو گیا نالۂ موزوں قدِ سروِ بالا
شہ جو پائی نگہِ شاہِ ظفر پیکر کی
آبرو چھین لی اشکوں نے مرے گوہر کی

مثلِ گل آج ہوا خواہ کھلے جاتے ہیں — غیب سے گوہرِ مقصود ملے جاتے ہیں
شکر آتا ہے زبانوں پہ کھلے جاتے ہیں — حسرتیں دل سے یہ کہتی ہیں کہ بس جاتے ہیں
دل بڑھا جاتا ہے سرکار کی ہمت کی طرح
غم گھٹا جاتا ہے بدخواہ کی قسمت کی طرح

کچھ عجب رنگ ہے زیرِ فلکِ مینائی — جھومتی آتی ہے مستی ہے گھٹا پر چھائی
غنچۂ دل جو کھلا پھول کی خوشبو آئی — ڈوب کر عطرِ مسرت میں صبا اترائی

خُم بھرے شیشے کھُلے دور میں ساغر آیا
چرخ کہتا ہے کہ لینا مجھے چکر آیا

اُٹھ گئے آج در دل سے وہ پردے کہ جو تھے — چھٹ گئے ہر طرح کی امید کے بیٹھے پہرے
موجیں آہوں کی نہیں ساز طرب کے لہرے — بات سننے کی یہ ہیں کان عدو کے بہرے

کھل گیا غیب سے در طالع مسعود کا آج
سامنا ہو ہی گیا شاہد مقصود کا آج

بن کے پیشانی محبوب نصیبا چمکا — رہ گیا ڈوب کے تارا شب تار غم کا
چشمۂ مہر ہوا دیدۂ تر شبنم کا — اب ہے سر اور در امیدگہ عالم کا

بخت جاگے ہوئے ہیں عالم ہشیاری ہے
خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ بیداری ہے

اللہ اللہ یہ وہی بارگہ عالی ہے — سر گردوں کو جہاں حسرت پامالی ہے
عیش و عشرت سے بھری کلفتوں سے خالی ہے — ہاتھ باندھے ہوئے استادہ خوش اقبالی ہے

سطوت رعب و دبا اپنی ہوا باندھے ہو
لشکر لطف عنایات پرا باندھے ہو

داغ مرہم سے ملا درد دوا تک پہونچا — ذرہ اس درجہ بڑھا اوج سما تک پہونچا
دامن عجز گدا دست عطا تک پہونچا — تھا جو ناکام وہ اب کام روا تک پہونچا

لب پر آتے ہی دعا باب اثر تک پہونچی
نخل سے پھوٹتے ہی شاخ ثمر تک پہونچی

ہوشیار او دل مستانہ صہبائے حضور — تا کجا جوشش دریائے تمنائے حضور

لطف یہ ہے کہ سرِ عجز ہو اور پائے حضور
دل جدا آنکھ جدا محوِ تجلائے حضور

بات جو نکلے مسلسل رہے مربوط رہے
دامنِ پاسِ ادب ہاتھ میں مضبوط رہے

کسکی جانب ہے الٰہی یہ مرا روئے سخن
آج کچھ اور ہی ہے رنگِ سخن بوئے سخن

بن گئی فکرِ رسا شانۂ گیسوئے سخن
بات جب ہے کہ نہ چھوڑے کوئی پہلوئے سخن

شعر اونچے سے جو اونچا ہو زباں پر آئے
تو بھی عرش سے مضمون اُتر کر آئے

یہ سخن وہ ہے جو ہے روحِ سخن جانِ سخن
مدح سلطان کی ہے کیوں نہ ہو سلطانِ سخن

شانِ دربار یہ کہتی ہے بڑھی شانِ سخن
حال سخنور یہی گو ہے یہی میدانِ سخن

ہوں سب اشعار رسیلے کہ بنارس یہ ہے
شش جہت میں ہو یہ شہرہ کہ مدارس یہ ہے

سفرِ حیدرآبادِ دکن

حضرت امیر کے بعض فرزند جو ملازمت کے خواہاں تھے اور حضرت کو بھی انکی بے کاری گراں تھی انکی کوشش و ترغیب بار بار حضرت کو اس جانب مائل کرتی تھی کہ سفرِ دکن اختیار کیا جائے زمانۂ دراز سے اس خاندان کے بیشتر افرادِ سلطنتِ دکن کے نمکخوار اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے اسلیئے سلطنتِ آصفیہ فرزندانِ امیر کے لئے

کوئی بیگانہ مقام نہ تھا مگر بایں ہمہ حضرت کو پیرانہ سالی اور نادرستی مزاج مانع رہتی تھی
اب جبکہ بنارس میں اعلیٰحضرت سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوگیا تھا اور ارکانِ
دولت ایمائے خسروی سے مُصر رہتے تھے کہ سفرِ دکن کیا جائے حضرت امیر کو
تامل کا موقع نہ رہا۔ فرزندوں کی خواہش کے ساتھ تکمیلِ امیر اللغات کا خیال بھی
حضرت کو کچھ کم نہ تھا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور ایک خاص بات یہ بھی
تھی کہ زیارتِ روضۂ مبارک حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا اشتیاق حضرت
امیر کو ایک عمر سے تھا کیونکہ ارادت و عقیدت بزرگانِ ملت سے حضرت امیر
کو پیدائشی تھی۔ اور حضرت بندہ نواز تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے
چشم و چراغ ہیں جن سے مخدوم شاہ میناؒ کا سلسلۂ طریقت منوّر ہے۔ اس
غرض سے ریاست رامپور سے رخصت لیکر حضرت دوسری بار بھوپال آئے
کیونکہ راہ میں بوجہ بُعدِ مسافت کسی نہ کسی جگہ توقف کرنے کی ضرورت تھی۔
سرکار عالیہ نے حضرت امیر کو حسبِ سابق باعزاز تمام مہمان کیا اور ایکماہ
کے بعد رخصت فرمایا۔ حضرت مع دو فرزندوں لطیف احمد صاحب
اختر مینائی۔ مسعود احمد صاحب ضمیر مینائی اور برادر زادہ لیاقت حسین صاحب
مینائی۔ اور خادم راقم الحروف کے گلبرگہ تشریف لاکر فاتحہ و زیارت سے
مشرف ہوئے۔ دکن سے احباب امیر کے خطوط اور طلب کے تار بھوپال
ہی میں آنے لگے تھے اور اب گلبرگہ شریف پہونچنے پر تو خطوط اور تار دونکا
تانتا بندھ گیا دو روز قیام کرنے کے بعد حیدرآباد کی جانب روانگی عمل میں
آئی۔ اعلیٰحضرت کے مقربانِ خاص میں کئی صاحب حضرت سے ارادت و عقیدت

رکھتے تھے جو مُصر تھے کہ حضرت کا قیام ہمارے یہاں ہو نواب مشرف جنگ بہادر المتخلص بہ فیاض نے حضرت کو اپنے یہاں ٹھہرانے کا بطور خاص اہتمام کیا تھا اور جناب داغ کا اصرار تھا کہ میرے تعلقات قدیم ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ امیر حیدرآباد آئیں اور کہیں اور ٹھہریں۔ آخر میں جناب داغ کا ایک خط پہونچا کہ آج حضرت اقدس و اعلیٰ نے یہ طے فرما دیا ہے کہ امیر داغ کے مکان پر فروکش ہوں جناب داغ سے اور اُن سے بہت دیرینہ خصوصیات تھے جسکا اندازہ عام طور پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

۱۰ رجمادی الاول ۱۳۱۸ھ پنجشنبہ کو اسٹیشن حیدرآباد پر حضرت کا خیر مقدم بہت شان سے کیا گیا۔ اسٹیشن پر اسقدر مجمع تھا کہ پلیٹ فارم پر جگہ نہیں ملتی تھی سب کے پہلے مولوی عبدالجبار خان صاحب آصفی اور حضرت کے شاگرد رشید پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار مصنف فسانۂ آزاد بڑھکر دست بوس ہوئے حضرت سرشار کے ملنے سے بہت مسرور ہوئے جنکو تیس برس کے بعد دیکھا تھا۔ سرکاری گاڑیاں موجود تھیں حضرت امیر سب احباب سے مصافحہ و معانقہ کے بعد سوار ہوکر جناب داغ کے مکان پر تشریف لائے۔ دوسرے دن جمعہ تھا افضل گنج کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی گئی اور خیال تھا کہ ایک دو دن کے بعد بارگاہ خسروی میں باریابی ہوگی کہ حضرت امیر کو شنبہ ہی کے روز صبح سے صفرے کا ہیجان ہوا اور آخر کار شدید پیچش ہوگئی اس زمانہ بیماری میں حضرت امیر کی عیادت سر یمین السلطنت مہاراجہ پیشکار و وزیر اعظم کی جانب سے جو اس زمانہ میں وزیر افواج سرکار عالی تھے قریب روزانہ کیجاتی تھی۔

حضور اقدس و اعلیٰ کے ایما سے محمد ابراہیم صاحب ہر روز مزاج پرسی کیلئے آتے تھے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ میں نے مصرعِ طرح تجویز کیا ہے۔ آپ کی طبیعت درست ہو جائے تو بھیجونگا ۔ محمد ابراہیم صاحب کا بیان تھا کہ میں نے عرض کیا کہ سرکار مصرع طرح عنایت فرماویں تو ارشاد ہوا کہ نہیں امیر صاحب کی طبیعت پر بار پڑنا مضر ہوگا۔ جنابِ داغ نے تیمارداری اور علاج میں دلسوزی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔

ایک مہینہ تک جب مرض میں افاقہ نہ ہوا تو اطبا کی رائے سے مکان تبدیل کیا گیا توپ کے سانچہ پر نواب متہور الملک بہادر کے بنگلہ کے قریب ایک بنگلہ میں اُٹھ گئے۔ علاج میں بہت کوشش کی گئی مگر مشیتِ الٰہی کے آگے کوئی تدبیر کیا کام آسکتی ہے الغرض ایک مہینہ آٹھ روز علیل رہکر ۱۸ رجمادی الثانی ۱۳۱۸ھ گزرنے کے بعد نصف شب کو واصل بحق ہوئے۔

افسوس تجکو رحم نہ آیا کچھ اے اجل
مارا کہاں امیر غریب الدیار کو

نماز جنازہ مولوی فضل حق صاحب فرزند مولوی عنایت علی صاحب دہلوی نے پڑھائی۔ درگاہِ حضرت یوسف صاحب و شریف صاحب میں مدفون ہوئے۔

لوحِ مزار پر یہ تاریخ کندہ کی گئی

امیرِ کشورِ معنی امیرِ مینائی	خدا کے عاشق صادق دُرِ نبی کے فقیر
گئے جو خلدِ بریں کو تو اُنکی تربت پر	جلیل نے یہ لکھا روضۂ جناب امیر

۱۳۱۸ھ

جس پتھر پر تاریخ کندہ ہے اُسکی پشت پر جو بیرونی جانب ہے صاحبِ مزار کا

یہ شعر جلی حروف میں نقش ہے اور دور سے پڑھا جاتا ہے۔

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
امیر

مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری کو جنھیں حضرت امیر سے ایسا اتحاد تھا کہ یک جان و دو قالب تھے جس وقت اس واقعہ کی خبر پہونچی راقم الحروف کو تحریر فرمایا کہ امیر کے مزار پر جا کر میری طرف سے سلام کہو اور یہ شعر پڑھو

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست | تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

حضرت امیر کا ماتم تمام اخبارات و رسائل میں بہت دنوں تک کیا گیا۔

امیر مغفور کا یہ سفر سفر آخرت تھا قضا و قدر کے عجیب کرشمے ہیں کہاں پیدا ہوئے کہاں عمر بسر کی اور کہاں موت آئی بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ کے یہی معنی ہیں سوا خدا وند علام الغیوب کے کوئی نہیں جانتا کہ کس زمین پر مریگا۔ حالت مرض میں ایکدن حضرت نے فرمایا تھا کہ یہاں مرنے کے لئے آنا ہوا ہے اثنائے راہ میں ایک مسدس مدحیہ سرکار کہا تھا اُسمیں بعض مصرع ایسے ہیں جن سے سفر آخرت کا اشارہ پایا جاتا ہے۔

آپ کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے جو دیوان نعتیہ میں چھپا ہے۔

اب نہ ٹھہروں جو کہے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجکو

لفظ غریب الوطنی میں تاریخ رحلت نکلتی ہے یعنے ۱۳۱۸ عدد ہیں جو اُنکی وفات کا سال ہے۔ بعض شاعروں کی اس پر نظر پڑی اور اخباروں میں یہ شعر بار بار چھاپا گیا کیونکہ غربت میں موت آنے کی اس سے زیادہ کیا صراحت ہوگی اور یہ عجیب پیشین گوئی تھی۔

حضرت امیر کی موت ویسی ہی ہوئی جیسی اہل اللہ کی ہوتی ہے آخر دم تک نہایت بیدار رہے اُنکے ایما سے قرآن پاک کی سورتیں پڑہی جاتی تھیں اور وہ خود ذکر میں مشغول تھے۔ دیر تک یہ حالت رہی اسی حالت میں ایکبار آنکھیں کھول کے کسی کو غور سے دیکھا اور روح پرواز کر گئی؎ معلوم نہیں کہ کیا دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اُنکے مراتبِ قربِ اختصاص بلند کرے اور انکی حرمت سے بطفیل حضرت رحمۃ للعالمین ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ حضرت پہلے سے ایک وصیت نامہ لکھ گئے تھے جسمیں سب مسلمانوں خصوصًا اعزا واحباب سے دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب کی التجا کی تھی۔ حسبِ ہدایت وہ وصیت شایع کردی گئی اور ہر جگہ اُسکی تعمیل بھی ہوئی۔

؎ جس کمرے میں آپکا پلنگ تھا ایک لمپ روشن تھا نزع کی حالت شروع ہوتے ہی اُسکی روشنی گھٹ گئی اور بتدریج کم ہوتی گئی جسوقت روح نے پرواز کی لمپ خود بخود گل ہوگیا۔ خیال ہوا کہ شاید تیل نہیں ہے مگر دیکھا تو تیل موجود تھا۔

قطعات تاریخ وفات

رحلتِ امیر کی صدہا تاریخیں شعرا نے کہیں اور اخباروں میں چھپی ہیں اس جگہ چند تاریخیں نقل کیجاتی ہیں۔

از عالیجناب سر مہاراجہ بہادر یمین السلطنت پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

از دارِ جہاں امیر رفتہ فریاد — گفتا رضواں کہ گشت فردوس آباد
گفتیم دعائیہ چنیں سالِ وفات — محمود بود آخرتِ او - ای شاد
١٣١٨ھ

از جناب نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

داغ دے دیا چل بسا دنیا سے وہ — جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفیٰ آباد سے آیا دکن — یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
مبتلائے حدّتِ صفرا و تپ — مورد آزارِ اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب — در حقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے تسلی سلسلہ — شاعری میں خاص تلمیذ امیر
ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی — قصرِ عالی پائے جنت میں امیر
١٣١٨ھ

ولہ

چل بسے داغ کے بہت احباب — رات دن جنکے غم میں ہے دلگیر
آج اس غم کی یہ کہی تاریخ — اب ہوا دلپہ آہ داغِ امیر
۱۳۱۸

ولہ

کر گئے رحلت امیر احمد امیر — اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغ کے — آہ لطفِ شاعری جاتا رہا
۱۳۱۸ھ

از جناب حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

کجا امیر کجا سرزمین ملکِ دکن — کہاں قیام تھا مدفن کہاں ہوا ہے نصیب
جلال لکھدو یہ تاریخ اُنکی رحلت کی — امیر ہوگئے صد وای ایک مردِ غریب
۱۹۰۰

از جناب مولوی حافظ ساجد علی صاحب کاکوروی وکیل درجہ اول اورنگ آباد دکن شاگرد حضرت امیر

دریغا کہ مہرِ سپہرِ کمال — امیر عوالی مراتب بمرد
سخن بود پیکر روانش امیر — چہ گویم چہ عالی مناقب بمرد
کنون آن کجا آب و تابِ سخن — کہ شاعر جلیل المراتب بمرد

از مولف حقیر

بلبل نے سر بزم عزا یہ پوچھا آج | وہ کون تھے جنہیں روتے ہیں سارے شیدائی
پڑھا جواب میں اٹھکر یہ اک نے مصرع | امیر کشور معنی امیر مینائی

١٣١٨ھ

بعض حالات و مقالات

حضرت امیر خلق مجسم اور سراپا تہذیب تھے کبھی کسی کی برائی انکی زبان سے
نہیں سنی گئی۔ اور وہ کسی کی برائی سنتے بھی نہ تھے۔ شگفتہ مزاج تھے۔ کوئی کیسی
ہی خطا کرے خفا نہیں ہوتے تھے شریر سے شریر اور خائن ملازم کو بھی کبھی علیحدہ
نہیں کیا۔ اطفال اور خدام کو بھی تم اور آپ کے سوا کبھی تو کہکے مخاطب نہیں کرتے
تھے زہد و ورع ان کی فطرت میں تھا۔ فتوے پر تقوے کو اختیار کرتے تھے۔
ان کے دو ہی مشاغل تھے عبادات و ریاضات یا تصنیف و تالیف ان کی
صحبت میں سوا دینی اور علمی تذکرے کے اور کسی چیز کا ذکر مشکل سے آتا تھا۔
اگرچہ حضرت امیر کو دربار سلاطین سے تعلق رہا۔ مگر درحقیقت وہ دنیا دار
نہ تھے۔ بظاہر امیر تھے باطناً فقیر۔ تقریباً ہر ایک سے دعائے حسن خاتمہ
کی فرمائش کرتے تھے خطوں میں لکھتے بھی تھے۔ جناب داغ دہلوی نے بہت

صحیح کہا ہے۔

گو بظاہر تھا امیر احمد لقب　　درحقیقت باطناً پایا فقیر

میاں صاحب قبلہ (مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری) اور حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی المجددی سے انتہا کا خلوص تھا انہیں سے روزانہ صحبت رہتی تھی ظاہر ہے کہ یہ کیسی صحبت ہوگی۔

میاں صاحب قبلہ کے والد ماجد مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث بھی جو صورتاً و سیرتاً صحابہؓ سے مشابہ تھے امیر صاحب سے غایت درجہ اُنس رکھتے تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ منشی صاحب عزیز الوجود ہیں۔

حضرت امیر میں نورانیت ایسی تھی جس سے آنکی روشندلی ظاہر ہوتی تھی ایک دن ایک بزرگ نے کہا کہ منشی صاحب کی صورت دیکھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے اسپر میاں صاحب قبلہ نے فرمایا کہ جو آپ کہتے ہیں میں بھی وہی کہتا ہوں۔

میاں صاحب قبلہ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ منشی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عجیب جامع کمالات پیدا کیا ہے اگر اہل فراست کے زمرے میں دیکھا جائے تو وہ وزیر سلطنت ہونیکی قابلیت رکھتے ہیں اگر اہل علم کے زمرے میں دیکھا جائے تو سرتاج علما ہیں اگر درویشوں کے زمرے میں دیکھا جائے تو سب کے مرشد ہیں اگر شعرا کے زمرے میں دیکھا جائے تو ملک الشعرا ہیں۔

حضرت امیر نے کسی شاگرد کی نسبت کبھی یہ نہیں کہا کہ میرے شاگرد ہیں

بلکہ یہ کہتے تھے کہ میرے احباب میں ہیں جب کوئی اُنکے کمال کی تعریف کرتا تو تو کبھی یہ کہتے کہ ع

عالم ہمہ ہیچ نزد ما ہیچ

اور کبھی یہ کہتے تھے کہ جب کامل اٹھ جاتے ہیں تو ناقص ہی کو لوگ کامل کہنے لگتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی اپنے آپ کو کچھ سمجھا ہی نہیں یہی دلیل اُنکے کمال کی ہے۔

کسی شاگرد نے اُنکے کسی شعر کی تعریف اُنکے سامنے نہیں کی غالباً اُنکو یہ خیال ہوگا کہ ہمارا تعریف کرنا چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے۔

میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کی مشق سخن دیکھکے حیرت ہوتی ہے کسی اُستاد میں یہ بات نہوگی اس کے جواب میں فرمایا کہ میاں جلیل میری مشق کیا ہے مشق تھی حضرت (امیر) کی میں اُنکے سامنے ایک قطرہ ہوں اسی طرح میں نے بھی ایک مرتبہ اُن سے عرض کیا تھا کہ آپ کی مشاقی دیکھکر حیرت ہوتی ہے اُنھوں نے فرمایا کہ میاں امیر میری مشق کیا ہے مشق تھی حضرت مصحفی کی وہ سمندر تھے میں اُنکے سامنے ایک قطرہ ہوں۔

فرماتے تھے کہ شاعر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے کسی لایق شاگرد کا شاگرد ہو جاتا ہے یعنی لایق شاگردوں کو ہدایت کیجاتی ہے کہ وہ اُستاد کا کلام غور سے دیکھیں اور اگر کہیں کوئی کمزوری نظر آئے تو اُس سے آگاہ کردیں۔

یہ ارشاد شاید اس وجہ سے ہوگا کہ حضرت امیر کا دستور تھا کہ اپنا کلام اُسوقت تک شایع نہیں کرتے تھے جبتک امیر نظر غور سے دیکھ نہ لیتے تھے۔

فرماتے تھے کہ انسان میں دو جوہر ہونا لازم ہے۔ اللہ سے ڈرنا اور کمال پیدا کرنا۔
فرماتے تھے کہ لوگ دنیا کے تکلفات کو باعثِ عزت سمجھتے ہیں یہ اُنکی غلطی ہے
عزت صرف کمال پیدا کرنے میں ہے۔

عمدہ لباس۔ عمدہ غذا۔ عمدہ مکان وسامان پر اُنکو مطلق نظر نہ تھی اگرچہ
یہ سب چیزیں اللہ نے اُنکو دی تھیں۔

اہلِ علم و فضل جو باہر سے رامپور آتے تھے حضرت سے ضرور ملتے تھے۔ مولوی
مشتاق حسین صاحب وقار الملک۔ مولوی مہدی علیخاں صاحب محسن الملک
اور مولوی ذکار اللہ صاحب دہلوی۔ مولانا حالی۔ مولانا شبلی۔ ان سب اصحاب کو
حضرت کے پاس آتے میں نے دیکھا ہے۔

فرماتے تھے کہ مرزا غالب کی ذہانت اور اُنکی طبیعت کا ہر وقت حاضر رہنا
غیر معمولی تھا۔ اُن کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے اور اُسکو بہت پسند کرتے تھے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کیلئے

فرماتے تھے ضعف پیری سے مرزا غالب کو اصلاح دینا بار ہوتا تھا جس شاگرد کا
کلام آتا فقط ایک مطلع دیکھ لیتے اور واپس کردیتے کہ اس سے زیادہ طاقت نہیں ہے۔

رامپور میں مرزا غالب سے ایک سقے نے امداد طلب کی تھی کہ لڑکی کا عقد
درپیش ہے اُنھوں نے امداد کا وعدہ کرلیا تھا۔ اتفاق سے رامپور سے رخصت ہو کر
دلی کو چلے اور رخصتانہ نہ ملا شاید نواب صاحب کو خیال نہیں رہا تھا حضرت امیر کو
خیال آیا تو نواب صاحب سے عرض کرکے رخصتانہ بھجوایا۔ اُنکی پالکی شہر سے باہر

جا چکی تھی چوبداروں نے پہونچکر رستم بیگ کی مرزا صاحب نے پالکی وہیں رکھوائی
اور چوبداروں سے کہا کہ فلاں سقے کو میرے پاس بھیجو میں اُس سے وعدہ کر چکا
ہوں غرض جب وہ آیا اور اسکو روپیے دیچکے تب پالکی اٹھائی گئی
امیر صاحب کی زبان پر یہ اشعار اکثر آتے تھے۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درا — مرزا بیدل

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی — گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد — حزین

دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے — منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے۔ اسیر

لگیں تلواریں چلنے اس ادا پہ بانکوں ترچھوں میں
ذرا کج ہو کے بیٹھا تھا وہ قاتل پشتِ توسن پر — مصحفی

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے — یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے — سحر شاگرد ناسخ

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے — میر

تر دامنی پہ شیخ تو میری نہ جائیو — دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں — خواجہ میر درد

ہر طرف مصروف ہیں زاہد نمازِ صبح میں　　گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجئے　ناسخ

دل کو رکھ دیتے ہیں یہ کہکر کمان دارنہیں ہم　　جو اُڑا دے اس نشانے کو وہ تیر انداز ہے　آتش

مرزا دبیر میر انیس دونوں کو باکمال سمجھتے تھے اور دونوں کے مداح تھے فرماتے تھے کہ انیس کی چست بندشیں قابل آفریں ہیں ایسے ہی چست شعر کہنا چاہئے

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو　　ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے　　چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار　　خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگجائے آبگینوں کو

فرماتے تھے کہ " سدا کا لفظ بہت فصیح ہے متوسطین نے اسکو ناحق ترک کردیا میرا جی چاہتا ہے کہ اسکا استعمال کروں " - مگر کبھی استعمال نہیں کیا اور لطف یہ ہے کہ داغ صاحب سے جب حیدرآباد میں یکجائی ہوئی تو انکو بھی یہی کہتے سنا کہ سدا کا لفظ استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے " مگر انہوں نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا یہ ان حضرات کی احتیاط کا مقتضا تھا ورنہ استعمال کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

مزاح کو حضرت پسند کرتے تھے بشرطیکہ اُسمیں کوئی ندرت اور متانت ہو۔

جناب تسلیم نے ایک شعر سنایا۔

بے حجاب اسکو کیا شوخی نے میری وصل میں　　ایک بات ایسی کہی جامہ سے باہر ہو گیا۔

حضرت نے اُن کے کان میں کہا کہ آپ نے بڑی بی کہہ دیا ہوگا۔

حضرت امیر کی طبیعت میں گرمی اور شوخی بے انتہا تھی جو شاعری تک محدود تھی بعض لوگ کہتے تھے کہ حضرت کو دیکھنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ یہ شاعری انہیں کی ہے۔

میاں صاحب قبلہ نے ہارون رشید کا ایک تاریخی واقعہ حضرت سے بیان کیا اسمیں حسین عورت کا بھی ذکر تھا سلسلہ تقریر میں میاں صاحب نے حضرت سے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان سے بڑھکر عورت کا کوئی قدر دان نہیں ہوتا (یعنے مسلمان اس صفت میں سب قوموں سے بڑھے ہوئے ہیں) اس پر حضرت بے اختیار ہنسے اور ہمیشہ اس برجستہ فقرے کو یاد کرکے تبسم فرماتے تھے۔

مولوی ولی محمد خاں رامپوری کو جو فارسی گو تھے اپنے شعر سُنانے کا بہت شوق تھا اور مرزا غالب اس سے واقف ہوچکے تھے ایکدن رامپور میں خانصاحب موصوف غالب سے ملنے آئے۔ اور حسبِ عادت شعر پڑھنا شروع کیا۔ ایک مطلع سنتے ہی غالب نے کہا کہ مجکو اٹھاؤ (ضعف کی وجہ سے اٹھنے میں سہارا درکار ہوتا تھا) لوگوں نے اُٹھایا۔ مرزا صاحب ولی محمد خاں کے گرد پھرے۔ سر پر بوسہ دیا اور کہا اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔

ایک دن باہر کے بعض قابل لوگ حضرت سے ملنے آئے مسائلِ شاعری کے متعلق استفادہ کیا بعد ازاں حضرت سے کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ دیر گاہ سلامت رکھے آپ کے بعد ہم ایسے حاجتمندوں کو کس سے رجوع کرنا چاہئیے میں (راقم الحروف) الگ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا حضرت نے اُنکے جواب میں میری طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے فرمایا کہ اِن سے رجوع کرنا چاہئیے وہ لوگ اُٹھے اور مجھ سے مصافحہ کیا میں اس واقعہ سے سخت حیرت زدہ ہوا اور شرم سے آب آب ہوگیا کیونکہ حضرت کے بہت سے

قابل و فاضل قدیم تلامذہ موجود تھے جنکے آگے میری کوئی ہستی نہ تھی۔

علم عروض کے تمام جزئیات اور زحافات جسطرح حضرت امیر کو مستحضر تھے ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے۔ کتاب شجرۃ العروض مصنفہ حضرت امیر اُن کے صاحبزادوں کے ساتھ میں نے بھی اُن سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔

فرماتے تھے کہ میرے اُستادِ معقولات مفتی سعد اللہ صاحب کی طبیعت موزوں نہ تھی مگر عروض کی خدمت کرنے سے موزون ہوگئی۔ عروض میں مفتی صاحب کی تصنیف معیار مشہور ہے جسکی شرح زرِ کامل عیار حضرت امیر نے لکھی ہے۔

شاگردوں کی اصلاح و تعلیم کی جانب خاص توجہ تھی اور وہی توجہ اس کا باعث ہوئی کہ کثرت سے لوگ فیضیاب ہوئے۔

کوئی صاحب شعر سنانے کی اجازت چاہتے تو اُن سے حضرت امیر فرماتے تھے۔

ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

اب جبکہ حضرت امیر استاد الاساتذہ تھے اکثر فرماتے تھے کہ اگر حضرت اسیر زندہ ہوتے تو اب بھی میں اپنا کلام اصلاح کے لئے پیش کرتا۔

حضرت اپنے شاگردوں سے اکثر فرماتے تھے۔ ع

دورِ مجنوں گذشت و نوبت ماست

یعنے میری قوتِ گویائی ہو چکی اب تمہاری زور آوری کا زمانہ ہے جسطرح بوڑھا پہلوان کنارے بیٹھا ہوا داؤں پیچ بتاتا ہے خود اکھاڑے میں نہیں اُترتا وہی اب میری حالت ہے۔

خطوط وغیرہ میں اپنا نام کبھی فقیر امیر احمد امیر لکھتے تھے اور کبھی فقیر امیر اور کبھی امیر فقیر۔ غرض فقیر کا لفظ ضرور ہوتا تھا جو امیر کے لئے بالتخصیص موزوں تھا۔ فرماتے تھے جی چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ مجکو دنیا سے اٹھا کے جنت میں پہنچادے بیچ کے مرحلوں سے سابقہ نہ پڑے اور یہ اُسکی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔

فرزندان حضرت امیر مینائی

حضرت امیر کی یادگار اُنکے پانچ فرزند ارجمند ہیں جن سے مرحوم کا نام اس دار فنا میں زندہ اور باقی ہے اللہ تعالیٰ اس چمن مینائی کو سرسبز و شاداب رکھے۔ استاد زادوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مولوی منشی محمد احمد صاحب صریر مینائی

ان کا تخلص پہلے قمر تھا۔ اب صریر ہے فن شعر میں موجودہ عالی منزلت نواب صاحب والی رامپور بالقابہ کے اُستاد ہیں جسطرح حضرت امیر نواب خلد آشیان کلب علیخان کے اُستاد تھے علم و فضل اعلیٰ قابلیت اور صفات عالیہ سے متصف اور اپنے والد بزرگوار کے جانشین حقیقی ہیں۔ آپکی شاعری زبردست اور آپ کی تحریر بے نظیر ہے۔ نواب خلد آشیان کے عہد سے معزز خدمات پر مامور رہے اور اسوقت نواب صاحب کے اسٹاف میں ممتاز صاحب علم۔ قابل محترم اور ذی اعتبار ہیں۔ آپ کا دیوان مرتب

جو ابھی طبع نہیں ہوا۔ چند اشعار گہر نثار اسجگہ لکھے جاتے ہیں۔

یہ ملا تجھ سے دلربا مل کے | ناز اُٹھانے پڑے ہمیں دل کے
ہائے مجھ سے چلے وہ تیغ کی چال | مار ڈالا مجھے گلے مل کے
بن کے انجان کہتی ہے لیلیٰ | کون رہتا ہے پیچھے محمل کے

دیکھ لیتا ہوں جو آنکھیں اسکی شرمائی ہوئی | آ نہیں سکتی زبان تک دل میں بات آئی ہوئی
اُن سے کہتی ہے نزاکت وقت آرائش قمر | جان پریاں بنگئی اچھی خود آرائی ہوئی

لن ترانی کی صدا آئی تو موسیٰ نے کہا | آشنا کان ہیں کچھ کچھ یہ سخن کس کا ہے

کچھ اس رنگ سے غنچہ گلشن میں چٹکا | کہ یاد آگیا مجھکو بچپن کسی کا
جلے جاتے ہیں غم سے نخلِ تمنا | خزاں لوٹے لیتی ہے گلشن کسی کا

ترے پیکان کو دم بھر روک لیتا | نہ اتنا بھی ہوا میرے جگر سے
بہت رویا مرا چاکِ گریباں | گلے مل کر گریبانِ سحر سے
حیا نے وصل میں روکا ہے رستہ | کہو شوخی اب آئیگی کدھر سے

وہ کہتے ہیں رنگت ہی یہی میری حنا میں | کیا لعل لگے ہیں کوئی خونِ شہدا میں
کیا جانیئے دل ہے کہ جگر ہے وہ کسی کا | اک پھول ہے آج اُن کے گریبانِ قبا میں

ہائے یہ اتنا کبھی اے خنجرِ براں نہ ہوا
تو لپٹ کر مری گردن سے گریباں نہ ہوا

فیضِ صحبت سے ہو کیا جوہرِ ناقابل کو
عکسِ انسان سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا

جان کر گیسوئے محبوب بلائیں لے لیں
مر کے بھی خوابِ پریشاں سے پریشاں نہ ہوا

خورشید احمد مینائی

حضرت امیر کے خلف الرشید جناب مسرور سے چھوٹے ہیں۔ ان کی طبع سلیم میں صلاحیت اور متانت خاص ہے ذکی اور ذی استعداد ہیں۔ [illegible] امیر اللغات میں جب وہ لغت زیر تالیف تھا بہت حصہ لیتے تھے شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔

لطیف احمد اختر مینائی المخاطب بہ نواب اختر یار جنگ بہادر

خوش فکر اور خوش گو ہیں یہ اپنے والد کے فیضِ صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں نظر باریک بیں اور طبیعت نقاد ہے سکۂ سخن کو خوب پرکھتے ہیں۔ اپنے والد حضرت امیر کے ساتھ سنہ ۱۳۱۸ھ میں حیدر آباد آئے تھے جب سے یہیں ہیں۔ سنہ ۱۳۱۹ فصلی سے نمکخوار سلطنتِ آصفیہ ہیں اسوقت حضور پرنور کے الطاف خسروانہ سے محکمۂ عالیہ امور مذہبی کے ناظم اور معتمد ہیں۔ پاکیزہ اخلاق و نفیس مزاج ہیں۔ آگے شعر بہت کہتے تھے مگر اب بوجہ مصروفی کار سرکار شاعری کا موقع کم ملتا ہے تھوڑے سے اشعار ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

جوبن ہے ان دنوں جو تمہارا ابھار پر
دوڑی بہار ہے چمنِ روزگار پر

بجلی گرا دو ہنس کے نہ تم لالہ زار پر
آتی ہے آنچ میرے دلِ داغدار پر

وہ ایک روز کیلئے چھپنا قمر کا ہے
ہوتے دو وقت نقاب اگر روئے یار پر

آرائشوں میں رہتے ہیں مصروف نازنین
کچھ نازکی کا بس نہیں چلتا سنگار پر

اے اضطراب تجھ کو پسند آئی کیا ادا
تو ہے جو لوٹ پوٹ دلِ بیقرار پر

مستانِ عشق کو ہے ہمیشہ چڑھی ہوئی
موقوف یہ جنوں نہیں فصلِ بہار پر

چینِ جبیں ہے محو اسی اہتمام میں
گردِ نظر پڑے نہ کہیں روئے یار پر

کچھ سیرِ گل کا شوق نہیں گلعذار کو
مدِ نظر ہے چوٹ عروسِ بہار پر

یہ ارتباطِ شانہ و آئینہ تا کجا
برہم نہ سادگی ہو تمہارے سنگار پر

مستانِ شوقِ دید کو پروا نہیں کوئی
اٹھائے یا نقاب رہے روئے یار پر

اختر دعا کے واسطے کیونکر اٹھائے ہاتھ
ہے اک جگر پہ ایک دلِ بیقرار پر

وہ ایسے کون ہیں جو راز افشا کرنے والے ہیں
یہی کمبخت آنسو ہیں یہی بیدرد نالے ہیں

کسی نے بن سنور کر پھر قدم باہر نکالے ہیں
ابھی دو چار باقی اور شاید مرنے والے ہیں

نگاہِ ناز کو اک ہم دعا دیتے ہیں کیا ظالم
ترے اس تیر نے کتنے کلیجے چھید ڈالے ہیں

نمودِ حسن ہی صدقہ اُنہی کا ہے نہ مانو گا
کبھی تم نے کسی ناشاد کے ارمان نکالے ہیں

کبھی کھنچنا کبھی تننا کبھی کچھ چل کے رک جانا
عروسِ تیغ نے نخرے قیامت کے نکالے ہیں

ہم ایسی کارواں میں ہیں جو اک اجڑی سی ٹکڑی ہے
یہاں بانگِ جرس کیسی یہی دو چار نالے ہیں

جو چپ رہیے تو کرتی ہے خموشی خود زباں پیدا
جو کچھ کہیے شہادت کیلئے موجود نالے ہیں

گریباں اپنا۔ جامہ گل کا۔ دامن کوہ و صحرا کا
ہر دست جنوں سے سب یہ پرزے ہونے والے ہیں

نگاہِ ناز سے پہلے نگاہِ شوق اٹھیگی
تم اپنا دل سنبھالو ہم جگر اپنا سنبھالے ہیں

ملی ہے داد یہ فریاد کی اللہ رے قسمت
مزے لے لیکے وہ کہتے ہیں کیا پُر درد نالے ہیں

جزاک اللہ کیا کہنا تمھاری فکر کا اختر
تڑپ جاتا ہے دل وہ پُر اثر مضموں نکالے ہیں

کہتے جاتے ہیں وہ سنکر مرے افسانے کو
کس مصیبت میں پڑے چھیڑ کے دیوانے کو

کچھ جو کہیئے تو ہے موجود لپٹ جانے کو
کیا تماشے کا جنوں ہے ترے دیوانے کو

پوچھیے شمع سے اب سوگ میں کیوں روتی ہے
رحم آیا نہ جلاتے ہوئے پروانے کو

عشق کی آگ خبر لیتی ہے معشوق کی بھی
شمع ٹھنڈی رہی کب پھونک کے پروانے کو

وہ چلا چال کہ ہوش اڑ گئے سب کے ساقی
میں سمجھتا تھا نہ ایسا ترے پیمانے کو

دل جلے عشق کے مرنے کو سمجھتے ہیں حیات
کوئی کہتا نہیں پروانے سے جل جانے کو

صبح آتی ہے مگر دونوں کو رخصت کرنے
وہ یہاں جانے کو ادھر جان ادھر جانے کو

یاد آئی ہے جو شب کو ہم چشم ساقی
صبح تک ہاتھ سے رکھا نہیں پیمانے کو

ہائے اس مست کا اختر سے یہ کہنا شب کو
تو اٹھا شیشے کو لیتا ہوں میں پیمانے کو

جب کہا اُسنے کسی کو ہے ہماری یاد بھی
دیر تک تڑپا کیا میں بھی دلِ ناشاد بھی

صرف چشم شرمگیں کے دو اشارے چاہیئے
جان بھی ای جان حاضر ہے دلِ ناشاد بھی

ہجر میں کیا کہکے اپنے دل کو سمجھا رکھا ہیں
آپ جاتے ہیں تو ہوتا جائے کچھ ارشاد بھی

آ گیا کیا جلد دل کو اُنکے وعدے کا یقین
ہو کے خوش دینے لگا مجھکو مبارکباد بھی

الاماں اُس شوخ سے جو آسماں ہے یہ کہے
تو ستمگر ہے فقط۔ میں ہوں ستم ایجاد بھی

ہائے کیا تاثیر رکھتی ہے حسینوں کی ادا
لطف کا کیا ذکر دیتی ہے مزہ بیداد بھی

رنج و راحت ہیں اگر توام تو اک دل اور ہو
ورنہ مشکل ہے کہ رہیے شاد بھی ناشاد بھی

جسطرف دیکھا نہیں گلہائے داغ آئے نظر
سیر کے قابل نہ پایا گلشن ایجاد بھی

ہائے یہ کہنا نہ بھولیگا کبھی اُس شوخ کا
سچ کہو اختر تمہیں ہے کچھ ہماری یاد بھی

ممتاز احمد صاحب آرزو مینائی

یہ شاعری کے بڑے دلدادہ ہیں زیادہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اسجگہ تھوڑے سے شعر اُن کی طبعزاد لکھے جاتے ہیں۔

لوٹتی ہے زلف اُس بت کی کمر پہ باربار
دیکھکر مجنوں کو لیلیٰ کیسی دیوانی ہوئی

بوئے گل پھولوں سے کرتی ہے گلہ گلزار میں
تم نے کپڑے پھاڑے میری مفت عریانی ہوئی

دل کی دیکھا دیکھی چوٹی بھی ترے پیچھے پڑی
وہ تو دیوانہ تھا یہ بھی تجھ پہ دیوانی ہوئی

صبح اٹھکر روز آتے ہیں تماشے کو حسین
آرزو کی صورت آئینے کی حیرانی ہوئی

جسکی کلی کلی سے ہمیں ربط تھا کبھی
صیاد کیا بتائیں وہ گلزار کیا ہوا

دل پھر تو شامیانہ بنا کوئے یار میں
ہونے ہی شام سایۂ دیوار کیا ہوا

پہلے سنگھا کے زلف مجھے لاؤ ہوش میں
پھر مجھ سے پوچھنا مرے بیمار کیا ہوا

مسعود احمد صاحب ضمیرؔ مینائی

یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں ذہانت و طبّاعی میں حضرت امیرؔ کا نمونہ ہیں۔ ذکاوت غیر معمولی رکھتے ہیں اور فوراً شعر کہہ لیتے ہیں علاوہ عربی فارسی میں استعداد رکھنے کے انگریزی کے بھی ماہر ہیں۔ حضرت امیر انکو کبھی اپنے پاس سے جدا نہیں ہونے دیتے تھے حیدرآباد کے سفر میں بھی یہ ساتھ تھے ممالک متوسطہ برٹش انڈیا میں ملازم ہیں۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آب و تابِ حسن سے کچھ ایسی نورانی ہوئی — آنکھ کا تارا چمک کر صبح پیشانی ہوئی

فتنۂ محشر کے پردے میں چھپو گے تم کہاں — ہے تمہاری شوخیوں کی چال پہچانی ہوئی

مجھکو غصّے میں اجل کے گھاٹ اتارا یار نے — کشتیٔ موجِ فنا وہ چینِ پیشانی ہوئی

جس حسین نے آئینہ مانگا سنورنے کیلئے — پہلے آئینے سے حاضر میری حیرانی ہوئی

خوش کیا سب کو گلے مل مل کے تیغِ یار نے — واہ اچھی عید آئی اچھی قربانی ہوئی

پڑ گئی جب وہ نگاہِ شوخ بجلی پر ضمیرؔ — ایسی شرمائی کہ بدلی کی طرح پانی ہوئی

۷۸۶
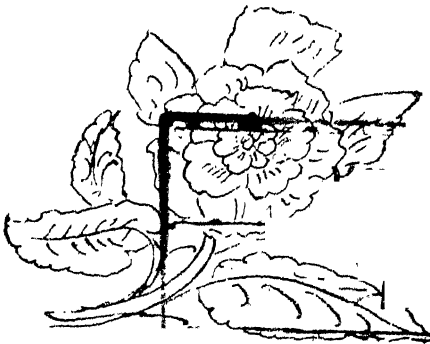
گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں — امیرؔ

کارنامۂ امیر مینائیؒ

یعنی حضرت امیرِ مینائیؒ کے تصانیف کا انتخاب اور اُس پر ریویو

(مولفہ)

استاذ السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

جانشینِ امیرِ مینائیؒ

در مطبع سعیدی دار الشفا حیدرآباد دکن طبع گردید

۱۳۴۷ھ

حقوق محفوظ ہیں

S. Fazlullah. At

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُس وقت جبکہ امیرؔ نے میدانِ سخن میں قدم رکھا ہے شاعری کا آفتاب اوجِ کمال پر تھا۔ معنی آفرینی بلند خیالی شوکتِ الفاظ لازمۂ شاعری ہو گئی تھی۔ معانی و بیان فصاحت و بلاغت استعارات و تشبیہات۔ صنائع و بدائع کے دریا بہہ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ نے جس طرح زبان کی اصلاح کی تھی اُسی طرح شاعری کی بھی جدید بنیاد ڈالی تھی۔ اُنھوں نے اور اُن کے ہمعصروں نے صائب و کلیم و سلیم کی گویائی اختیار کی۔ تخیل کو بہت بلندی پر پہونچا دیا جس سے شعر میں زور اور لنگ پیدا ہو گیا۔ بندش ایسی چست جیسے گندھی ہوئی چوٹی۔ صفائی ایسی جیسے مصفّا آئینہ کہ شاہدِ معنی کی صورت دور سے نظر آجائے مثلاً

ناسخ

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؔ کا — روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

بیعت خدا سے ہے مجھے بے واسطہ نصیب — دستِ خدا ہے نام مرے دستگیر کا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

پھر بہار آئی چمن میں زخمِ دل آلے ہوئے — پھر مرے داغِ جگر آتش کے پرکالے ہوئے

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پان ہے — تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا — تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

جل اٹھا باغ اسکی برقِ حسن کی تاثیر سے
پھول اب گلچیں اٹھاتے ہیں تو آتشگیر ہے

یا دلب سے گرمیِ داغِ دلِ دیوانہ ہے
آتشِ یاقوت سے روشن چراغِ خانہ ہے

یہ اُسکے ہے ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھا ہو دہ بیدم
نیام ہے تیغِ قضا کے مُبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دُکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

ہو وطن میں خاک بہتر گوہرِ مضموں کی قدر
لعلِ قیمت کو پہونچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

آتش

خدا سمجھے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہوا ہے سنبلستاں کا

بہار لالہ و گل سے لگی ہے آگ گلشن میں
گریباں پھاڑ کر جل بیٹھیے صحرا کے دامن میں

بتوں کے عشق نے آخر دکھایا دل کو اُنکے بھی
برہمن بردۂ ناقوس میں فریاد کرتے ہیں

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اسیر

ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا
شگافِ خانۂ کعبہ چاک ہی میرے گریباں کا

دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے
منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے

روح کے ساتھ ہی قالب میں قضا بھی آئی
شمع آئی مرے گھر میں تو ہوا بھی آئی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اُٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

وزیر

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

نہ گیا ذبح کیا چھوڑ کے بسمل قاتل ——— دہنِ زخم پکارا کیا قاتل قاتل
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو ——— کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ایسی پُر زور گویائی اور ایسی پاکیزہ بندش قبل ازیں کہاں تھی اس جدت نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ اسکا اثر لکھنؤ تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمگیر ہو گیا۔ ۱
ہر قابل شاعر اسی جادے پر گامزن ہونے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ یہ رنگ ہی ایسا تھا کہ جو ذی ہوش دیکھتا مدہوش ہو جاتا تھا ملاحظہ ہو ناسخ اور ذوق کا ایک ایک مطلع

ناسخ — مرتبہ کم اوج رفعت سے ہمارا ہو گیا ——— آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا
ذوق — نام یوں پستی سے بالا تر ہمارا ہو گیا ——— جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہو گیا

مرزا غالب نے ناسخ کے ایک مصرع پر مصرع لگا کر اُنکے پایۂ اعتبار کا اعتراف ایسے لطیف پیرائے میں کیا ہے جو قابل داد ہے ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ ——— آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور لکھنؤ کی سرزمین کا تو خاصہ تھا کہ جس چیز کی طرف توجہ کی اُسکو آسمان تک پہونچا دیا۔ مرثیہ گوئی کی تو ایک نئی دنیا آباد کر دی ۲ غرض اس پُر زور شاعری کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرائے لکھنؤ نے گوناگون جواہر افکار کا بڑا خزانہ جمع کر دیا اور دنیا کی آنکھیں کھولدیں کہ دیکھو شاعری اِسکو کہتے ہیں

زمینِ شعر را از فکر عالی آسماں کردہ ——— خدا رحمت کند ایں شاعرانِ نکتہ پرور را

---

۱ اسوقت سوسائٹی کا مذاق یہ تھا کہ اس رنگ کے خلاف کوئی شعر کہتا تو اُس شاعری کو لوگ حقیر سمجھتے تھے اور محض بول چال میں شاعری کیجاتی جس میں صرف زبان کی چلت پھرت ہوتی تو اُس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی تھی۔
۲ قبل ازیں بہت سے شاعروں نے مرثیہ گوئی کی تھی مگر انیس و دبیر کی شاعری کا زور اُن لوگوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوا۔ اسکی وجہ ظاہر ہے کہ ناسخ کے دَور نے ہر صنفِ شاعری میں ایک نئی روح پھونکدی تھی۔

اس طبقے میں حضرت امیر ممتاز نظر آتے ہیں کیونکہ علاوہ سرمایۂ علمی قادر الکلامی اور سیر گوئی کے قدرت نے
ان میں ایسی جامعیت ودیعت کی تھی کہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں قوت کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ کوئی شاعر
غزل گو تھا کوئی قصیدہ گو۔ کوئی مسدس و مثنوی گو۔ کوئی تاریخ گو۔ اور امیر ہمہ گو تھے۔

دوسری جامعیت امیر میں تغزل کے متعلق خاص تھی یعنی امیر کے تغزل میں ناسخ و امیر کی بلند خیالی۔
آتش کی گرم بیانی۔ درد و سوز کا سوز گداز۔ مصحفی و میر کے نشتر۔ سودا کا خنجر سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ اور یکجا
نظر آتا ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حقیقت یہ ہے کہ امیر نے اس کثرت سے معنی آفرینی کی ہے کہ تعیین دشوار ہو گیا ہے۔ دو چار ہوتی
کہیں ہوتے ہیں تو ان پر ہر ایک کی نگاہ پڑتی ہے مگر جہاں انمول موتیوں کا خزانہ ہو وہاں نظر کیا کام
کر سکتی ہے بلا شبہ یہ وہی صورت ہے جو کثرتِ ظہور کی نسبت حضرت امیر نے خود ایک جگہ کہا ہے

نیرنگ انکی شانِ تجلی کے دیکھئے　　　اتنے عیاں ہوئے کہ نظر سے نہاں ہوئے

امیر کے دو دیوان عاشقانہ ہیں ایک دیوان نعتیہ ہے۔ قصاید ہیں۔ واسوختوں کا مجموعہ ہے
مسدسات نعتیہ و مدحیہ ہیں مثنویاں ہیں۔ قطعات ہیں۔ تاریخیں ہیں ان سب کو یکے بعد دیگرے انشاء اللہ
ناظرین کے ملاحظہ سے گزرانونگا تاکہ امیر کی جامعیت کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ ہر صنف میں یکساں قوت کے ساتھ
شعر کہتے تھے اس کا اندازہ ہو جائے۔ اسکے بعد امیر اللغات ہے مکتوبات ہیں اور دو چار کتابیں نثر کی بھی ہیں
انکے نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

غزلیات کا پہلا دیوان جسکو امیر کے افکار رنگین کا چمن کہنا چاہئے اور جس میں رنگا رنگ اچھوتے پھول بکثرت
ہیں مراۃ الغیب ہے۔ اس دیوان سے اشعار کا انتخاب کرنا کچھ آسان نہیں ہے کسکو چھوڑا جائے کس کو لیا جائے اور یہ
ممکن نہیں کہ سب منتخب اشعار ان اوراق میں لے لئے جائیں اتنی گنجائش کہاں ہے

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار　　　گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

تاہم جتنے شعر لئے گئے ہیں وہ کافی سے زیادہ ہیں۔ ملاحظہ ہوں

مرآۃ الغیب

کچھ غم نہین جو پیش ہے دفتر قصور کا
عنوانِ نامہ نام ہے ربِّ غفور کا

غفور کے لفظ نے شعر کو کسقدر بلیغ کر دیا ہے یعنے داورِ محشر جب نامۂ عصیان کے عنوان مین لفظ غفور دیکھیگا جسکے معنے بخشنے والے کے ہین تو اُسکو بخشتے ہی بنیگی۔

زاہد لحاظ رکھ کہ نہ گُل ہو چراغِ زہد
جھونکا نہ آنے پائے ہوائے غرور کا

مرغِ عصیان اُڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہو گیا
دنگ شاہینِ ترازوے عدالت ہو گیا

شاہینِ عدالت تو یہ چاہتا تھا کہ مرغ عصیاں کی گرفت کرے لیکن بازِ رحمت نے پہلے ہی شکار کر لیا اور شاہینِ عدالت حیران رہگیا۔ حاصل یہ کہ رحمت سے گناہ عفو ہو گئے پرسش کی نوبت ہی نہ آئی۔

تشنگی مین کوثر و تسنیم کے چشمے پہ ہم
اسطرح پہنچے کہ رضوان غرقِ حیرت ہو گیا

نہ چھوڑا تار کوئی دستِ وحشت نے گریباں کا
دیا ہر چند میں نے واسطہ یوسف کے داماں کا

جوابِ روضۂ رضواں ہی تختہ کوئے جاناں کا
قضا چھڑکا کرتی پھرتی ہی خون شہیدوں کا

مرے ہی سامنے دامن اُٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا

مضمون بہت بُرا تھا اُس کو بول چال کے پیرائے مین اِس لطف سے ادا کر دیا ہے کہ کرامت معلوم ہوتی ہے۔

جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوکِ قاتل
کہ دو پیاسو مین ہے یہ ایک قطرہ آبِ پیکاں کا

نشتر

کہاں ساماں تھا وحشت میں کہ میں نامہ یار کو لکھتا ۔۔۔ دیا قاصد کو پرزہ پھاڑ کر میں نے گریباں کا

یہ ایسا پرزہ دیا ہے جس سے بے سامانی اور خستگی کی کیفیت بے لکھے حالی ہوجائے

امیر آئینگے کیا کیا شمع ور اتوں کو چھپ چھپ کر ۔۔۔ نیا انداز ہوگا میرے مدفن پر چراغاں کا

مصاحبانہ رنگ

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا ۔۔۔ بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

خلعت پہن کے آئینگی تھی گھر میں آرزو ۔۔۔ یہ حوصلہ بھی گور و کفن سے نکل گیا

عاشقانہ

تشبیہ نادر

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش ۔۔۔ مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

سارا جہاں نام کے پیچھے تباہ ہے ۔۔۔ انسان کیا عقیق یمن سے نکل گیا

چونکہ عقیق کے نگ پر اکثر نام کندہ کیا جاتا ہے ۔ لہذا یمن سے نکلنا دلیل ہے کہ اس کو بھی نام کی ہوس نے گھر سے نکالا ہے ۔

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل ۔۔۔ کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کئی مرثیوں کا مضمون ہے

نادر مضمون ہے

شاعری کا یہ زور ہے

وعدہ نہیں ہے حشر کے دن کس سے دید کا ۔۔۔ حصہ ابھی سے بانٹ رہے ہیں وہ عید کا

اللہ رے انقلاب جہانِ پلید کا ۔۔۔ خونِ حسین غازہ ہے روئے یزید کا

قاتل کے کان تک نہیں پہنچی ابھی فغاں ۔۔۔ کیوں تیغ نے گلے کو دیا خطِ رسید کا

ہوتے ہیں تر پسینے سے آغوش میں حسین ۔۔۔ پھولوں سے مجھکو ڈھب ہے عرق کی کشید کا

کیونکر کہوں نہیں طرفِ قربِ حق امیر ۔۔۔ پھندا مرے گلے میں ہے حبل الورید کا

اہلِ محشر یہ ہے احساں تیرے دیوانے کا ۔۔۔ سر کو ٹکرا کے درِ باغِ ارم توڑ دیا ۔

صفحۂ دہر پہ صورت گرِ قدرت نے امیر　　اُسکی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا

پچھتا رہے ہیں خون مرا کرکے آپ کیوں　　اب اس پہ خاک ڈالئے جو کچھ ہوا ہوا
زائل ہوئی نہ بھیس بدلنے سے بوئے عشق　　تصویر میں بھی رنگ ہے رخ سے اڑا ہوا
ہے دل کا سرد مہریِ معشوق سے یہ حال　　جیسے درخت برف سے کوئی جلا ہوا

مٹائے دیدہ و دل دونوں میرے اشکِ خونیں نے　　عجب یہ طفل ابتر تھا نہ گھر رکھا نہ در رکھا
نہ کی کس نے سفارش میری وقتِ قتل قاتل سے　　کماں نے ہاتھ جوڑے تیغ نے قدموں پہ سر رکھا
برابر آئینے کے بھی نہ سمجھے قدر وہ دل کی　　اسے زیرِ قدم رکھا اُسے پیشِ نظر رکھا

جلانا چاہتی ہے جب کسی سرسبز گلشن کا　　تو بجلی طوف کر لیتی ہے پہلے میرے خرمن کا
نہ پوچھو دیکھنے کا حال ہم نے کچھ نہیں دیکھا　　کیا نرگس کی آنکھوں سے تماشا سارے گلشن کا
نرگس بظاہر آنکھیں کھولے ہوئے ہے مگر اس کو کچھ نظر نہیں آتا۔
بہار آئی ہے اے دستِ جنوں یا عید آئی ہے　　گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا
نہ گل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں رو دیتے　　تمہیں کو بلبلو آتا نہیں انداز شیون کا
ہلال و بدر دونوں میں امیر اُسکی تجلی ہے　　یہ خاکہ ہے جوانی کا وہ نقشہ ہے لڑکپن کا

غبار اُس کے لبِ بام تک بلند ہوا　　ہوائے تند کا جھونکا مجھے کمند ہوا
میرے غبار کو ہوا نے بامِ یار تک پہونچایا گویا اس نے کمند کا کام کیا۔

جدت

جہاں کسی کا دُکھا دل میں درد مند ہوا | جلائیں آگ پہ نالاں اگر سپند ہوا
لکھا تھا خط میں جو حال اپنی چشم حیراں کا | ہزار بند لفافہ کیا نہ بند ہوا
امیرؔ پائے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے | کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیا بلند ہوا

رفعت و جدت

تڑپنے میں دکھا جاتی ہے کچھ انداز بسمل کا | مگر کھایا ہے جوہر کا برق نے بھی تیغ قاتل کا

عجیب قیدی ہیں — عجیب بات ہے

لگا خنجر جو سینے پر ہوئے کیا کیا رہا قیدی | ہزاروں حسرتیں نکلیں جو دروازہ کھلا دل کا
تھکیں اک ذرا دم لینے دو پھر اٹھ کے چل لینا | ابھی تو میں تھکا ماندہ چلا آتا ہوں منزل کا

مضمون کی ندرت کو کشاکش نے اور بڑھا دیا

نئی معراج پائی ہے غبارِ گورِ مجنوں نے | بگولا جو اٹھا قبہ بنا لیلی کے محمل کا
امیرؔ اتنا ہوا ثابت کشاکش سے تنفس کی | مسافر کو لئے جاتا ہے کھینچے شوق منزل کا

چشم بد دور

ہو گیا بند درِ میکدہ کیا قہر ہوا | بابِ توبہ کی طرح اسکو کھلا رہنا تھا
چشمِ نرگس نہ ملی دیدۂ آہو نہ ملا | اے حیا تجھکو نہیں آنکھوں میں کیا رہنا تھا
تھا اگر فتنۂ محشر کو دوبالا ہونا | قامتِ یار کے سائے میں پڑا رہنا تھا

پوچھ لے قاتل زبانِ تیغ سے سب سرگذشت | کشتے کس منہ سے بتائیں کیا ہوا کیونکر ہوا
دل اگر ہے صاف کچھ مشکل نہیں دیدارِ یار | دیکھ لو آئینہ صورت آشنا کیونکر ہوا

صیادی کا رنگ

زخمِ دل ہمکو پتا دیتے ہیں تیرے تیر کا | دام ہے نقشِ قدم بھاگے ہوئے نخچیر کا

کوئی شکار زخمی ہو کر بھاگ جائے تو اُس کا نقشِ قدم اُس کی گرفتاری کا باعث

ہوتا ہے اسی طرح زخمِ دل سے چھپے ہوئے قاتل کا نشان ملجاتا ہے ۔

ظالموں میں بھی ہوا ماتم ترے نخچیر کا — روتی ہے منہ پر کماں رکھ رکھ کے پلہ تیر کا

آئینہ سکتے میں آجاتا ہے مجھکو دیکھ کر — منہ تکا کرتی ہے حیرانی مری تصویر کا

طوقِ مجنوں کی گرانی کیا اٹھا ہوں پر ہے یہ — ایک حلقہ ہے مری اتری ہوئی زنجیر کا

کیا حقیقت دو جہاں کی وسعتِ دل کے حضور — لامکاں اک مختصر گوشہ ہے اس تعمیر کا

گرم بازارِ تجلی تیری باتوں سے ہوا — لو ہے شمعِ طور کی شعلہ تری تقریر کا

گرد باد آسا ازل سے ہوں میں وحشی امیر — خاکِ غربت سے بنا خاکہ مری تصویر کا

جوہر کی طرح تیغ سے جب دل لپٹ گیا — میرے گلے سے دوڑ کے قاتل لپٹ گیا

پروائے ننگ و عار نہ کر عشق میں امیر — پروانہ شمع سے سرِ محفل لپٹ گیا

صاف کہتے ہو مگر کچھ نہیں کھلتا کہنا — بات کہنا بھی تمہارا ہے معما کہنا

رو کے اس شوخ سے قاصد مرا رونا کہنا — ہنس پڑے آپ سے تو پھر حرفِ تمنا کہنا

مثلِ مکتوب نہ کہنے میں ہے کیا کیا کہنا — نہ مری طرزِ خموشی نہ کسی کا کہنا

مکتوب بے زبان ہو کر بھی سب کچھ بتا دیتا ہے اسیطرح میری خموشی دوسروں کی تقریر سے بہتر ہے ۔

پھاڑ کھاتا ہے جو غیروں کو جھپٹ کر سگِ یار — میں یہ کہتا ہوں مرے شیر ترا کیا کہنا

کیسے نادان ہیں جو اچھے کو برا کہتے ہیں — ہو برا بھی تو اسے چاہیئے اچھا کہنا

جستیِ طبع سے استاد کا ہے قول امیر — ہو زمیں سست مگر چاہیئے اچھا کہنا

ملازمت — قدمِ قاصدِ جاناں سے فخر خانہ ہوا — قدم رسول مرا سنگِ آستانہ ہوا

قدم رسول وہ پتھر ہے جس پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کا
نشان ہوا اور رسول قاصد کو بھی کہتے ہیں ۔ یعنے قاصد جاناں کے آنے سے
گھر کو یہ فخر حاصل ہوا کہ سنگ در قدم رسول ہو گیا ۔

ریاض دہر میں پوچھو نہ میری بربادی — برنگ بو ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا

تعلیم سخاوت — خدا کی راہ میں دینا ہی گھر کا بھرنا — ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا

شہ کی گلی — جنوں کا جوش گھٹا تھا کہ بوئی گل آئی — سمندِ ہوش مرا تھا کہ تازیانہ ہوا

امید جا کے نہیں اس گلی سے آنیکی — برنگِ عمر مرا نامہ بر روانہ ہوا

رفعت — کس تزک سے وصل میں آیا اس رخِ پر نور کا — آگے آگے سیکڑوں اک تھا شمع طور کا

جدت — اسقدر مشتاق ہوں زاہد خدا کے نور کا — بت بھی ہوا یا کبھی میں نے تو سنگِ طور کا

کب کی آچکتی قیامت یہ مرا احسان ہے — بند ہے دم میرے نالونکی بدولت صور کا

خیر جاری کا جو ہے آخرت واعظ خیال — وقف کردو مول لیکر باغ اک انگور کا

شوخی اور انکسار — ہے غضب کا شوخ وہ بت ہو جو صحبت دو گھڑی — چٹکیاں لے لے کے زانو لال کردے حور کا

مصائب کا تنگ — قصر تن گر گیا کسی گور کن کی بن پڑی — گھر کسی کا گر پڑا گھر بن گیا مزدور کا

جدت — ہوا یہ جوشش تب ہجر دیدۂ ترکا — چراغ دیدۂ ماہی بنا مرے گھر کا

چشم تر کے جوشش سے گھر آب آب ہوگیا اور چراغ خانہ پر دیدۂ ماہی کا
گمان ہونے لگا ۔

جس غنچۂ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا — جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا
اخگر کی طرح نیست بتدریج تن ہوا — تن پیرہن تو پیرہن اپنا کفن ہوا

اخگر کا جسم خاکستر ہو کر پیرہن ہو جاتا ہے اور وہی رفتہ رفتہ اُسکا کفن بن جاتا ہے یعنے اخگر نیست ہو جاتا ہے یہی حال میرے تن کا ہوا کہ رفتہ رفتہ نیست ہو گیا۔

چھیڑا جو میں نے یار کو گرم سخن ہوا — پیدا مری زبان سے اسکا دہن ہوا
سو عکس آئنے میں پڑے اور مٹ گئے — اُس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا
مٹی نہ جام بن کے اڑائے جہاں کے ہوش — پتھر ہوا جو شیشہ تو توبہ شکن ہوا
رکھتا تھا پاک پرسش روز حساب سے — اسواسطے عطا نہ بتوں کو دہن ہوا
چھانی ہے پھاڑ پھاڑ کے اسمیں شراب ناب — کیا صرف کار خیر مرا پیرہن ہوا
تار نگاہ و تار نفس سب ہوئے تمام — تب چار گز کسی کو میسر کفن ہوا
یعقوب وار کھل گئیں آنکھیں مزار میں — یوسف کا پیرہن مرے حق میں کفن ہوا
ممنون چارہ گر نہوا میں ہزار شکر — ہر داغ تازہ مرہم داغ کہن ہوا
صیاد قید میں مجھے کیا خواہش چمن — جھاڑے جو بال و پر تو قفس بھی چمن ہوا
نعم البدل دیا مجھے اللہ نے امیر — دل ہو گیا جو خون تو رنگیں سخن ہوا
خلوت میں تھا تو شاہد معنی تھا میں امیر — خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

آنسو زمیں پہ آتے ہی تغیر ہو گیا — یہ طفل بے جواں ہوئے پیر ہو گیا
پہلے تو ایک صفحۂ سادہ تھا آئنہ — دیکھا جو اُس نگار نے تصویر ہو گیا

زور بیان

دل مرا کشتہ ہے یا رب کس شہادت گاہ کا — ہر شگاف زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا
پائے استغنا سے تم ٹھوکر لگاؤ گے ہزار — سر نہ سجدے سے اٹھیگا بندۂ درگاہ کا
عرصۂ محشر سے واعظ کیا ڈراتا ہے مجھے — وہ بھی اک میدان ہے میری شہادت گاہ کا

گلہ زباں پہ نہ لانا تھا بے وفائی کا — امیر ڈوب گیا نام آشنائی کا
دکھا دو جلوہ جو دعویٰ ہے خودنمائی کا — مجھے یقین نہیں آتا کسی سنائی کا

عاشقانہ

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا — مزہ میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا
میں طول روز قیامت کو سنکے ڈرتا ہوں — کہ دن نہ ہو وہ کہیں یار کی جدائی کا
ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے سارے جھگڑوں کا — زبان تیغ سے پیغام دو صفائی کا
ہزار بار قیامت جہاں میں آئی گئی — چڑھا ہے چار گھڑی دن ابھی جدائی کا

عاشقانہ

کسی گنہ پہ کوئی قتل ہو میں کہتا ہوں — کہ اس سے جرم ہوا ہوگا آشنائی کا
بہار آئی ہے پھر خیر ہو خداوندا — جنوں کے ہاتھ میں دامن ہے پارسائی کا

جدت

اٹھا جو درد تو گھبرا کے میرے دل نے کہا — کہ تو بھی داغ مجھے دے گا کیا جدائی کا

نادر شعر

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو — کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا
یہ جوش حسن سے تنگ آئی ہے قبا انکی — کہ بند بند ہے خواہاں گرہ کشائی کا

تشبیہ نادر الوجود ہے

نہیں ہے مہر لفافے پہ خط کے اے قاصد — یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا
بدن میں روح کو آنے سے کام کیا تھا امیر — چلن دکھانے کو آئی تھی بے وفائی کا
گذر نہیں ہے حرم میں تو دیر کو چلئے — امیر کام کہیں بند ہے خدائی کا

دل میں جب بیٹھا خیالِ زلفِ جاناں ہو گیا　　آنکھ میں خوابِ پریشاں سنبلستاں ہو گیا
دل کسی کا ہاتھ میں لانا ہی دولت کی دلیل　　یہ نگینہ جسکو ہاتھ آیا سلیماں ہو گیا
گل ہوا غنچہ تو اُس سے یہ صدا آئی امیر　　جمع پھر ہوتا نہیں جب دل پریشاں ہو گیا
نامۂ اعمال ہے جب تک نہیں ملتا امیر　　میرے ہاتھ آیا یہ اور میرا گریباں ہو گیا

بے نشانی کا ہیں اے چرخ سزاوار نہ تھا　　دہن یار نہ تھا کچھ کمرِ یار نہ تھا
فتنہ تھا قہر تھا جلوہ ترا اے یار نہ تھا　　جب تلک دل کو سنبھالو نہیں ازار نہ تھا
جب کہا اُس سے شبِ غم کوئی غمخوار نہ تھا　　در سے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا
کیا بلا تھی نگہِ ہوش ربا ساقی کی　　اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا
جوشِ وحشت سے یہ کہتے ہیں کہ آئی ہی بہار　　ہاتھ ڈالا تو گریباں میں کوئی تار نہ تھا
پاس رکھ لی مری قاتل نے گنہگار ہیں ہم　　اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

بندہ نواز یوں یہ خدائے کریم تھا　　کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا
کیوں تیغِ ناز بھول گئی مجھکو وقتِ قتل　　میں بھی تو اک نیاز گذارِ قدیم تھا
مانگا جو میرے دل کو درِ گوشِ یار نے　　دیتے ہی بن پڑی کہ سوالِ درِ یتیم تھا
ہم سے جو وہ کھچا یہ گلے سے لپٹ گیا　　قاتل سے بڑھکے خنجرِ قاتل کریم تھا
کیا کیا نہ آفتوں کے رہی ہمکو سامنے　　یا رب شباب تھا کہ بلائے عظیم تھا
پہنچے تو ہم بھی جلوہ گہِ یار میں مگر　　دو اک قدم بڑھا ہوا اپنے کلیم تھا
کچھ انکو زیبِ گوش کی حاجت نہ تھی مگر　　منظور پرورش تھی کہ گوہر یتیم تھا

سامانِ عذر کیا میں کہوں مختصر یہ ہے — بندہ گناہگار تھا خالق کریم تھا
اسکو کہاں دماغ تجلی تھا طور پر — سارا ظہورِ جلوۂ شوقِ کلیم تھا
قاتل کے خط سے قتل کا ہوتا نہ کیوں یقین — عنوان نامہ آیۂ ذبحِ عظیم تھا

ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا — آنکھ میں آنسو جگر میں داغ دل میں غم ہوا
میں ترا ممنون ہوں اے گریۂ بے اختیار — جب پڑی مجھ پر مصیبت تو شریکِ غم ہوا
چارہ گر کو لاے ہیں احباب درماں کیلیے — دوسرا زخمِ جگر بھی قابلِ مرہم ہوا
مار ڈالا روز اول کی نگاہِ لطف نے — ایک دم کا عیش ظالم عمر بھر کا غم ہوا
رات بھر رویا کیا ہے یار میں گلزار میں — صبح کو پھولوں سے رخصت صورتِ شبنم ہوا
لذتِ شرمِ گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب — یہ مزا چکھنے کو پیدا خلق میں آدم ہوا
میرے زخموں کی ہنسی پر تمکو رونا آگیا — یہ خوشی بھی کچھ خوشی تھی جسکا ایسا غم ہوا
تنگ آکر جب دعا فرقت میں مانگی موت کی — حسرتیں بگڑیں مزاجِ آرزو برہم ہوا

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا — ہم آج پیر ہوے کیا کبھی شباب نہ تھا
کہا جو میں نے کہ یوسف کو یہ حجاب نہ تھا — تو ہنس کے بولے وہ منہ قابلِ نقاب نہ تھا
لحاظ ہم سے نہ قاتل کا ہو سکا دمِ قتل — سنبھل سنبھل کے تڑپتے وہ اضطراب نہ تھا
فلک نے افسرِ خورشید سر پہ کیوں رکھا — سبو ہے بادہ نہ تھا ساغرِ شراب نہ تھا
ہزار بار گلا رکھ دیا تہِ شمشیر — میں کیا کروں تری قسمت ہی میں ثواب نہ تھا
سوالِ وصل کیا یا سوالِ قتل کیا — وہاں نہیں کے سوا دوسرا جواب نہ تھا

لپٹ کے چوم لیا منہ مٹا دیا اُنکا　　　نہیں کا اُن کی سوا اسکے کچھ جواب نہ تھا
کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا　　　ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا
مرے جنازے پہ اب آتے شرم آتی ہے　　　حلال کرنے کو بیٹھے تھے جب حجاب نہ تھا
وہ بیٹھے بیٹھے جو دے بیٹھے قتلِ عام کا حکم　　　ہنسی تھی ان کی کسی پر کوئی عتاب نہ تھا
جو لاش بھیجی تھی قاصد کی بھیجتے خط بھی　　　رسید وہ تو مرے خط کی تھی جواب نہ تھا

نئی رسید ہے۔ اس غزل کا ہر شعر زبان کا نشتر ہے۔

اے جرس تو تو نہیں قافلے والوں سے جدا　　　تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا
بولتا کب ہے وہ سفاک پکارو نہیں ہزار　　　کاش خنجر ہی کہے اپنی زباں سے آیا
دیکھکر اُس رخ و گیسو کو میں حیراں ہوں امیر　　　شب تاریک میں خورشید کہاں سے آیا

عشقیہ نشتر

ضبطِ گریہ میں نہیں کرتا کہ رہتا ہے خیال　　　سوکھ کر کانٹا نہالِ آرزو ہو جائے گا
ہے اُبل پڑنے کا ڈر کیا دوں ترے قد سے مثال　　　سرو فوارہ کنارِ آبِ جو ہو جائے گا

نیا مضمون ہے

عجیب شعر ہے

اگر سرو کو تیرے قد سے مثال دوں تو وہ اپنی کم ظرفی سے مارے خوشی کے فوارے کی طرح اُبل پڑے۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر　　　جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

عجیب خنجر۔ عجیب آستیں

یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے۔ سنا گیا کہ مسٹر سید محمود مرحوم نے جب وہ ہائیکورٹ الہ آباد کے جج تھے اپنے ایک فیصلہ قتل میں امیر کے اس شعر کو بڑی دھوم دھام سے لکھا تھا واللہ اعلم۔

جو اُٹھے میں تو مجھے ایسا چمن میں گھبرا کر جو اُٹھا
سیاہ مستی میں میں یہ سمجھا جہاز آتش کا
سفر مبارک ہو آخرت کا بخیر انجام ہو خدایا
جو گھر سے نکلے مرا جنازہ تو سامنا ہو کسی حسین کا

شوق سے کہیں مرے صیاد فرشتے رات دن
ایک رحمت اسکی ہی اس ساری دفتر کا جواب
اُس نے نہ دیا بھیجا جو مجکو ڈاک پر ڈاکا پڑا
یار کیا کرتا نہ تھا میرے مقدر کا جواب

مقتل سے وہ پھر تو قضا نے کیا یہ عرض
حاضر ہوا حضور میں یہ جاں نثار کب
کشمیر میں ایک ایک سے ہم پوچھتے پھرے
آخر تمام ہوگا غم انتظار کب

دیکھکر ربط گل و خار یہ امید ہوی
شاید آجائے مرے ہاتھ میں بھی دامن دوست
ملک الموت سے کہدو کہ نہ تکلیف کریں
مر گئے آسان ہے مگر کون سنے شیوں دوست

ایک ہے میرے حضر اور سفر کی صورت
گھر میں ہوں گھر سے نکل کر بھی نظر کی صورت
خشک سیر و تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت
ہوش اُڑتے تھے تو اڑ رہے تھے خبر وصل سے آج
نیند کیوں اڑ گئی آنکھوں سے خبر کی صورت
اس نزاکت پہ نہیں سوجان سے صدقے قاتل
ہاتھ میں تیغ لچکتی ہے کمر کی صورت
شہپر شوق ہی کافی ہے کبوتر کیسا
اڑ کے نامہ مرا پہنچیگا خبر کی صورت

بات کرنے میں تو جاتی ہی ملاقات رات کی
کیا بڑی بات ہے رہ جاؤ یہیں رات کی

زاہد اس زلف میں پھنس جائے تو اتنا پوچھوں کہیے کس طرح کٹی قبلۂ حاجات کی رات

کیا زمیں پکڑی ہے ظالم نے میانِ کوئے دوست
پھٹ پڑے دشمن پہ یارب آسمان کوئے دوست
جب قدم رکھا زمیں پر آسماں پر جا پڑا
بارہا ہم نے کیا ہے امتحانِ کوئے دوست

گلگشت کر رہا ہے جو وہ گلعذار آج پھرتی ہے باغ باغ نسیم بہار آج
جاگا ہوں عمر بھر کا ذرا اب تو سو رہوں کہدو رہے خموش چراغ مزار آج
کل تک سواری آئے یقیں ہے بہار کی نکلا ہے پیش خیمۂ ابر بہار آج

یہ انتظار ہے ساحل پہ کس کے آنے کا سر حباب ہے اونچا بلند گردنِ موج
ہمارے رونے پہ آتی نہیں کسے رقت حباب روتے ہیں آنکھوں پہ رکھکے دامنِ موج

آزماؤ دل کو صاحب آزمانے کی طرح کروٹیں تم تو بدلتے ہو زمانے کی طرح
دیدہ و دل میں مرے رکھا ہے کیا اے تخم اشک رنگ پیدا کر زمیں میں جاکے دانے کیطرح
چشمِ فتاں اُنسے کہتی ہے اگر ارشاد ہو ہم بھی کچھ نیرنگ دکھلائیں زمانے کی طرح
ایک بار اے برق تکلیف اور کر جھگڑا مٹے پھونک دے مجکو بھی میرے آشیانے کی طرح
کتنے بیدرد اس زمانے کے اطبا ہیں امیر حال بیماروں کا سنتے ہیں فسانے کی طرح

تعجب

پیرِ مغاں کی بزم ہیں بخت سیہ کہاں — جنت میں جیسے شام نہیں ہی سوائے صبح
بے جا ہے دخلِ غیر شبِ وصل اے امیر — دروازے بند کیجیے آنے نہ پائے صبح

حقیقت

شکر ہے کچھ تو محبت کا ہوا رنگ اثر — تین دن اُسنے لگائی نہ حنا میرے بعد
زینتِ محفلِ اربابِ سخن تھا میں امیر — نہ رہی رونقِ بزمِ شعرا میرے بعد

جدت

ہجر میں مجھ تک جو آتی ہے تو گھبراتی ہے نیند
تاک کر پلکوں کے پر آنکھوں سے اڑجاتی ہی نیند
جاگنے میں جو فرشتوں کو نہیں آتا نظر
وہ تماشا خواب میں انساں کو دکھلاتی ہی نیند

سبحان اللہ

خنجرِ قاتل نہ کر اتنا روانی پر گھمنڈ — سخت کم ظرفی ہی اک دو بوند پانی پر گھمنڈ
دیکھ او ناداں کہ پیری کا زمانہ ہی قریب — کیا لڑکپن ہی کہ کرتا ہے جوانی پر گھمنڈ
دیکھنے والوں کی آنکھیں آپنے دیکھیں نہیں — حق بجانب ہی اگر ہے لن ترانی پر گھمنڈ

نئی اشرفی ہے

اگر رخصت ہی ہی مد نظر اتنا ٹھہر جاؤ — کہ اپنے داغِ دل کی اشرفی باندھ دوں میں بازو

یہی سوزِ دل ہے تو محشر میں جل کر — جہنم اُگل دے گا مجھکو نگل کر
یہ کہتی ہے وہ زلفِ عمرِ خضر سے — کہ مجھ سے کہاں جائیگی تو نکل کر

پڑا تیر دل پر جو منہ تو نے پھیرا — نشانہ اڑایا ہے کیا رُخ بدل کر
چھپا کب بہت خاک ظالم نے ڈالی — شفق بن گیا خون میرا اچھل کر
حضور اُنکے باتیں جو کیں ڈرتے ڈرتے — کھڑا ہو رہا دور مطلب نکل کر
جو شام شب ہجر دیکھی تو سمجھے — قضا سر پہ آئی ہے صورت بدل کر
نکالا جو پیر مغاں نے تو غم کیا — بُلا لیگی پھر دختر رز مچل کر
مرے آنسوؤں نے مجھے بخشوایا — بُرے کام آئے یہ لڑکے مچل کر
امیر آسماں بھی کھلاڑی ہے شاطر — دکھاتا ہے کیا کیا یہ نقشے بدل کر

داغ الفت مرے دل میں کوئی چھپ سکتا ہے
شمع فانوس کا اک نور ہے اندر باہر
ہوں وہ دیوانہ جو رکھتا ہوں نہیں زنداں میں قدم
غل یہ زنجیر مچاتی ہے کہ باہر باہر
روح سے قدر ہے اس پیکر خاکی کی امیر
کیا حقیقت ہے صدف کی جو ہو گوہر باہر

قید خانی کیطرح وادی وحشت میں ہوں قید — ہو گئی مجکو مری آبلہ پائی زنجیر
اپنے دیوانی کے مدفن پہ وہ آئی جو امیر — جائے گل سایۂ گیسو سے چڑھائی زنجیر

تیغ قاتل کی نہیں چلتی کبھی مجھ زار پر — وائے بے رحمی کہ پانی بند ہے بیمار پر

سوز و گداز — کیا پردہ داری ہے — نئی تشبیہ ہے — خوب تشبیہ

کہ گئی گل کر کے میری شمعِ بالیں کو صبا
کوئی او ناداں روتا ہے سرِ بیمار پر

بے نقاب آؤ چمن میں تم تو ہے برگِ حنا
ہاتھ رکھ دے بڑھ کے چشمِ نرگسِ بیمار پر

سمجھے ہم پہونچی جو ابرو تک پلک اس آنکھ کی
بارہا دیکھی رکھ کے انگلی ترک نے تلوار پر

ہے بلند و پست کی کب تیغِ قاتل کو تمیز
سیل کی ہے چال یکساں راہِ ناہموار پر

سبحان اللہ

نیتِ بد ہے تو کارِ نیک سے حاصل ہے کیا
جاگتے ہیں دزد بھی مثلِ نگہباں رات بھر

نازک خیالی

زار ایسا میں ہوا بادیہ پیما ہو کر
ذرہ جانے ہے تو ٹھکا دی مجھے صحرا ہو کر

سرو و گل سے تمہیں تشبیہ میں کب دیتا ہوں
لال آنکھیں نہ کرو آگ بگولا ہو کر

لیجئے مال امیروں سے فقیروں کیلئے
لوٹیے دولتِ دیں طالبِ دنیا ہو کر

بے دہن بنتے ہو تا قسم سے جلانا نہ پڑے
خوب دم دیتے ہو مردوں کو مسیحا ہو کر

نہ محبت نہ تلطف نہ عنایت نہ وفا
تمہیں کہدو کہ رہے پھر کوئی کس کا ہو کر

تشبیہ نازک — بلیغ — ندرت

وہ ناتواں ہوں جو لیٹا کبھی میں بستر پر
گماں ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے چادر پر

وہ مست جب کبھی گذرا ہے میکدے کی طرف
بہک کے دستِ سبو جا پڑا ہے ساغر پر

بہ رنگِ سایہ رہا پائمال ساری عمر
میں جسکے پاؤں پڑا پاؤں رکھ دیا سر پر

ازل سے طبعِ ملاحت پسند رکھتا ہوں
چھڑک لیا تھا نمک میں نے شیرِ مادر پر

دیکھئے اس تشبیہ کو

صفِ مژہ کو بھی ہے تاک چشمِ ساقی کی
گرے ہیں سیکڑوں میخوار ایک ساغر پر

سبحان اللہ

چلا ہے نامہ مرا لیکے نامہ بر یا رب
ترے حبیب کا سایہ مرے پیمبر پر

کچھ اسمیں شان نکلتی ہے تیری مژگانکی — نثار سو رگِ جاں ایک نوک نشتر پر

سُنا کسی سے جو نامِ دوائے دردِ جگر — تڑپ کے دل نے صدا دی کہ ہائے دردِ جگر

جب نکلتے ہیں مکاں سے وہ بدلکر کپڑے — چاک ہو جاتے ہیں رستے میں گریباں دو چار
امتحاں مردم دنیا کا کیا ہم نے امیرؔ — دیو خصلت جو ہزاروں ہیں تو انساں دو چار

تمہیں کو جانا تمہیں کو سمجھے تمام عالم سے تنگ ہو کر
دوئی کا وحدت میں دخل کیسا رہے ہمیشہ اکنگ ہو کر
ٹھہر گیا ہے ہمارے دل میں ہزار منت سے دردِ الفت
مگر یہ ڈر ہے کہ اٹھ نہ جائے مکاں کی تنگی سے تنگ ہو کر
نہاں تھا آنا کہ ہو نہ ظاہر عیاں تھا جانا کہ سب ہوں ماہر
وہ دل میں آئے اُمنگ ہو کر گئے تو چہرے کا رنگ ہو کر
ہوئے تھے ہندو بچوں کے عاشق شہید ہونے کی کیا خبر تھی
نہ جانتے تھے لہو ہمارا اُڑے گا ہولی کا رنگ ہو کر

نہ کور باطن ہوا ہے برہمن ذرا تو چشم تمیز وا کر
خدا کا بندہ بتوں کا سجدہ خدا خدا کر خدا خدا کر
قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش
کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر

تشبیہ مضمون ہے — شبیہ مدِ نظر ہے کسکی کہ کوئی پوری نہیں اُترتی
مٹا دیئے صانع ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

انسان کا پیدا ہونا اور مر جانا کیا ہے گویا صانع ازل صورتیں بناتا ہے اور مٹا دیتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسکی شبیہ وہ بنانا چاہتا ہے حسب دلخواہ نہیں بنتی - اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ صانعِ ازل کا اس میں عجز پایا جاتا ہے اور یہ جائز نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ صانعِ ازل اپنی ہی شبیہ بنانا چاہتا ہے جو پوری نہیں اترتی -

---

سبحان اللہ

بلبل سے کہو آئے وہ پروانے کے بدلے — گل کر گئی محفل میں نسیمِ سحری شمع

تصویر کھینچ دی ہے

آئی جو کھل کے زلفِ سیاہ سر سے پاؤں تک — لینے لگی بلائیں ادا سر سے پاؤں تک

جدت

لاغر ہوں اسقدر کہ مجھے پہچانتی نہیں — رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک

سبحان اللہ

اچھی کسی کی آنکھ کسی کی نگاہ ہے — یکتا ہیں آپ نام خدا سر سے پاؤں تک

بجا ہیں بلبل و گلچیں خراب خندۂ گل — دو آشتہ ہے چمن میں شراب خندۂ گل
محال ہے کہ چڑھے عشق حسن کے منہ پر — کہاں ہے نالۂ بلبل جواب خندۂ گل

نزاکت فکر

ہوں زار اسقدر کہ تری جلوہ گاہ میں — چھپ جاؤں گا میں پردۂ گردِ نگاہ میں
ہیں شوخیاں بھی جو تمہاری نگاہ میں — بجلی گرے گی چار طرف جلوہ گاہ میں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں
کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

نکلا نہیں ہے خط ترے عارض پہ حسن نے
کانٹے بچھائے ہیں یہ محبت کی راہ میں

ہم رہروانِ عشق کو محشر کا خوف کیا
پڑتے ہیں ایسے کتنے ہی میدان راہ میں

تو نے تو اے سیاہیِ شبہائے تار ہجر
دھبا لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

محراب اُسکی تیغ کو سمجھا پڑھی نماز
پہونچا میں قتل گاہ میں یا عیدگاہ میں

نشہ کے ڈورے یار کی انکھوں میں ہیں امیر
یا چند سرخ پوشں مکانِ سیاہ میں

وہ تو سنتا ہی نہیں ہیں داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں

دھوتے دھوتے آنسوؤں سے ہو گئیں آنکھیں سفید
بخت بد جاتی نہیں تیری سیاہی کیا کروں

نزع میں آنکھیں ملا کر یار نے مجھ سے کہا
اب تری آنکھوں میں دم ہے کم نگاہی کیا کروں

کل گیا تھا پیشِ زاہد سوچتا ہوں دل میں آج
خدمتِ پیرِ مغاں میں عذر خواہی کیا کروں

وہ مرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہے امیر
پیشِ خالق ادعائے بیگناہی کیا کروں

گلے میں ہاتھ تھے شب اُس پری سے راہیں تھیں
سحر ہوئی تو وہ آنکھیں نہ وہ نگاہیں تھیں

فراق میں ترے عاشق کو جا کے کل دیکھا
کہ وہ تو ہیچ تھا کچھ اشک تھے کچھ آہیں تھیں

یہ ضعف ہے کہ نکلتی نہیں ہیں اب دل سے
کبھی فلک سے بھی اونچی ہماری آہیں تھیں

نشتر

جگر میں ہجر کی شب چبھ رہی تھیں کچھ پھانسیں
مگر جو غور سے دیکھا تری نگاہیں تھیں

فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ
جہاں سبھی ہیں یہ میخانے خانقاہیں تھیں

نئی تشبیہ

مشاعرے سے حسیں کیوں نہ چھین لیجائے
رباعیاں مری جو گوشۂ کلاہیں تھیں

نشتر

واکردہ چشم دل صفت نقش پا ہوں میں — ہر رہ گذر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں
وحشت میں گو کہ قیس سے بڑھکر نہیں مگر — اتنا کہوں گا ایک تھا وہ دوسرا ہوں میں
محنت یہ کی کہ فکر کا ناخن بھی گھس گیا — عقدہ یہ آج تک نہ کھلا مجھ پہ کیا ہوں میں

بانکپن

کہتی ہے ہر پلک تری زلف دراز سے — چھوٹے سے قد پہ میرے نہ جا تا بلا ہوں میں
مانند سبزہ اس چمن دہر میں امیر — بیگانہ وار ایک کنارے پڑا ہوں میں

میں جانتا ہوں بلبل جو ہے تری حقیقت — اک مشت استخواں میں دو پر لگے ہوئے ہیں

لطف تھا وہ

بڑھتا ہے آبرو میں کیا آنسوؤں سے میرے — کون ایسے لعل تجھ میں گوہر لگے ہوئے ہیں

کیفیت تصویر

جب جبہ برو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں — کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں

تیزی بیتابی

اللہ رے میرے دل کی تڑپ اضطراب میں — گھبرا کے کروٹیں لگے لینے وہ خواب میں

مطلع آفتاب

دامن بھرا ہوا تھا جو اپنا شراب میں — محشر کے دن بٹھا گئے آفتاب میں

رکھا ہے تم نے پائے حنائی رکاب میں ۔ یا پھول بھر دیے طبق آفتاب میں
اے برق تو ذرا ابھی تڑپی ٹھہر گئی ۔ یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
ملنے کا وعدہ منہ سے تو انکے نکل گیا ۔ پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں
دل صاف ہو تو کشمکش دہر کیا کرے ۔ شعلہ ہے کب دھوئیں کی طرح پیچ و تاب میں
دامن پہ ان کے خون کی چھینٹیں پڑیں امیر ۔ بسمل سے پاس ہو نہ سکا اضطراب میں

تصور ایک بحر حسن کا ہے یوں مرے دل میں ۔ رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوش ساحل میں
رہ صحرائے ہستی کو یہ آسانی سے کاٹے گا ۔ تری تلوار کا دم آ گیا ہے تیرے بسمل میں
چھری کو تیری اے صیاد اتنک بیقراری ہے ۔ کوئی رگ رہ گئی ہے کیا گلوئے مرغ بسمل میں
یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں ۔ نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلی ہے محمل میں
دہان زخم نے کس کس مزے سے اسکو چوسا ہے ۔ لب شیریں کی لذت ہے زبان تیغ قاتل میں
ذرا محمل سے ہٹ کر خاک اڑا دی اوٹ مجنوں نے ۔ خیال اتنا تو کرنا چاہیئے ہے کون محمل میں
لگا کر وار اوچھا پھر نہ دیکھا اسطرف تم نے ۔ تمنا روتی رہی بیٹھی ہوئی پہلوئے بسمل میں

بے حجابانہ اگر وہ لب آب آتے ہیں ۔ شوق دیدار میں آنکھوں سے حباب آتے ہیں
اشک آنکھوں میں مری گرم شتاب آتے ہیں ۔ شہسواران عدم پا بہ رکاب آتے ہیں
بے خبر دیکھ کے مردوں کو یہ کہتی ہے زمیں ۔ جو یہاں آتے ہیں مست مے خواب آتے ہیں
سوزش دل سے یہ جلتی ہیں ہماری آنکھیں ۔ اشک منہ پر صفت اشک کباب آتے ہیں
کیوں نہ ہو دیدۂ تر یار کو رحم آ ہی گیا ۔ خوب چھینٹے تجھے اے خانہ خراب آتے ہیں

جوشِ وحشت مجھے ہر سال بناتا ہے جواں
جب بہار آتی ہے ایامِ شباب آتے ہیں

جرأت

باوصفِ بختِ تیرہ ہیں روشن نگاہ ہوں
سرمہ وہ ہوں کہ سرمۂ چشمِ سیاہ ہوں

حرص و ہوا کو حدِ جہاں سے نکال دوں
دو دن کو میں جہاں میں اگر بادشاہ ہوں

رہتا ہے صبح و شام گناہوں کا سامنا
فارغ جواں سے ہوں تو کبھی عذر خواہ ہوں

رفعت

خیالِ لب میں ابرِ دیدہ ہائے تر برستے ہیں
یہ بادل جب برستے ہیں لبِ کوثر برستے ہیں

خدا کے ہاتھ ہے مٹھیوں میں ہے اب آبرو اپنی
بھرے بیٹھے ہیں دیکھیں آج وہ کس پر برستے ہیں

ڈبو دینگی یہ آنکھیں بادلوں کو ایک چھینٹے میں
بھلا برسیں تو میرے سامنے کیونکر برستے ہیں

کبھی آہیں کبھی ہیں سختیِ ایام سے نالے
ہوا چلتی ہے بجلی گرتی ہے پتھر برستے ہیں

جہاں اُن ابروؤں پر میل آیا کٹ گئیں لاکھوں
یہ وہ تیغیں ہیں جنکی ابر سے خنجر برستے ہیں

وہاں ہیں سخت باتیں یاں ہیں آنسو پر آنسو ہیں
تماشہ ہے اِدھر موتی اُدھر پتھر برستے ہیں

وہ شانہ بالوں میں کیا بار بار کرتے ہیں
لباسِ زیست مرا تار تار کرتے ہیں

عروسِ مرگ پہ جو دل نثار کرتے ہیں
لپٹ کے خنجرِ قاتل کو پیار کرتے ہیں

مزے بتوں کے تو خود لوٹتے ہیں حضرتِ دل
خدا سے مفت مجھے شرمسار کرتے ہیں

نہ شاخِ گل ہے مرا دل نہ دامنِ میخوار
بہار میں اسے کیوں داغدار کرتے ہیں

ہم ہوں یا موسیٰ ہوں کوئی دیکھ سکتا ہی اسے
پردے حیرت کے پڑے ہیں جلوہ گاہِ طور میں

منزلِ مقصود کی مستوں کو دکھلاتی ہے راہ
خضر بن بیٹھی ہے سبزی دانۂ انگور میں

رات دن میں لاکھ بار اُٹھ اُٹھکے رہجاتا ہی پھر
درد شاید قید ہے میرے دل رنجور میں

کیسے موسیٰ لن ترانی کی صدا کیسی امیر
حسن کے نیرنگ تھے خلوت سرائے طور میں

ہٹاؤ آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں
تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں

جو لڑکھڑا کے گرے تو قدم پہ ساقی کے
امیر مست نہیں ہوشیار ہم بھی ہیں

چار ابرو ہیں ترے حسن میں بہتر چار دل
کیا رباعی ہے کہ مصرع ہیں برابر چاروں

اے امیر احمدِ مرسل کے جو ہیں چار وزیر
چار یاری ہوں مجھے ہیں یہ برابر چاروں

لختِ دل لیٹا ہی ناحق آہِ بے تاثیر میں
کچھ نہیں حاصل جو پیکاں ہو ہوائی تیر میں

عشق ابرو میں دلِ مجروح تڑپا اسطرح
زلزلہ آیا زمین کو خیمۂ شمشیر میں

جس پری کی آنکھ مجھ سے پھر گئی بولا جنوں
لو مبارک اور اک حلقہ بڑھا زنجیر میں

زیر ابرو شوخیاں کرتیں نہیں چشمان یار
چوکڑی بھرتے ہیں آہو سایۂ شمشیر میں

قتل مجکو یادِ ابرو میں ان آنکھوں نے کیا
ان ٹھگوں نے مل کے مارا کوچۂ شمشیر میں

کام آتی ہی جوانوں کے بہت تدبیر پیر
طاقت پرواز ہے زورِ کماں سے تیر میں

کج نہادوں سے ضرر کیا راست بازوں کو امیر
خم نہیں آتا ہے صحبت سے کماں کی تیر میں

موسیٰ کیطرح تاب تجلی کی نہ آئی
ہم طور پہ پہونچے تھے کہ پتھرا گئیں آنکھیں

ہوں لاکھ زبانیں رہے پر مشق خموشی
پلکوں سے اشارے میں یہ سمجھا گئیں آنکھیں

نیا مضمون

مجروحوں پر جو چشم کرم خوبرو کریں — سوزن ہر ایک تار نظر سے رفو کریں
دنیا سے ہاتھ دھو کے چلیں کوئے یار میں — جائز نہیں کہ طوف حرم بے وضو کریں
ملتے ہیں ہاتھ دیکھ کے صبح شب وصال — یہ چاک وہ نہیں ہے کہ جسکو رفو کریں

پورا محاورہ — سبحان اللہ

دل ٹھہر جائے یہ امید نہیں — ایسے بگڑے ہوئے کہیں سنورتے ہیں
مل گیا گھاٹ تیغ قاتل کا — اب کوئی دم میں پار اترتے ہیں

بلاغت — نشتر — نشتر

ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں — پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
یاران رفتہ سے کبھی جا ہی ملینگے ہم — آخر تو پیچھے پیچھے اسی کارواں کے ہیں
ٹھکرا کے میرے سر کو وہ کہتے ہیں ناز سے — لو لیے مفت سجدے مرے آستاں کے ہیں
ڈوبے ہوے لہو میں نظر آئیں کیوں نہ گل — سینچے ہوے مری مژہ خوں فشاں کے ہیں
خنجر کو چوس چوس کے کہتے ہیں میرے زخم — ظالم مزے بھرے ہوئے تجھ میں کہاں کے ہیں
یاں جان پر بنی ہے بجھے ہیں رکاوٹیں — اے تیغ یار چل بھی یہ غمزے کہاں کے ہیں

سبحان اللہ

کرے گا یاد اے غم ہمکو بعد مرگ تو برسوں — کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں
نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو — اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں
ہماری آنکھ سے کیا جانے کس حسرت سے دیکھا تھا — کہ تیغ یار رو دی چشم جوہر سے لہو برسوں

بے حجابانہ مرے گھر جو وہ آجاتے ہیں — ایک تصویر در دل پہ لگا جاتے ہیں

دم کے دم کو مرے پہلو میں جو آجاتے ہیں — دل لگا نیکی جگہ تیر لگا جاتے ہیں
پتلیاں تک تو پھری جاتی ہیں دیکھو دمِ نزع — وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں
کیا سخی ہیں عدم آباد کے جانے والے — نقدِ جاں پہلی ہی منزل میں لٹا جاتے ہیں
کس کے کوچے سے یہ آتے ہیں ہوا کے جھونکے — کہ مری شمعِ لحد روز بجھا جاتے ہیں (سوز و گداز)
میں خریدار اگر ہوں تو نگہ کا ان کی — تیغ کیوں میرے گلے سے وہ لگا جاتے ہیں
کیا بلا ہو کے وہ گیسو مجھے لپٹے ہیں امیر — آنکھ ہو بند تو دل پر مرے چھا جاتے ہیں

لٹک کر وہ زلف آئی ہے تا کمر — کہ لیلیٰ ہے مجنوں کی آغوش میں (تشبیہ)
نہ اٹھو ابھی بزم سے میکشو — ہمیں بھی تو آلینے دو ہوش میں

مسکن ہے دل کے راز کسی پر عیاں نہیں — شیشے کو دیکھ لو کہ دہن ہے زباں نہیں
اک حور وش کی خانۂ زنداں میں ہے جو یاد — موجیں نسیمِ خلد کی ہیں بیڑیاں نہیں
کیا باغباں کا ڈر کہ میں ہوں طائرِ اثر — جز شاخِ نالہ اور کہیں آشیاں نہیں
ایذا کا خوف صاحبِ تمکیں کو کیا امیر — نشتر سے آشنا رگِ سنگِ گراں نہیں

کس طرح موت کو آساں نہ وہ بسمل سمجھیں — تیغ کو تیغ جو قاتل کو نہ قاتل سمجھیں
یوں تو ہر غنچۂ دل شکلِ صنوبر ہے امیر — جسمیں کچھ درد کی بو آئے اسے دل سمجھیں

دامنِ رحمت اگر آیا ہمارے ہاتھ میں — پھول ہو جائینگے دوزخ کے شرارے ہاتھ میں

پوچھتے ہو کس سے جو چاہو کرو مختار ہو — دل تمہارے ہاتھ میں ہے یا ہمارے ہاتھ میں
کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول — آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں

نازک مضمون

سمجھا یہ میں جو نکلے شاخوں سے گل چمن میں
صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں

ہے چرخ پر یہ ایما ابروئے ماہِ نو کا
کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکپن میں

مضمون

آوازِ کُن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے
غربت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں

یارانِ رفتہ کا ہے غم اے امیر ناحق
چھوٹے ہوئے سفر کے مل جائینگے وطن میں

وہی رہ جاتے ہیں زبانوں پر — شعر جو انتخاب ہوتے ہیں
سبحان اللہ — آنسوؤں سے امیر ہیں سوا — ایسے لڑکے عذاب ہوتے ہیں

کچھ خار ہی نہیں مرے دامن کے یار ہیں — گردن میں طوق بھی تو لڑکپن کے یار ہیں
سبحان اللہ — کیا پوچھتے ہو مجھ سے نشاں سیل و برق کا — دونوں قدیم سے مرے خرمن کے یار ہیں
کانٹے ہیں جتنے وادیٔ غربت کے اے جنوں — سب آستیں کے جیب کے دامن کے یار ہیں

غمِ دنیا کا گذارہ مرے مسکن میں نہیں — اشکِ ماتم کی جگہ دیدۂ روزن میں نہیں

کیوں نہ خوش ہوں کہ جدا ہی یہ میسر کیسے ہے — کہ مرے دوست کی حالت دلِ دشمن میں نہیں

بزمِ میخانہ ہے کیا انجمنِ ناز و نیاز — ہاتھ کس مست کے یاں شیشے کی گردن میں نہیں

آتشِ مے سے جو اٹھتا ہے دھواں کافی ہے — کس کو پروا ہے نہ ہو ابر جو گلشن میں نہیں

قتل کرتی ہی دوبارہ ہمیں شرم انکی امیر — خمِ شمشیر ہے خم یار کی گردن میں نہیں

حسرتیں گھیرے ہیں اس کثرت سے بسمل کو ترے
روح نکلے تن سے اتنا راستا ملتا نہیں

منکرِ یکرنگیِ معشوق و عاشق ہیں جو لوگ
دیکھ لیں کیا رنگِ کاہ کہربا ملتا نہیں

موئے مژگاں سے ترے سیکڑوں مر جاتے ہیں
یہی نشتر تو رگِ جاں میں اتر جاتے ہیں

مرے مرقد کو ٹھکراتے قیامت بنکے آتے ہیں
پڑا ہوں میں یہاں آکر تو یوں مجکو ستاتے ہیں

ہماری بے خودی تمہید ہے تیری نمائش کی
مٹا کر نقش اپنا ہم ترا نقشہ جماتے ہیں

محبت کا بُرا ہو دل کو روکوں یا جگر تھاموں
مرے قابو سے یہ دونوں کے دونوں نکلے جاتے ہیں

جرأت

حسینانِ جہاں رکھتے ہیں شاید دردکا شیوہ
جگہ دیتا ہے جو دل میں اُسی کا دل دُکھاتے ہیں
امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

تسنیم ثانی

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
سیہ پوشاک بنکر خانۂ کعبہ میں جا پہونچے
بلا کا بھیس او کافر ترے گیسو بدلتے ہیں

شیفتہ

پہونچے ہم جس شہر میں پوچھا یہ اہلِ شہر سے
خوبرویوں کی یہاں بکتی ہیں تصویریں کہیں

سبحان اللہ ہمیشہ گوشہ نشیں ہوں وہ خاکسار ہوں میں
ہوا اُڑا نہ سکے جسکو وہ غبار ہوں میں
امیر گناہ سے ہے رحمتِ خدا کی نمود
گنہ اگر نہ کروں تو گناہگار ہوں میں

لے گیا لخت جگر اپنے جو میں گلزار میں — برگ گل بلبل سمجھ کر لے گئی منقار میں
حال آئینہ ہے میری جبہہ سائی کا امیر — منہ نظر آنے لگا سنگ در دلدار میں

صورت غنچہ کہاں تاب تکلم مجھ کو — منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئی جو تبسم مجھکو
قطرۂ مے نے کیا ہوش صفت گم مجھکو — ہر حباب مے پرجوش ہوا خم مجھ کو
اشک ساں جنبش مژگاں لے گیا گم مجھکو — لغزش پا ہوئی دریا کا تلاطم مجھکو
اور تھا کون شب ہجر مصیبت کا شریک — دیکھ لیتا تھا میں انجم کو تو انجم مجھکو
واہ اے بیخودی شوق کیا خوب سلوک — اس کو جب ڈھونڈنے نکلا تو کیا گم مجھکو
بے ثباتی میں نہیں کونسی جا میری نمود — ذرے چنتے ہیں مجھے گنتے ہیں انجم مجھکو
میں تو کیا عکس سے وہ آئنہ رو کہتا ہے — پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھکو
دھوکا کھائے ہوئے آدم کو زمانہ گذرا — ہنستے ہیں دیکھ کے اب تک الف گندم مجھکو
مردمک ہو نکہ سویدا ہوں الٰہی کیا ہوں — دیدہ و دل میں جگہ دیتے ہیں مردم مجھکو
میں ترا عکس تھا اس آئینۂ ہستی میں — تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجھکو
ہوں وہ میکش جو کروں رخ در توبہ کی طرف — بہکے چلتے ہو پکارے دہن خم مجھکو
تجھکو قاتل ہی کے لعل لب خنداں کی قسم — نیم جاں چھوڑ نہ اے تیغ تبسم مجھکو
صاف کہدو نہیں دیدار دکھانا ہے اگر — کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو کیوں تم مجھکو
جانتے ہیں جو حقیقت سے ہیں آگاہ امیر — کن کے کلمے پہ بھی معنا ہے تقدم مجھکو

اے خوشا وحدت خوشا کثرت خوشا نیرنگ عشق — دیکھتا ہوں ہر مرقع میں تری تصویر کو

اپنے بسمل کا ذرا شوق شہادت دیکھئے — دیر ہوتے کیا تڑپ گیا کہ دم شمشیر کو
جب نظر اُس ترک کی مجھ پر پڑی تیوری چڑھی — بل پڑے شمشیر میں سیدھا کیا جب تیر کو
ندرت — چیر کر پہلو کو دل نکلا ہے مشتاقِ نگاہ — کیا تماشہ ہے ہدف اپنے چلا ہے تیر کو

صبائے رنگ — کیونکر ہو دل شگفتہ جو عزلت نشین ہو — پھولے پھلے نہ دانہ جو زیرِ زمیں نہو
پر لگائے یہ ترے تیر ادا نے ہمکو — تھک گئی دوڑ کے پایا نہ قضا نے ہمکو
رخصت اے ہوش و خرد اب نہیں ٹھہرا جاتا — بے خودی دور سے آئی ہے بلانے ہمکو
شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گذری — آگ پانی سے بنایا ہے خدا نے ہمکو
کہتے ہیں حشر وہ رفتار سے برپا کرکے — ایسے کتنے ابھی فتنے ہیں جگانے ہمکو
وہ پرِ کاہ تھے اس گلشنِ ہستی میں امیر — دوش سے پھینک دیا بادِ صبا نے ہمکو

لٹکاؤ نہ گیسوے رسا کو — پیچھے نہ لگاؤ اس بلا کو
کانٹوں سے کہو سنبھال لینا — آتا ہے غش اک برہنہ پا کو
بلبل کو ملے جو باغبانی — روکے درِ باغ پر صبا کو

جسطرح صبح کو خورشید عیاں ہوتا ہے — آکے پیری نے دیا داغ جوانی مجھکو
نغمہ سنجانِ گلستانِ سخن ہیں جو امیر — کہتے ہیں بلبلِ گلزارِ معانی مجھکو

نیا مضمون — ہوں میں وہ میکش اٹھا ساقی میری تعظیم کو

گردنِ مینائے مے خم ہو گئی تسلیم کو

آتے ہی اُس مست کے گلزار میں آئی بہار
ابر اُٹھا تعظیم کو شاخیں جھکیں تسلیم کو

نقدِ آمرزش کا طالب ہے اگر اے خود فروش
تول میزانِ عدالت میں امید و بیم کو

آہ کی شمشیر پر تکیہ ہے نامردوں کا کام
مرد رکھتے ہیں کمر میں خنجرِ تسلیم کو

فتنہ برپا ذات سے مفسد کی ہوتا ہے ضرور
کیا ہوا اُٹھے اگر وہ غیر کی تعظیم کو

حشر کے دن نامۂ اعمال کا کیا اعتبار
سال بھر کے بعد باطل کہتے ہیں تقویم کو

چشمۂ دیدارِ جاناں کی ہیں دو نہریں امیر
جانتا ہوں خوب اصل کوثر و تسنیم کو

کلفت کا اپنی نالہ کشی میں نشاں نہ ہو
ہم سو برس جو آگ جلائیں دھواں نہ ہو

جانے اگر کہ چاہِ عدم میں گرائے گا
کوئی سوارِ توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

جدّت

میرے پہلو میں جو دیکھا خنجرِ جلاد کو — دل سے لاکھوں حسرتیں نکلیں مبارکباد کو
عید موسیٰ کو ہوئی برقِ تجلّی کی مگر — پہلے نظارے میں غش آیا مبارکباد کو

سہلِ ممتنع

پہلے تو مجھے کہا نکالو... — پھر بولے غریب ہے بلا لو
اوروں پہ امیر تکیہ کب تک — تم بھی تو کچھ آپ کو سنبھالو

تھے گور ہی تک سب مرا منہ دیکھنے والے — اب ایک بھی صورت نظر آتی نہیں مجھکو

عاشقانہ

اک پھول ہے گلاب کا آج اُنکے ہاتھ میں
دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کسی کا جگر نہو

[illegible]

آنکھیں ملی ہیں اشک بہانے کے واسطے
بیکار ہے صدف جو صدف میں گہر نہو

گھر گھر تجلّیاں ہیں طلبگار بھی تو ہو — موسیٰ سا کوئی طالب دیدار بھی تو ہو

لطافت

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے — پہلے شراب پیکے گنہگار بھی تو ہو

ندرت

پیری میں ضعف سے یہ نہیں رعشہ دار ہاتھ
ہیں دامنِ قضا کیلئے بیقرار ہاتھ

جدّت

تکلیف سائلوں کی جنوں میں نہیں پسند

دامن کو پھاڑ دوں ہیں بڑ پائیں جو خار ہاتھ

آیا تھا سوئے حشر میں تفریح کے لئے — یاں تو شروع پرسش اعمال ہو گئی
ساقی ہے دختر رز سا حسین کون خوش مزاج — کیں اور گرمیاں جو کہن سال ہو گئی

چاہنا اُس کا تو ہم کو چاہیئے — وہ ہمیں چاہے تو پھر کیا چاہیئے
دل نے جب پوچھا مجھے کیا چاہیئے — درد تو ل اٹھا پڑ بنا چاہیئے
دل مرا کہتا ہے سنکر شور حشر — یہ نمک زخموں پہ چھڑکا چاہیئے
وعدہ آنے کا ہے اسنے خواب میں — خواب کب آتا ہے دیکھا چاہیئے
امتحاں ہے دوست دشمن کا عبث — یہ تو اپنے دل سے پوچھا چاہیئے
ترک لذت بھی نہیں لذت سے کم — کچھ مزا اس کا بھی چکھنا چاہیئے
ہے مزاج اُس کا بہت نازک امیر — ضبط اظہار تمنا چاہیئے

مشکل آساں نہ ہوی تیرے گنہگار رونگی — حیف منہ موڑ گئی باڑھ بھی تلوار رونگی
اک ذرا پاؤں اٹھائے ہوئے اے توسن عمر — مدتوں سے خبر آئی نہیں کچھ یار رونگی
کھول کر بال جو آتے ہیں وہ زنداں کی طرف — کچھ بڑھا جاتے ہیں میعاد گرفتار رونگی
آئی کیسی ہی کڑی اُف نہیں کرتے عاشق — قید آواز بھی ہے اُن کے گرفتار رونگی
ہوں وہ دیوانہ گیسو کہ گریباں کے عوض — چوٹیاں ہاتھ میں رکھتا ہوں کہسار رونگی
داور حشر سے محشر میں کہیں گے میخوار — یہی ٹکڑی رہی جاتی ہے گنہگار رونگی

میں رو کے آہ کرونگا جہاں رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے
ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں۔
پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
دو روزہ زیست غنیمت ہے ذکرِ حق کر لے
پھر اختیار میں غافل زباں رہے نہ رہے
امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

مذوملعلع زمانہ ہو گیا مدہوش چشمِ مست دلبر سے
تماشہ ہے چھکی محفل کی محفل ایک ساغر سے
بلاغت پڑا ہے داغ میرے دل میں عشقِ قدِ دلبر سے
یہ سودا ہاتھ آیا ہے مجھے بازارِ محشر سے
تڑپ کر جب نکل چلتا ہوں میں کوئے ستمگر سے
اشارے کرتی ہیں آپس میں تیغیں چشمِ جوہر سے
بانعفوں یہ روز و شب نہیں کٹتے ہیں غافل زندگانی کے
نکل جاتا ہے ہر روز اک دو ورقہ تیرے دفتر سے

پھولوں میں اگر ہے بو تمہاری   کانٹوں میں بھی ہو گی خو تمہاری

گردش سے ہے مہر و مہ کی ثابت
انکو بھی ہے جستجو تمہاری

لو سرد ہوا میں نسیم سنبل
پوری ہوئی آرزو تمہاری

سب کہتے ہیں جس کو لیلۃ القدر
ہے کاکل مشکبو تمہاری

جو ہے بہار اسکو خزاں کا خطر بھی ہے
اے باغباں بسنت کی تجھکو خبر بھی ہے (لاجواب)

کیا یہ بھی تیری الفت عارض میں ہے مریض
تب بھی ہے آفتاب و دوران سر بھی ہے (عجب)

مانگا جو بوسہ آنکھ دکھائی عتاب کی
تجھے بیدرد تو بات بھی کیا لاجواب کی

عمر رواں کو جان کوئی موج آب کی
تار نفس نگاہ ہے چشم حباب کی

چمکی یہ روئے یار سے قسمت نقاب کی
جالی سے چھن رہی ہے کرن آفتاب کی

وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمت شراب کی
واعظ کے منہ پہ مہر لگا دوں کباب کی (سبحان اللہ)

میں وہ سیاہ کار ہوں جب سے ہوا ہوں دفن
جلاتی ہے زمیں مری مٹی خراب کی

امیدوار بارش ابر کرم ہیں ہم
بجلی گرایئے نہ نگاہ عتاب کی (ندرت)

اللہ رے قدر میرے گناہوں کی روز حشر
تعظیم کو کھڑی ہوئی میزان حساب کی

سو جانیں ہوں تو تیغ پہ تیری فدا کروں
کیا جلد کٹ گئی ہے گھڑی اضطراب کی

اندازے سے جو باتی ہے با ہر مرے گناہ
تردد اپنا تولتی ہے تراز و حساب کی (ندرت)

موسی کو یہ چڑھی ہے کہ برق جمال تھی
اک تہہ اتر گئی تھی تمہاری نقاب کی (ندرت)

نقاش کیا تمام مرقع نے رو دیا
تصویر دیکھ کر مری چشم پُر آب کی

تا سب پہ شان عفو نمایاں ہو روز حشر
چن لی ہے اسنے فرد ہماری حساب کی (سبحان اللہ)

دیکھو تو اتحاد ذرا حسن و عشق کا — بلبل کے آنسوؤں میں ہے خوشبو گلاب کی

جدت — فرقت میں کیا عجب کہ شب زندگی ہو صبح — پیدا ہے درد دل میں چمک آفتاب کی

ندرت — تم شہسوار حسن ہو لگ جائیگی نظر — گھوڑے سے اترو آنکھ بچا کر رکاب کی

ایک پوشیدہ کمر یار نے کیا رکھی ہے — آنکھ بھی تنگیٔ دہن ہم سے چرا رکھی ہے

اک ذرا وحشت دل بڑھ کے خبر تو لینا — خاک کیا نجد میں مجنوں نے اڑا رکھی ہے

نگہ ناز سے بھی دیکھ جو کرتا ہے ہلال — یہ ادا کس کے لئے تو نے اٹھا رکھی ہے

نشتر — نمک افشاں جو ہوا زخم پہ وہ ہنس ہنس کر — میں یہ سمجھا کوئی قاتل نے دوا رکھی ہے

ندرت — غیر کے ساتھ وفا کرکے وہ مجھ سے بولے — یہ وہی بات ہے جو تم نے بتا رکھی ہے

کیا دور ہے یہ اُسکے جمال و جلال سے — چیتے سے چھین لی کمر آنکھیں غزال سے

ڈالی سپہر نجوم نے اُس رخ کے خال سے — ابرو نے بڑھ کے نیچہ چھپنا ہلال سے

سمجھا میں چین گوشۂ ابرو سے ہو کے صید — مارا فلک نے تیر کمان ہلال سے

غمگیں جو میں ہوا تو ہوا اسکا صاف دل — چمکا یہ آئینہ مری گرد ملال سے

میت پہ میری آکے نکالا غبار دل — مٹی وہ دے گئے مجھے گرد ملال سے

نادر — جو چاہیے سو مانگیے اللہ سے امیر — اس در پہ آبرو نہیں جاتی سوال سے

دُزدِ سخن سے معنیِ رنگیں کو کیا خطر — مہندی لگائیگا کوئی کیونکر لگی ہوئی

خوش خرامی پہ جو اُس بت کی طبیعت آئی
چال اُڑانے کو دبے پاؤں قیامت آئی

تیغِ قاتل سے تھی امید بڑی وائے نصیب
وہ بھی منہ موڑ گئی جب مری نوبت آئی

ذرّۂ مہر ہوے ہم کبھی پروانۂ شمع
جس جگہ دیکھ لیا حُسن طبیعت آئی

بہار آئی عجب حالت ہے ان روزوں مرے دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی

بہے بحرِ فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل کی

لہو کیسا کہ صورت تک نہیں دیکھی ہے بسمل کی
الٰہی خیر ابھی سے فق ہے رنگت میرے قاتل کی

نئے بانکے سجے ہو تم نئی شمشیر باندھی ہے
نگاہِ حسرت آلودہ نہیں دیکھی ہے بسمل کی

کسی کا ساتھ کب دیتا ہے کوئی بیقراری میں
تڑپتا رہ گیا شعلہ شرر نے قطع منزل کی۔

شکوہ جو کیا درد کا تلوار نکالی۔۔ خوب اُس نے دوائے دلِ بیمار نکالی

نادر

صیاد کا رخ دیکھ لیا چاکِ قفس سے — یہ ہمنے قفس سے رہِ گلزار نکالی

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے — خود بخود صید چلے آتے ہیں توسن ڈالے

سارا پردہ ہے دوئی کا جو یہ پردہ اٹھ جائے — گردنِ شیخ میں زنار برہمن ڈالے

قابلِ دید ہیں وہ عارض و چشم و مژگاں — حوریں بیٹھی ہوئی ہیں خلد میں چلمن ڈالے

کہیں زخمِ نگہ ناز رفو ہوتے ہیں — کہو ڈورے یہ کسی اور پہ سوزن ڈالے

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے امیر — کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

نہال اسکو ہمیشہ کرتی ہے بالیدگی غم کی — الٰہی دل ہے یا کوئی کلی ہے نخلِ ماتم کی

ترا غمزہ ہی وہ طرار جب گلشن میں آتا ہے — گلوں کی جیب کتری ہے گرہ کاٹی ہے شبنم کی

نہیں ہے شرم کی جا آب تو ہمکو دیکھتے آؤ — کرٹی باندھ لی داغوں کی آنکھوں پر بھی مرہم کی

شکستِ شیشۂ دل سے امیر آیا ہے غش مجھکو — چھڑک کر مے سنگھا دے کوئی مٹی ساغرِ جم کی

سبحان اللہ

مجھ مست کو مے کی بو بہت ہے — دیوانے کو ایک ہو بہت ہے

سوئی کی طرح جو ہو خدا داد — تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے

جاتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں — مجھکو اے درد تو بہت ہے

اے نشترِ غم ہوا کہ تن خشک — تیرے دم کو لہو بہت ہے

ابروئے یار نہ بھولیں کبھی دل شاد رہے — خوب مطلع ہے یہ اللہ کرے یاد رہے

ہوں وہ مقتول مرے قتل کی ایسی ہے خوشی
رقص بر تیغ رہے وجد میں جلاد رہے

ہم جو کھینچے تو لب گور سے آتی یہ صدا
آئیے آئیے حضرت بہت آزاد رہے

یہ کہونگا یہ کہونگا یہ ابھی کہتے ہو
سامنے اُنکے بھی جب حضرت دل یاد رہے

آشیانہ سے نہ مطلب ہے نہ گلشن سے غرض
گھر الہی مرے صیاد کا آباد رہے

بسملوں کی نگہ یاس بڑی ہوتی ہے
اک ذرا دل کو سنبھالے ہوئے جلاد رہے

حشر میں عذر گنہ کیا ہے بتا تو رکھو
کہ مبادا انہیں بھولے تو مجھے یاد رہے

طول فرقت سے مزے وصل کے سب بھول گئے
نہ وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ وہ دن یاد رہے

کانٹے الجھیں نہ کہیں دامن آزادی ہیں
دامن اس ڈر سے سمیٹے ہوئے شمشاد رہے

قتل بے خنجر و شمشیر جو ہو مد نظر
اک ذرا آپکو کھینچے ہوئے جلاد رہے

دل کو طرز نگہ یار جتاتے آئے
تیر بھی آئے تو بے پر کی اُڑاتے آئے

میکشی کی ہے خوشی ہجر میں کسکو ساقی
لکۂ ابر تو اور آگ لگاتے آئے

دشت ہستی میں ملا خاک بگولے کی طرح
خاک اُڑاتے گئے ہم خاک اُڑاتے آئے

ہم اگر قتل ہوئے خیر یہ تقدیر اپنی
آپ بدنام نہوں ہوئے شمشیر اپنی

ہم اور معرکۂ امتحاں سے ٹل جاتے
جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے

ہزار تیز نہ تھی تیغ یار اگر چلتی
تو ہم سے کتنے غریبوں کے کام چل جاتے

سیاہ کار وہ ہوں حشر میں حساب مرا
جو وقت صبح سے ہوتا چراغ جل جاتے

شبِ فراق میں اچھا ہوا نہ کھینچی آہ　　غریب خانے کے دو جھونپڑے بھی جل جاتے

پچھوا مضمون　خیالِ زلف و عارض میں قضا کی　　نمازِ صبح و شام اک جا ادا کی
ادا پر مرنے والوں سے بھی غمزے　　کہو کیوں موت آئی ہے قضا کی
جدت　بہارِ بے خزاں ہے جامۂ یار　　نہ مرجھائیں کبھی کلیاں قبا کی
نشتر　ترے کشتے نے خنجر ہی کے نیچے　　مصیبت جھیل لی روزِ جزا کی

رفعت　ترا کیا کام اب دل میں غمِ جانانہ آتا ہے
نکل اے صبر اس گھر سے کہ صاحب خانہ آتا ہے
نظر میں تیری آنکھیں سر میں سودا تیری زلفوں کا
کئی پریوں کے سائے میں ترا دیوانہ آتا ہے
نادرہ　لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا
مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے
نشتر　انھیں سے غمزے کرتی ہے جو تجھ پر جان دیتے ہیں
اجل تجھکو بھی کتنا نازِ معشوقانہ آتا ہے
بانکپن　نمک جلاد چھڑکا چاہتا ہے میرے زخموں پر
مرنے کا وقت اب اے ہمت مردانہ آتا ہے
امیر اور آنے والا کون ہے گورِ غریباں پر
جو روشن شمع ہوتی ہے تو ہاں پروانہ آتا ہے

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پُر خم نے اُسکے پیچ
کچھ رہ گئے تو میرے مقدر میں رہ گئے

مجلس تمام ہو چکی ہنگامہ ہو چکا
ہم راہ دیکھتے تری محشر میں رہ گئے

لی کاروانِ گُل نے خزاں میں عدم کی راہ
بلبل پھڑک پھڑک کے گلستاں میں رہ گئے

لوٹا ستمگروں نے مگر پھر بھی اے امیر
مضمون ہزار ہمارے دیواں میں رہ گئے

نہ مست ہی نہ کوئی ہوشیار باقی ہے
حجاب کس سے اب اے چشم یار باقی ہے

وہ صیدگاہ سے جاتے ہیں ابھی اجل کہدے
ادھر بھی بے پر و بال اک شکار باقی ہے

نہ جائیگی کبھی تا زیست اپنی سوزشِ دل
کہ شیر زندہ ہے جب تک بخار باقی ہے

چلے برنگِ نفس عمر بھر تو کیا حاصل
کہ منزلوں ہی ابھی کوئے یار باقی ہے

نہ توڑو آئینہ جانے بھی دو کہ ایک ہی
تمہارے دیکھنے والوں میں یار باقی ہے

قضا پکارتی پھرتی ہے کوئے قاتل میں
چلے اگر کوئی امیدوار باقی ہے

برنگِ شمع اترتی نہیں یہاں تپِ غم
ہزار آئے پسینا بخار باقی ہے

امیر فاتحہ پڑھنے کو کوئی کہاں آئے
مزار ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

تیغ قاتل پہ ادا لوٹ گئی | رقص بسمل پہ قضا لوٹ گئی
ہنس پڑے آپ تو بجلی تڑپی | بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی
پس گیا چشم سیہ پر سرمہ | پائے رنگیں پہ حنا لوٹ گئی
اونچی چوٹی کے ادا گر دیکھی | نیچی نظروں پہ حیا لوٹ گئی
اس روش سے وہ چلے گلشن میں | بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی
لطافت
جان محزوں کی حقیقت کیا تھی | درد پہلو میں اٹھا لوٹ گئی
نشتر
سانپ کی طرح مری چھاتی پر | رات وہ زلف دوتا لوٹ گئی
وار خالی نہ گیا قاتل کا | بچ گیا میں تو قضا لوٹ گئی
کیا مزے کی ہے طبیعت اپنی | ایک بوسہ جو ملا لوٹ گئی

ندرت
جنت میں روح جسم ہے نیچے مزار کے
کشتی ہماری ڈوب گئی پار اتار کے

گلشن سے بلبلوں کو اڑاتا ہے باغباں
صدقے اتر رہے ہیں عروس بہار کے

پیری میں کس مزے کو جوانی کے روئیے
سو داغ دے گئے ہیں دو دن بہار کے

عجیب مضمون
یکرنگ تھے وہ ہم کہ دو رنگی نہ کی پسند
پہنا کفن تو جامۂ ہستی اتار کے

کلیاں جھنیں گلوں کو سمجھتی ہے عندلیب

وہ بند ہیں نقابِ عروسِ بہار کے

دامن کشاں وہ آئے سرِ تربت شکر ہے
آنسو تو کچھ پُچھے مری شمعِ مزار کے

ہے نمازِ ان زاہدوں کی ضعفِ ایماں پر دلیل
سامنے اللہ کے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

بوجھ ہے چوٹی بھی ان نازک حسینوں کیلئے
گیسوؤں کی طرح بل کھاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

رسم نے ملنے کی کھوئی عید کی ساری خوشی
تین دن تک پاؤں رہ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

طرزِ رفتار سے مارا ہے تو پامال بھی کر
دیکھ قاتل یہ بڑی چال چلی جاتی ہے

کچھ نہ اغیار کی تقصیر نہ تم پر الزام
بے زبانی مری باتیں مجھے سنواتی ہے

گُل نسیمِ سحری شمعِ سحر کو نہ کرے
کوئی دم میں یہ غریب آپ بجھی جاتی ہے

بیخود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے
پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے

توڑ کر پہلو جو چل نکلا دلِ نخچیر سے
خوب روئیں حسرتیں دل کی لپٹ کر تیر سے

کل تلک تھا کثرتِ عصیاں سے نادم اے کریم
آج شرمندہ ہوں اپنی قلتِ تقصیر سے

قطع ہو راہِ سفر کوچۂ قاتل آئے
تھک گیا ہوں میں الٰہی کہیں منزل آئے

حال ہشیاری کا بیدار دلوں سے پوچھو
ہم تو غافل رہے غافل گئے غافل آئے

ہم تہی دست لبِ گور تو پہنچے پر یوں
جس طرح لُٹ کے مسافر سرِ منزل آئے

اب کسی سے نہ رہی ملنے کی حسرت باقی
آج جی بھر کے گلے تیغ سے ہم مل آئے

قلزمِ عشق وہ قلزم ہے جہاں مثلِ حباب
ٹوٹ جائے جو سفینہ لبِ ساحل آئے

بے نقاب آئے جو وہ رات کو محفل میں امیر
شمع نے بڑھ کے کہا رونقِ محفل آئے

کہا ہم نے جو دل کا درد تم اس کو گلا سمجھے
تصدق اس سمجھ کے مرحبا سمجھے تو کیا سمجھے

جو اٹھتے بیٹھتے پیری میں بولیں ہڈیاں اپنی
درائے کاروانِ زندگی کی ہم صدا سمجھے

وعدۂ وصل اور وہ کچھ بات ہے
ہو نہ ہو اس میں بھی کوئی گھات ہے

رو رہے ہیں ہم ملا دے لب سے لب
میکشی ہو ساقیا برسات ہے

لختِ دل ہیں میرے کھانے کو امیر
بس انہیں ٹکڑوں پہ اب اوقات ہے

نیم جاں چھوڑ چلی نیم نگاہی تیری
زندگی تا صد و سی سال الٰہی تیری

آنکھ میں آئے تو پتلی ہی تو اے زلفِ سیاہ
دل میں ٹھہرے تو سویدا ہی سیاہی تیری

رنگ تو خوب ہی پر اے شبِ غم عیب یہ ہے
کہ رواتی نہیں رکھتی ہے سیاہی تیری

میں تو زنداں سے سوئے دشت بڑھاتا ہوں قدم
ہوگی اے خانۂ زنجیر تباہی تیری

تو بھی اے ابر سیہ بوتلیں بھی مے کی سیاہ
ملگئی خوب سیاہی میں سیاہی تیری

حشر میں تو نہ زباں بند کرائی تیغ دو دم
دو گواہوں کے برابر ہے گواہی تیری

خورشید گرد ہی ترے گالوں کے سامنے
میلے خطِ شعاع ہیں بالوں کے سامنے

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

کیا کیا بناؤ کرتے ہیں خار رہ جنوں
رکھ رکھ کے آئینے مرے چھالوں کے سامنے

کرتے ہیں عجز جن کو خدا نے دیا ہے ظرف
شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے

عاشق نے لاکھ جمع کیا دفترِ حواس
شیرازہ کھل گیا ترے بالوں کے سامنے

پانی کی چھاگلیں جو سمجھتے ہیں خارِ دشت
آتے ہیں دوڑ کر مرے چھالوں کے سامنے

موسیٰ سے کہہ دو طور پہ جایا کرو نہ روز
اچھے نہیں ہیں برق جمالوں کے سامنے

اے دل بھرے تو بیٹھے ہی تھے اب ابل پڑے
کانٹوں نے لی جو نوک کی چھالوں کے سامنے

نہیں امید جو اس بیوفا کے آنیکی
میں راہ دیکھ رہا ہوں قضا کے آنے کی

یقیں ہوا جو گرا دانت کوئی پیری میں
کہ آج کھل گئی کھڑکی قضا کے آنے کی

غلاف ڈال قفس پر ابھی نہ اے صیاد
کہ ہے چمن سے توقع صبا کے آنے کی

بعدِ مردن بھی مرے ضعف کی قوت نہ گھٹی
خاک اٹھی بھی تو چکرا کے وہیں بیٹھ گئی

ان دنوں دخترِ رز کا نہیں ملتا ہے پتا
کہیں قاضی کے تو گھر جا کے نہیں بیٹھ گئی

دور سے بھی جو نظر آئی کہیں شکلِ امید
پاس آ کر مرے پہلو کے قریں بیٹھ گئی

چال نے تیری قیامت کو ابھرنے نہ دیا
ٹھوکریں ایسی لگائیں کہ وہیں بیٹھ گئی

لذت جو ملی مرے لہو کی
خنجر نے بلائیں لی گلو کی

روئے مری قبر پر وہ آ کر
ہم خاک ہوئے تو آبرو کی

کی جس پہ نگاہ تجھکو دیکھا
اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی

ساقی نے سنگھائی غش میں مٹی
سوندھی سوندھی مجھے سبو کی

تھا چار طرف اُسی کا جلوہ
کیوں نعش ہماری قبلہ رو کی

پلکیں دمِ جوششِ خوں فشانی
دھاریں نظر آتی ہیں لہو کی

دل ہی نہ رہا امید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

جائے گا جنون نہ سر سے بے ذبح
ہو فصد مری رگِ گلو کی

اب کیوں ہیں کلیم غش میں خاموش
پہلے نہ سنبھل کے گفتگو کی

کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ
ق خود دید کی اپنی آرزو کی

تھا پردۂ ظاہری جو منظور
آواز بدل کے گفتگو کی

کلفت نہ مٹی امیر دل سے
اشکوں نے ہزار شست و شو کی

بیعت پیرِ مغاں طرفہ مزا دیتی ہے ‏— سلسلہ ساقیٔ کوثر سے ملا دیتی ہے
بڑھ کے جب بولتی ہے موسمِ گل میں بلبل ‏— جل کے پھونکیں صبا آگ لگا دیتی ہے
پوچھتے ہیں جو شبِ ہجر میں ہم شمع سے حال ‏— منہ سے کہتی نہیں کچھ اشک بہا دیتی ہے

بندے ہیں حسنِ ملیح یار کے ‏— ہیں نمک پروردہ اس سرکار کے
آئی بالیں پر جو مجھ بیمار کے ‏— خوب روئی موت ڈاڑھیں مار کے

جو بحرِ عشق میں ہے وہ آفت رسیدہ ہے ‏— گرداب مثلِ موج گریباں دریدہ ہے

خدا کو اپنی اپنی داستانیں سنائیں گے ‏— قیامت جس کو کہتے ہیں وہ بزمِ قصہ خوانی ہے
وہ میری پھر خط کو دیدۂ بیگانہ سمجھے ہیں ‏— نئے انداز کی اے نامہ بر یہ بدگمانی ہے
وہ پیاسا ہوں کہ مر جاؤں نہ مانگوں خضر سے پانی ‏— گئی جب آبرو پھر خاک آبِ زندگانی ہے

خدا نے شانِ یوسف سے تمہاری شان افضل کی
کھلی سب نقشِ ثانی سے حقیقت نقشِ اول کی
ہزاروں منعموں کو ہوش میں لا نہیں سکتے
یہ سچ ہے ایک توڑے میں ہے مستی ایک بوتل کی

ہم اس کے عشق میں صبر و قرار کھو بیٹھے ‏— قدیم دوست ہمیشہ کے یار کھو بیٹھے

بیساختگی — سرِ خدنگِ نگہ آچکا تھا تا سرِ دل — تم آنکھ پھیر کے اپنا شکار کھو بیٹھے
نشتر — گلوں نے خندۂ بیجا سے یہ ثمر پایا — کہ چار دن بھی نہ گذرے بہار کھو بیٹھے
ادا وہ کون تھی جس پہ ہوئے فقیر امیر — ذرا سی بات پہ صبر و قرار کھو بیٹھے

ہزاروں خار لاکھوں پھول اس گلشن میں ہیں لیکن
نہ تم سا نازنیں کوئی نہ ہم سا ناتواں کوئی

جدت — حیا دیکھو وہ نرگس زار میں گھبرا کے کہتے ہیں
ادھر آنکھیں اُدھر آنکھیں نقاب اُلٹے کہاں کوئی

سہل ممتنع — اُٹھانا کوہ کا آساں اُٹھانا بات کا مشکل
قوی مجھ سا ہے عالم میں نہ مجھ سا ناتواں کوئی

حسرت — قفس کی تیلیاں ہیں جتنی شاخیں ہیں درختوں کی
کہاں باندھے الٰہی اس چمن میں آشیاں کوئی

کمالِ جذب سے تا لامکاں پہنچے امیر احمد
رہا معشوق و عاشق میں نہ پردہ درمیاں کوئی

عبرت — کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم — جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے
اُس تیغ کے منہ چڑھے نہ بجلی — کیوں جان سے ہاتھ دھو رہی ہے

باندھی جو روزِ حشر ہوا ہم نے آہ کی — اُڑتی پھرےگی فرد ہمارے گناہ کی

بھاری بہت ہے لاؤ نگار روزِ جزا میں زنار　　رکھوا کے سر پہ شیخ کے گٹھری گناہ کی

تھے وہ موسیٰ غش پہ غش آیا جنھیں　　یاں تو آنکھیں کھل گئیں دیدار سے
گرمیاں کرنے گئی تھی رات کو　　رو کے اٹھی شمع بزم یار سے
بے سبب چھاگل نہیں کرتی ہے شور　　یہ بھی نالاں ہے تری رفتار سے
تم ہو ناواقف ہم آغوشی کا ڈھنگ　　سیکھ لو اپنے گلے کے ہار سے

صلح کل میں ہے ابھی شرکت کہیں تھوڑی سی　　اور اے پیر خرابات نشیں تھوڑی سی
مدد اے شوق سجود المدد اے شوق سجود　　سر نہ اٹھے ابھی باقی ہے جبیں تھوڑی سی
کچھ تو پیدا ہو کباب دل بریاں میں مزا　　چاہیے الفت خال نمکیں تھوڑی سی
ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں　　اُسی انداز سے کہہ لے کہ نہیں تھوڑی سی

خلیل سانہ میں قائل ہوا ستاروں کا　　بدل کے رنگ یہ بہروپئے ہزار آئے
گناہگاروں کا چورنگ کھیل ہے انکو　　ادھر اُدھر گئے دو چار ہاتھ مار آئے
جلا ہوں یہ فلک سرد مہر کے ہاتھوں　　لگاؤں ہاتھ تو کافور کو بخار آئے
یقین ہے ذکر کرے میرے جوش وحشت کا　　جو آبلے کے دہن میں زبان خار آئے

تیر کے ساتھ چلا دل تو کہا میں نے کہاں　　حسرتیں بولیں کہ مہمان کو رخصت کرنے
آ گئے میخانہ میں تھے پیر خرابات امیر　　اب چلے مسجد جامع کو امامت کرنے

بدقت بحرِ غم سے کشتیٔ جانِ حزیں نکلی — کبھی بیٹھی کبھی اچھلی کہیں ڈوبی کہیں نکلی

جنون — وہ کیا پردے سے نکلے جسکے پیراہن کو غیرت ہو — ہوا ہیں پرچہیں دامن جو دیکھی آستیں نکلی

وہ تھا غم دوست سنگِ گردوں جب پڑا مجھ پر — شکست شیشۂ دل سے صدائے آفریں نکلی

تصوف — فنا کیسی بقا کیسی جب اُسکے آشنا ٹھہرے
کبھی اِس گھر میں آنکلے کبھی اُس گھر میں جا ٹھہرے

سبحان اللہ — صفیں آراستہ ہونے لگیں جب اہلِ محشر کی
جما کر ایک ٹکڑی حسرتوں کی ہم جدا ٹھہرے

عاشقانہ — جفا دیکھو جنازے پر مرے آئے تو فرمایا
کہو تم بیوفا ٹھہرے کہ اب ہم بیوفا ٹھہرے

تہہ خنجر بھی منہ موڑا نہ قاتل کی اطاعت سے
تڑپنے کو کہا تڑپے ٹھہرنے کو کہا ٹھہرے

دلِ مضطر سے کہد و تھوڑے تھوڑے سب تڑپ چکیے
ذرا بہکے ذرا سنبھلے ذرا تڑپے ذرا ٹھہرے

سبحان اللہ — نہ تڑپا چارہ گر کے سامنے اے درد یوں مجھکو
کہیں ایسا نہو یہ بھی تقاضائے دوا ٹھہرے

امیر آیا جو وقتِ بد تو سب نے راہ لی اپنی
ہزاروں سیکڑوں میں درد و غم دو آشنا ٹھہرے

گردِ باد اُٹھکے سراپردۂ در کس کا ہے
اے جنوں خانہ بدوشی میں یہ گھر کس کا ہے

تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

توڑتا ہے جو کوئی پھول تو کہتی ہے صبا
کیا خبر تجھکو کہ یہ دل یہ جگر کس کا ہے

اِس طرف منہ نہیں کرتا ہے جو خورشید کبھی
گرم کیا جانئے بازار اُدھر کس کا ہے

شراب خانہ کا عازم ہے تیرا دیوانہ — سبو کے ہاتھ میں خشتِ خُمِ شراب رہے
خطاب ہے لبِ ساغر کا محتسب سے امیر — پھرے جو پیرِ خرابات سے خراب رہے

بگولے خاک سے اُٹھتے ہیں اب تک — نہ مر کر بھی دبے ہم آسماں سے
کہاں دیر و حرم میں عشقِ مشرب — یہ لوگ آزاد ہیں قیدِ مکاں سے

عیشِ بے رنج کہاں غمکدۂ عالم میں — نظر آتی ہے خوشی خندۂ بیمار مجھے

خلقتِ روزِ ازل بے سر و سامانی ہے — خاص ہوس صراحیٔ عریانی ہے
ذبح ہو کر بھی تجھے دیکھ رہا ہے قاتل — دیکھ کیا حوصلۂ دیدۂ قربانی ہے

صحت ہوئی مرض سے مگر ناتواں رہے — پرہیز کون کرتا رہے ہم اتنے کہاں رہے
پوشیدہ خط سے جوہرِ حسنِ تباں رہے — اپنے دھوئیں میں [illegible] شعلے نہاں رہے
خنجر کو رکھ کے زخم میں اس تیز گر نے کہا — ایسے دہن میں چاہیے ایسی زباں رہے
شبنم ہمیں خدا نے بنایا ہے تجھکو مہر — تیرا ہوا ظہور تو پھر ہم کہاں رہے
اے آہ کر مدد یہ کہاں تک مخالفت — یا ہم رہیں زمین پہ یا آسماں رہے
نیرنگ انکی شانِ تجلی کے دیکھیے — اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے
یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام — کشتی میں جیسے ساکنِ کشتی رواں رہے
اب دیکھیں کیا دکھائے نشیب و فرازِ دہر — اب تک تو جس زمیں پہ رہے آسماں رہے
بیڑا ہو پار عشقِ مژہ میں سے کٹے جو عمر — خنجر کی دھار پر مری کشتی رواں رہے

لطف جب ہو کہ ادھر ہاتھ میں بوتل آئے
اُس طرف جھوم کے گلزار میں بادل آئے

وہ سیہ مست ہوں ساقی کہ اگر پہلو میں...
دل کو ڈھونڈوں تو مرے ہاتھ میں بوتل آئے

توبہ کرنی تھی کہ بوچھار ملامت کی ہوئی...
خوب ہی مجھ پہ برستے ہوئے بادل آئے

پھینک دو کاٹ کے جڑ نخلِ تمنا کی امید...
پھول کمبخت میں آئے نہ کبھی پھل آئے

مراۃ الغیب کے یہ گرانبہا اشعار جو پیشکش اہل بصر و بصیرت کئے گئے ہیں
انہیں نادر اشعار کے مماثل صدہا شعر اور بھی ہیں جو دیوان میں موجود ہیں۔
میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب
منتخب اشعار لیلئے جائیں چونکہ بمقتضائے دور ناسخ اس دیوان میں
مختلف حسن و انداز کے شاہدان معنی گونا گوں لباس میں تھے ۔
لہذا بعض بعض اشعار کی جانب نگاہِ ناظر کو متوجہ کرنیکے لئے
اشارتاً کچھ لکھدیا گیا ہے۔ آیندہ کلام میں ضرورت نہوگی کیونکہ
حسن سب کا نکھرا ہوا اور لباس سب کا ایک ہی رنگ کا ہوگا

حضرت امیرؔ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ غدر کے زمانے میں
اُنکا بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ اس ہنگامے کے بعد رامپور جانے
اور اطمینان حاصل ہونے پر اُن کو خیال ہوا کہ تلف شدہ کلام کے کچھ
اشعار اگر یاد آجائیں تو لکھ لینا چاہیئے۔ چنانچہ غور کرنے سے جو جو شعر
یاد آتا گیا وہ سب قلمبند کر لیئے گئے۔ اسطرح ایک چھوٹا سا مجموعہ
مفرداتِ ہو گیا جس کا نام گوہرِ انتخاب رکھا گیا۔
مراۃ الغیب کے بعد لکھنؤ میں یہ مختصر مجموعہ چھپ گیا تھا۔ ۱۳۰۰ھ
میں جب حضرت امیرؔ رامپور سے لکھنؤ تشریف لائے تھے تو
اسکا ایک نسخہ راقم الحروف کو بھی مرحمت فرمایا تھا۔ بعد کو جب
اسکی کاپیاں باقی نہیں رہیں تو صنمخانہ عشق کے ساتھ مکرر چھپوا کر آخر میں
لگا دیا گیا ہے اسکا ہر شعر بلیغ ایک عالم رکھتا ہے اور سلاستِ زبان
میں سہل ممتنع ہے۔
اس گویائی کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہو گا کہ سعدیؒ اور امیر خسروؒ کی شاعری کا
عطر کھنچا ہوا ہے بلا انتخاب تھوڑے سے اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں۔

گوہرِ انتخاب

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پاگیا | اکبار یا غفور کہا اور چڑھا گیا
محشر میں دیر تھی اگر آنے میں یار کے | اے شورِ حشر تونے مجھے کیوں جگا دیا
ہے تشنگی وہی غمِ الفت کی آج تک | سارا لہو نچوڑ کے میں نے پلا دیا
تڑپتے ہیں اگر بسمل تجھے کیا | تو اپنا کام کر قاتل تجھے کیا
فلک ہم تو تیرا بھی شکوہ نہ کرتے | مگر تجھکو ڈھب ہی نہ آیا جفا کا
آتے ہی دمِ نزع مرے پاس وہ بولے | ہم جاتے ہیں یہ حال تو دیکھا نہیں جاتا

رہ رہ کے اک کھٹک سی سینے میں ہو رہی ہے
شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

کہا دل نے یہ مجھ سے کھینچکر خنجر وہ جب آیا
تڑپنے تلملانے لوٹنے کا وقت اب آیا

صفِ محشر میں تیرے کُشتوں نے | کچھ سمجھکر مجھے امام کیا
نہ پھرا نامہ بر وہاں سے امیر | زندگی نے مجھے جواب دیا
انصافِ جورِ یار خدا سے طلب کیا | تمنے بھی اے امیر بڑا ہی غضب کیا
نہ ملا تھا جواب نامہ اگر | آکے قاصد جواب ہی دیتا
اسقدر ہے دراز ہجر کی رات | پر تڑپنے سے جی نہیں بھرتا
خنجر نے ترے دیا نہ پانی | ترسا ترسا کے مار ڈالا

کیوں نہ کٹتی زبان تری اے شمع　　سوزِ دل کیوں زبان پر آیا

اے دل تو اور جا رپہ عاشق ہو مجکو کیا　　میں نے ترے بھلے کو کہا کیا برا کیا

مری صورت جو بدلی فرطِ غم سے　　تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا

سوا اس کے کہ کچھ دل کے تڑپنے میں مزا پایا
مرے پہلو میں کہکر تو نے اے درد اور کیا پایا

کہتا ہے عشق دیکھ کے میرا چراغِ داغ
روشن ہے اس سے نام مرے خاندان کا

زورِ جنوں سے ضعف میں ارماں نکل گیا　　اٹھا نہ ہاتھ بھی کہ گریباں نکل گیا

میکشوں کا نامۂ اعمال سارا دُھو گیا　　جو دھواں بھٹی سے اٹھا ابرِ رحمت ہو گیا

اے دل بلائے جا وہ کبھی آہی جائیگا　　دو چار بار کہنے میں شرما ہی جائیگا

نالے کرتے کرتے میں ٹھہرا تو وہ کہنے لگے
مر گیا۔ غش کر گیا۔ دیکھو تو چپ کیوں ہو گیا

اپنے مرنے کا نہیں غم مگر اتنا غم ہے
اے عزیزو ملک الموت نے گھر دیکھ لیا

امیرؔ صانع قدرت کا کھیل ہے دنیا　　بنا بنا کے مٹائی ہیں صورتیں کیا کیا

نوجواں لوگ کیا نہیں کرتے　　دل لگایا تو کیا گناہ کیا

قاتل اک چٹکی نمک دیدے ڈال اب　　زخم کھاتے کھاتے تو جی بھر گیا

کس کس نے ہمکو روکا اس در پہ ہم جو پہنچے
لغزش نے پاؤں پکڑے دربان نے ہاتھ کھینچا

مُردے کا زندہ کرنا کیسا تم آپ مرتے — مرنے کا کچھ مسیحا تم نے مزا نہ جانا

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر — دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا

مجھکو دیکھا تو آئینے نے کہا — ہائے کیا حال ہو گیا تیرا

سنا ہے کل کہیں مسجد میں وہ بُت آیا تھا — نماز ہو نہ سکی اسقدر ہجوم ہوا

قتل سے ہم رہے محروم گری ہاتھ سے تیغ
ہائے اس آنکھ سے جلاد کو کیوں دیکھا تھا

اُٹھتا نہیں ہے شور جو بازار میں کہیں — کیا آج امیرِ مست سے اُٹھا نہیں گیا

تو مجھ سے نہ مل خیر مجھے بھی نہیں پروا — ڈھب تیرے جلانے کا یہ اے یار کرونگا

ق

تصویر تری لاکے میں اب سامنے تیرے — چھاتی سے لگاؤنگا اُسے پیار کرونگا

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے — کہ مر کر ہم کو پھر جینا پڑے گا

ذکرِ شبِ فراق یہ کہتا ہے دل مرا — لو میرے آگے نام نہ اُس رُوسیاہ کا

اس بتِ تُند خو کو رام کیا — آفریں اے امیر کام کیا

بہت غم نہ کھا عشق کا اے امیر — تجھے کوئی آزار ہو جائے گا

تیری لکنت پر فدا سو جان سے دل ہو گیا
تو نے آدھی بات کی میں نیم بسمل ہو گیا

وہ آئے کھینچکے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

کھل گیا زاہد کہ مستوں پر خدا کا رحم ہے
ابر جب قبلے سے اُٹھا میکدے پر چھا گیا

غم اُس کا حسرتوں سے پوچھتا ہے میرے سینے میں

کہاں ہے وہ جو دل نام اک یہاں بیمار رہتا تھا

حضرتِ عیسیٰ ابھی کیا دیکھتے ہو میری نبض

پہلے اُس کو دیکھ آؤ پھر مجھے تم دیکھنا

سنوارا ہے اگر اسکو لحاظ اتنا بھی تو رکھنا

اب اے مشاطہ آئینہ نہ اسکے روبرو رکھنا

شمع کی طرح جلا بھی میں پھنکا بھی لیکن

عمر بھر رشتۂ الفت مری گردن میں رہا

بیقراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی

دردِ دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اُٹھا

میں دل لگا کے تو سنتا ہوں کیا کروں ناصح

ترا کلام ہی دل میں اثر نہیں کرتا

ضعفِ دل نے اثر یہ دکھلایا   درد سے بھی اُٹھا نہیں جاتا

آوارہ پھر رہا ہے محبت کی راہ میں

اک دل دیا تھا ہم کو خدا نے سو یوں گیا

ہزاروں اُس سے سوا بے نشاں ہیں لیکن

نکل گیا ہے زمانے میں نام عنقا کا

لاکھوں اُس لیلیٰ کے دیوانے تھے انہیں عشق نے

ایک مشتِ استخواں کا نام مجنوں رکھدیا

باڑھ رکھی ہے اُس نے خنجر پر   ہائے اس وقت مجھ میں دم نہ ہوا

بولے وہ سنکے رات کو میری صدا امیر
پوچھو تو کوئی نام ہے کیا اس فقیر کا

یوں ترے در پہ کیوں پڑے رہتے ہم غریبوں کا گھر اگر ہوتا

روز محشر سے ڈرایا ایکدن میں نے انہیں
ہنسکے بولے وہ بھی اک فتنہ ہے اپنی چال کا

چھوگئی بو جہاں محبت کی رنگ پھر ڈر سے منہ نہیں چڑھتا

قتل موذی کا تو شرعاً ہے درست ناصح اب تک کیوں سلامت رہگیا

کھٹکتے ہیں جو رہ رہ کر ترے تلوؤں میں اے رہرو
عوض لیتے ہیں کانٹے تجھسے اپنی پائمالی کا

جو میرے قتل کو تلوار لیکے یار آیا لپٹ گیا۔ مجھے بے اختیار پیار آیا

شوق سے میں نے جو خنجر کے تلے سر رکھدیا
چھیڑنے کو ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھدیا

بازو پہ رکھکے سر جو وہ کل ساتھ سوگیا
آرام یہ ملا کہ مرا ہاتھ سوگیا

گل خود تھے بے ثبات گلستان دہر میں
گلچیں غریب مفت میں بدنام ہوگیا

ضبط کرتے ہی اثر نالوں کا ظاہر ہوگیا
بول اٹھے گھبرا کے سینے سے ہے لو وہ آخر ہوگیا

کرنے کو کیا قتل مجھے یار نے لیکن رو رو کے مرے خون کو تلوار سے دہویا

چلے جو آگے بتاتے تری گلی کی راہ — میں آج خضر سے بھی سخت بدگماں ہوا
سمجھے کہ عرض حال کرے گا ضرور امیر
دربار اُس کے آتے ہی برخاست کردیا

باغباں بیداد گر گل بیوفا گلچیں رقیب
یارب اپنا درد دل کس کو سنائے عندلیب
بندھ گئی اُس گل کی یہ نازک مزاجی کی ہوا
پھر گئی منقار تک آ کر صدائے عندلیب

اب یہ عالم ضعف کا ہے میں جو روتا ہوں امیر
ساتھ ہر آنسو کے گر پڑتا ہوں آنسو کی طرح
ہماری رائے میں بہتر ہے میکشی کو صباح
اب آگے قاضی و مفتی و محتسب کی صلاح

میں وہ گل ہوں اس چمن میں باغباں — پھینکدے گلچیں بھی جس کو توڑ کر
ذرا نظارۂ گل طبل سے بال و پر کرلے — بٹھادے ایکدم صیاد اسے دیوار گلشن پر
بھیڑ میں پڑ جائے تا آنکھ اس رخِ پر نور پر
چڑھکے بیٹھے ہیں کلیم اللہ کو لا طور پر
مسافر سے جھگڑتے ہیں فرشتوں سے خدا سمجھے

گھڑی بھر چپ پڑا رہنے نہیں دیتے ہیں منزل پر
جاں اگر دیتی نہیں ہے ساقیِ گلفام پر
کیوں لہو روتی ہے منہ رکھکر صراحی جام پر

فصلِ گل آگئی شاید کہ صبا گلشن سے
برگِ گل لیکے چلی مرغِ گرفتار کے پاس

دیکھکر گستاخیِ پروانہ شرماتی ہے شمع
تھوڑی تھوڑی کیسی محفل میں ہوئی جاتی ہے شمع

ایک قطرہ خون ہے دل پر وہ قطرہ ہے امیر
غوطے کھاتے پھرتے ہیں جسمیں دو عالم آج تک

محفوظ کوئی سختیِ ایام سے نہیں
عشاق سخت جان ہیں تو معشوق سنگدل

چھپ گئے پہلے تو مجھکو دیکھکر
پھر کہا لو کس سے شرماتے ہیں ہم
راتدن رونا تڑپنا تلملا نا بیٹھنا
ہیں تو ہم ناکام پر رہتا ہے کاموں کا ہجوم
مرکے بھی یار کا دم بھرتے ہیں
زندۂ عشق کہیں مرتے ہیں
جانِ من وہ دل کے لے لینے کی راہیں اور ہیں
جنکو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں وہ نگاہیں اور ہیں
دلِ ویراں مرا آباد رہے
ایسے ویرانے کہاں ہوتے ہیں

نہیں لیگئی بیخودی دور امیر خدا ہی ملائے تو اب ہم ملیں

سنگ دشمنا نے کیا ہے کرم تو عذر ہے کیا
جلی بھنی ہوئی ہیں ہڈیاں سو حاضر ہیں

خدا دراز کرے عمر برق اے گلچیں
چراغ آکے جلاتی ہے آشیانوں میں

تجھے شیخ جی مرگئے ہیں۔ انکے مرید جبس دم کا گمان کرتے ہیں

تجھے کیا ہم جو وصفِ ساقیِ گلفام کرتے ہیں
تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

وصل کو اُن سے جو کہئے تو کریں وعدۂ حشر
کیجئے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہمکو امیر
کسی کی آنکھ جہاں ہم پُرآب دیکھتے ہیں

یار کے اُٹھتے ہی برہم ہوگیا سامانِ عیش
مے کہیں مینا کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں

امیر دیر و حرم سے الگ جو جاتے ہیں
وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا بناتے ہیں

وفا کا وعدہ وفا ہو یہ غیر ممکن ہے
جفا کا وعدہ تو ابتک وفا ہوا ہی نہیں

بلبل آوازِ اسیرانِ قفس کو نہ سُنا صحبتیں اگلی چمن کی انھیں یاد آتی ہیں

نہیں پروا کسی کو کارواں میں الٰہی کیا میں فریادِ دِرا ہوں
زاہد و غافل نہیں اُس سے صنم بن گئے ہیں بُت خدا کی یاد میں

راحت کو ڈھونڈتا ہے عبث تو جہان میں
اس کا زمیں میں ہے نہ پتا آسمان میں

پھولوں سے کہہ صبا یہ خوشی کی جگہ نہیں
رونے کا ہے مقام ہنسی کی جگہ نہیں

صورت کو اُسکی دیکھ کے سمجھے ہو تم غریب
تم سے کبھی امیر سے باتیں نہیں ہوئیں

دنیا ہے ایک میکدہ بیخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

نگاہیں حیا سے کہاں پھر چلیں ادھر دیکھئے پتلیاں پھر چلیں
گھات میں محتسب کو رہنے دو مست بھی ہوشیار رہتے ہیں
نہ عارض نہ زلفِ دوتا دیکھتے ہیں خدا جانے ہم تجھ میں کیا دیکھتے ہیں
لیا پھر تو نے اُس کا نام اے دل ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہوں

کسی کا دل ہے مکدر ضرور مجھ سے امیر
کہ اک غبار سا رہتا ہے میری آنکھوں میں

اے صنم اب ترا خدا حافظ ہم تو کعبے کی راہ لیتے ہیں

نہ تڑپوں جو فرقت میں تو کیا کروں
کہ بے شغل رہنے کی عادت نہیں

راہ صحرا کی جو ہم لیتے ہیں — جتنے کانٹے ہیں قدم لیتے ہیں
ہم کو فردائے حشر کا کیا غم — کہ شب ہجر کی سحر ہی نہیں
ہو کوئی گاہک تو سودے کا امیر — کون سے بازار میں سودا نہیں
ہنس تو پڑتے ہیں میرے رونے پر — شکر ہے گریہ بے اثر تو نہیں
ایسی راحت ملی قناعت میں — سو گئے پاؤں کنج عزلت میں
مزا ملا مجھے یہ دل کی بیقراری میں — کہ بھر رہا ہوں نمک اپنے زخم کاری میں
کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا — ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں
ان حسینوں کی محبت ہے سرکار — پاؤں چھونے پہ ہاتھ کٹتے ہیں
لیا ہے غیر نے بوسہ اسی کو گالی دو — خفا ہو مجھ سے نہ لینے میں میں نہ دینے میں
نالہ اگر کرے تو سمجھ بوجھ کر کرے — بلبل سے کہدے کوئی کہ ہم بھی چمن میں ہیں
میں خدا کے سامنے کہد ونگا زاہد تو تو کیا
یارسا بُت دوسرا ساری خدائی میں نہیں
میکدے میں کہیں پڑے ہونگے — شب جمعہ ہے آج امیر کہاں
صیاد سے چھری کے تلے عندلیب نے
حسرت سے یہ کہا کہ غریب الوطن ہوں میں
محتسب جام سے جو ٹوٹے ہیں — میکشوں کے نصیب پھوٹے ہیں
امیر وادئ غربت میں تا کجا گردش
بہت سفر میں رہے اب چلو وطن کو چلیں
اے چرخ یہ اپنے حوصلے ہیں — اک دل ہے ہزار آبلے ہیں

کشتہ اک پردہ نشیں کا ہوں فرشتوں سے کہو
میرے تابوت سے دو چار قدم دور رہیں

عکس اپنا آئینے میں دیکھکر کہتا ہے یار
دیکھنے والوں سے [illegible]

بحث تنگی میں دہن کی کیوں ہے کچھ حاصل نہیں
[illegible]

آمد ہے فصلِ گل کی جلدی اسیر آ کے چھیڑو
[illegible]

تڑپے کس طرح یار قاتل ہے
[illegible]

محشر میں بھی دیوانوں کو پوچھا نہ کسی نے
آگے کی خدا جانے ابھی تک تو بچے ہیں

دیکھا ہے کسی راہ میں ہم نے کہ نہیں ہوش
گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں گھر بھول گئے ہیں

ساقی میں تری نرگسِ میگون کا مست ہوں
توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں

خُم کے خُم صاف جو کر جاتے تھے دو باتوں میں
ذکر خیر آجتک اُن کا ہے خراباتوں میں

خطِ طویل یار کو میں نے لکھا مگر — مطلب کو دیکھئے تو کہیں کچھ پتا نہیں
معشوق ہو حسین کہ ساقی ہو نازنین — دل میں مزہ نہیں تو کسی میں مزا نہیں

وہ مستِ شراب پھر رہے ہیں ہم مفت خراب پھر رہے ہیں

خاک جو لپٹی ہوئی آتی ہے محمل سے تری
ہے یہی مجنوں اب اے محمل نشیں مجنوں کہاں

تم تو میرے سوال کا دیتے نہیں جواب
مجھ سے جو کوئی پوچھے تو میں کیا جواب دوں

عمر کو سارا زمانہ گزران کہتا ہے دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

باغباں تو ہی کسی شاخ پہ بٹھلا دے مجھے
بے پر و بال ہوں میں طاقتِ پرواز نہیں

کھپ گئیں دل میں اگر پلکیں تکیلی زاہدا
سیکڑوں پڑ جائینگے رخنے ترے ایمان میں

کھاتے ہو قسم نہیں میں عاشق صورت تو ذرا میرا اپنی دیکھو

جگاتا ہوں میں کب سے تم ذرا کروٹ نہیں لیتے
اُٹھو اے خفتگانِ خاک کیسی نیند سوتے ہو

فصلِ گل آنے سے پہلے پھنس گئے ہم دام میں
ہائے کیا کیا دل میں تھی سیرِ چمن کی آرزو

آہ کس حسرت سے لیلیٰ نے کہا ہنگامِ نزع
سونپے جاتی ہوں تجھے اے بیکسی میں قیس کو

لبِ جاں بخش سے اپنے ذرا تم کبھی ہم مرنے والوں کو بھی پوچھو

کون سمجھائے جفا پیشہ دل آزاروں کو
اک نظر دیکھ تو لو آنکھوں کے بیماروں کو
بگڑ کر اسنے کہا بعد ذبح کشتوں سے
تڑپ تڑپ کے لہو میں ڈبو دیا مجھکو
نمک بھی تو زخموں پہ چھڑکو ذرا
دم ذبح لب پر تبسم بھی ہو
تقویٰ کہاں کا جام چلے آج زاہدو
خرقے اتار اتار کے بھٹی میں جھونک دو
وصل کی شب انھیں شرم آتی ہے ہم حسینوں سے
دستے نرگس کے جو ہیں انکو کنارے رکھدو
زخم سلوانے کی یار وابھی جلدی کیا ہے
پہلے کچھ میرے تڑپنے کی تو تدبیر کرو
بسملوں پر رحم کھا کر اس نے کھینچی ہے قضا
ان گنہگاروں کے حق میں جلد کچھ ارشاد ہو
آئے جو زباں پہ شکوۂ یار
ہم کاٹ کے پھینکدیں زباں کو

اُس سے تنہائی میں تو لپٹا ہوں
ڈر ہے چھپا گل کہیں پکار نہ دے
کھلتا نہیں کہ اس کے کوچے کا کیا پتا ہے
میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھ سے پوچھتا ہے
دیکھتی ہیں جب اسے آنکھیں تو کہتا ہے یہ دل
دیکھئے یہ دکھا کیا کیا دکھاتا ہے مجھے

بسملوں سے بھی نازاٹھوائے　　ہائے انداز میرے قاتل کے

اک مست کا خیال جو ہنگام خواب ہے　　جھونکوں میں نیند کے مجھے کیف شراب ہے

آسان نہیں ہے دام سے دنیا کے چھوٹنا
یہ اک بڑے حکیم کا باندھا طلسم ہے

جوبن ابھار پر ہے چمن کو نہ جائیے　　بادِ صبا لگائے گی چوری انار کی

میں خار ہوں اے برق جلاتی ہے مجھے کیا
گلچیں ہیں ہزاروں کسی گلچیں کو جلا دے

کیا رسے اس چمن میں افسردگی بڑی ہے
ہر شاخِ گل کے نیچے بلبل مری پڑی ہے

نہ واعظ ہجو مے کر ایکدن دنیا سے جانا ہے
ارے منہ ساقیٔ کوثر کو بھی آخر دکھانا ہے

نخچیروں نے یہ لختِ جگر اس میں پردئے
جو تیر ہے سفاک کا پھولوں کی چھڑی ہے

آبنی جان پر قیامت ہے　　آج پہلو سے دل کی رخصت ہے

مژگانِ تر سے جان تسلی سی پا گئی
کانٹوں کی اوس پیاس ہماری بجھا گئی

دامنِ گل نسیم چاک کرے　　بلبلو تم کو کچھ بھی غیرت ہے

ہوں وہ بلبل جب مرے دل کی کلی مرجھا گئی
اک سرے سے سارے پھولوں پر اداسی چھا گئی

جاں نثاروں کا اسقدر ہے ہجوم — تیغ مقتل میں چل نہیں سکتی
زور ہے اب یہ ناتوانی کا — دل سے حسرت نکل نہیں سکتی

ہے قصد کہ دل کعبہ نشینوں کے چرائے
تاکا ہے بڑے گھر کو ترے دزدِ حنا نے

خط مرا پھینک کے مجھ پر یہ کہا قاصد نے
وہ بھی ہو آپ پہ عاشق تو یہ کھرّا دیکھے

کسی درماندہ و حسرت زدہ کو یاد کرتا ہے
سنو اے قافلے والو جرس فریاد کرتا ہے

ہوئے جو ذبح بڑے پیچ و تاب سے چھوٹے
تمہیں ثواب ہوا ہم عذاب سے چھوٹے

پھر نہ کہنا امیر کو لاؤ — اب وہ تیری گلی سے جاتا ہے

محفلِ عیش ہو یا مجلسِ غم دونوں میں
شمع کو روتے پتنگوں کو تڑپتے گزری

میں تو روتا ہوں اپنی قسمت کو — تو بتا ابر کس کو روتا ہے

رہا جاتا نہیں بے عشق دو دن — ہمیں بیمار ہونے کا مرض ہے

ہجر کا دن نہیں ہے داخلِ عمر — عمر تو وصل تک تمام ہوئی

یہ دن فراق کا کیوں دیکھتے ہمیں چوکے
شبِ وصال کے ہمراہ ہو لیے ہوتے

اک ذرا پردۂ محمل کو اٹھا دے لیلیٰ — پھر کوئی حالتِ بیتابیٔ مجنوں دیکھے

فرقت میں میہمانیِ غم کیا کروں امیر ٹکڑے ہیں کچھ جگر کے سو وہ بھی جلے ہوے

نہیں اڑتے ہیں پتّے آے جنوں اشجارِ گلشن کے
یہ کچھ پرزے گریباں کے ہیں کچھ پرزے ہیں دامن کے

کہا مجنوں نے شاید ناقۂ لیلیٰ ادھر آئے
میں اس امید پر چنتا ہوں کانٹے اس بیاباں کے

پی کے مے بیٹھے وعظ سننے امیر یہ بڑی تم سے ہوشیاری کی

جو ہوش میں ہیں مجھے لاتے ہے دوستو منظور
کہو کہ تجھکو ترے یار نے بلایا ہے

کرتے ہو جو تم امیر کو قتل اتنا تو کہو گناہ کیا ہے

ابھی امیر کو صاحب بُرا بھلا نہ کہو بُرے بھلے کا تو صحبت سے حال کھلتا ہے

جب کہا میں نے مرے قتل میں اب دیر ہے کیوں
بولے وہ اپنی خوشی آپ کو جلدی کیا ہے

خیر تم پر نہیں ہے زور اپنا مر مٹینگے یہ اختیار تو ہے

یاں زخم سے لذتِ جگر ہے احباب کو فکر بخیہ گر ہے

نہ جانے کے تھے اس گلی سے بہانے نہ اب ضعف ہمکو نہ بے طاقتی ہے

ہو گیا کیا تجھے الفت میں امیر ابھی روتا تھا ابھی ہنستا ہے

دو گھڑی آپ کا ہنس ہنس کے لگاوٹ کرنا
رنج برسوں کا مرے دل سے مٹا دیتا ہے

ہنیرم خشک نے جلکر یہ کہا گلشن میں کہ انہیں تازہ نہالوں میں کبھی ہم بھی تھے

بُت بن گئے ہم امیر آخر — یہ یادِ صنم کی انتہا ہے
کتنے آرام طلب ہیں ہم بھی — سایۂ تیغ میں نیند آتی ہے

حلال کرکے مرے ہم صفیروں کو صیّاد
لہو بھری ہوئی چھریاں مجھے دکھاتا ہے

ہائے غم سے بھی جی نہیں بھرتا — برکت اٹھ گئی زمانے سے

کیا جانیں ہم کہ ہنستا کہتی ہے خلق کسکو
ہمنے جو آنکھ کھولی تو چشم تر ہی دیکھی

میں نے بوسہ جو لیا زُلف کا ساقی نے کہا
صرف مے نوش نہیں یہ تو بلا نوش بھی ہے

مرا زخم دل اس لئے دیکھتے ہیں — کہ دیکھیں تو تلوار کیسی پڑی ہے

کہتا ہے مجھے دیکھکے وہ اپنی گلی میں
دیوانے ترا گھر بھی کہیں ہے کہ نہیں ہے۔

گالیوں کا وصل میں کیا کام ہے — لطفِ بے ہنگام اسی کا نام ہے
مجکو زاہد نہیں شراب حرام — تیسرے دن میسر آئی ہے
خاک میں کسکی ملگئی حسرت — خاک اڑاتی جو صرصر آئی ہے

بڑھجاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

طُرفہ اقبال تو نکا ہے کہ باایں ہمہ ظلم
جسطرف ہوکے نکلتے ہیں دعا ملتی ہے

یادیں زلف و رخ کی میرا حال
صبح کو کچھ ہے شام کو کچھ ہے
اے طولِ زمانۂ اسیری
بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے

سوتا ہوں کوئے یار میں محشر کے دن مجھے
جھونکے نسیم خلد کے آ کر جگا سینگے

میں نے کہا کہ پھیر دو دل کیا کرو گے تم
بولے ہم اپنے تیر کا پیکاں بنا ئینگے

وہ غصے میں ہر وقت بھرے رہتے ہیں مجھ سے
میں خوش ہوں کہ صد شکر توجہ تو ادھر ہے

آئی بہار چل کے رفوگر کو چھیڑئے
ہنس ہنسکے چاک جیب کے ٹانکے ادھیڑیئے

تھی اپنی جانماز تو مدت سے رہن مے
تسبیح رہ گئی تھی سو وہ اب گرو ہو گئی

ہوں وہ حسرت زدہ کہ در پہ مرے
یاس امید دار بیٹھی ہے

امیر اس بدگماں کے کان تک پہنچے تو پھر کیا ہو
بھری مجلس میں کہتے ہو کہ ہم خالی نہیں رہتے

جھک کے ملنے لگا وہ بت ہم سے
کیا تری شان کبریائی ہے

تیشے سے کوہکن کے آواز آرہی ہے
شیریں کے دل پر الفت جو یں لگا ہی ہے

مجنوں سے کوئی کہہ دے لیلیٰ غریب کب سے
زانو پہ سر کو رکھے آنسو بہا رہی ہے

وہ جلوہ دیکھکر جب طور پر موسیٰ کو غش آیا
تو آئی غیب سے آواز دیکھا ہم نہ کہتے تھے

جان جائے تو جائے پر آجاں
دل کہاں تم کو چھوڑ کر جائے

غیر کے ساتھ وفا کرکے وہ مجھ سے بولے
تو جفا دوست ہے اک طرز جفا یہ بھی ہے

نہ سمجھے تھے خدا کو جب تلک سمجھے تھے ہم سمجھے
جو سمجھے اب تو یہ سمجھے نہ سمجھے تھے نہ سمجھینگے

ہر نہالِ تاک میں واعظ وہی انداز ہے
کونسی وہ شاخ ہے طوبیٰ کو جس پر ناز ہے

پنہاں جو سوزِ عشق کرے مر رہے وہی
دل پھک گیا مگر نفسِ سرد ہے وہی

امیر اس بت کو دل دیتے ہو کیا شامت تمہاری ہے
کسی پتھر پہ دے پٹکو جو ایسا تمکو بھاری ہے

ہزار ہوں حسن آدمی میں ہزار ہوں خوبیاں پری مین
امیر اپنا تو ہے یہ مشرب ادا نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے

دیکھنا قاتل کو ہے تو دیکھ لے
دیکھ بسمل وقت فرصت تنگ ہے

آتا ہے خون اب مری آنکھوں سے ہمدمو
آنسو کہاں یہ آنسوؤں کا کچھ نچوڑ ہے

قاضی آئے کہ محتسب آئے
اب تو ہم میکدے میں آ بیٹھے

اُلفت کسی کی نوکِ مژہ سے جو تھی امیرؔ
مر کر بھی اک کھٹک سی رگِ جاں میں رہ گئی

ہوش جب تک رہا شراب ہی پی ایک ہیں ہم بھی اپنے مشرب کے

تم دکھاتے تو ہو امیرؔ کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

چلے آتے ہیں ہم بھی تیرے پیچھے تجھے اے عمرِ رفتہ کچھ خبر ہے

تو کھینچے گا اُس کی شکل مانی تو نے کہی اور میں نے مانی

چھیڑ دوں اپنی اسیری کی کہانی نہ کہیں
منہ لگاتا نہیں اس خوف سے صیّاد مجھے

باقی نہ دل میں کوئی الٰہی ہوس رہے
چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا سو گیا ہے غریب سونے دے

حل نہیں ہوتا معمّا بیقراری کا مری دل تو پہلو میں نہیں یارب تڑپتا کون ہے

پا چکے چین تہِ خاک بھی ہم کشتۂ عشق
دلِ بیتاب کو اللہ سلامت رکھے

نامہ بر یار کے آنے کی نہیں کہتا ہے
ایک بھی بات ٹھکانے کی نہیں کہتا ہے

مجھکو نہیں شکایت مقتل میں اب کسی کی
پیکاں نے دلدہی کی خنجر نے ہمدمی کی

تیغِ قاتل نے تو ارمان نکالے کچھ کچھ اب رہی خنجرِ قاتل سے شکایت باقی

قاتل مرے سوا نہ کرے تو کسی کو قتل
اللہ تیرے ہاتھ کو پائے ثبات دے

آزردگی کے خوف سے جس جا نہ رو سکے
ایسی جگہ امیر سے کیا خاک ہو سکے

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم
ہوتا کچھ اگر ہوش تو مےخانے نہ جاتے

امیر اک ذرا دیکھے بھالے ہوئے
محبت میں دل کو سنبھالے ہوئے

کس شرم بھری آنکھ کی ہے فکر الٰہی
جو سر مجھے زانو سے اٹھانے نہیں دیتی

میری نہیں تقصیر تری حسرتِ دیدار
دروازے سے تیرے مجھے جانے نہیں دیتی

ہوں میں بیمار محبت کوئی مجرم تو نہیں
میرے گھر پر ہے طبیبوں کی چڑھائی کیسی

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبطِ آہ سے
حسرت ٹپک رہی ہے ہماری نگاہ سے

کہا اس نے یہ مجھکو ذبح کر کے
تڑپنے دو یہ حسرت بھی نہ رہ جائے

جو بیقراریِ دل اب ہے گر یہی ہوتی
تو آجتک مری کاہےکو زندگی ہوتی

آجتک گور میں لیلی کو نہیں صبر و قرار
میرے مجنوں مرے مجنوں کی صدا آتی ہے

بڑا کریم ہے زاہد وہ بخش ہی دیگا
بساط کیا ہے ہم ایسے گناہ گاروں کی

فصل گل آئی ہے یوں ہم تھ ملیں اے گلبدن
جیسے کلیاں نکلی ہیں شاخوں میں سر جوڑے ہوے

بت میں نہ دغا کی بات پائی
بے عیب خدا کی ذات پائی

درد بلبل خدا نہ سنوائے
ہائے گل کی صدا نہ سنوائے

مجلس وعظ میں آتا تو نہ ممکن تھا امیر
ہمکو تھامے ہوے یاں دست سبو لایا ہے

میں تو سب اپنے کام خدا ہی کو سونپ دوں
لیکن یہ خوف ہے کہ خدا بے نیاز ہے

بیٹھے جو میرے سینے پہ خنجر وہ کھینچکر
سمجھا میں آئے ہیں مرے ارماں نکالنے

بے خودی یار کا پتا دیگی
بے نشانی نشاں بتا دیگی

کیا مجھی کو دیکھ کر حیرت ہوئی
دیکھو آئینے کی کیا صورت ہوئی

چڑھکے منبر پہ ہیچ ہے واعظ
اور جو ہسن سے کوئی خراباتی

آنسو تو بہاتا ہوں مگر ڈر ہے یہ مجھ کو
دہو جائے نہ تن سے کہیں خاک اُسکی گلی کی

وصل کی شکل سے کوئی راہ تو نکلے صیاد
بیچ ہی ڈال مجھے ہاتھ کسی گلچیں کے

درد دل کہیے تو کہتا ہے وہ شوخ
ایک ہی تم کو کہانی یاد ہے

مشتاق بوے زلف رسا کا دماغ ہے
تیرا بھی اے امیر بلا کا دماغ ہے

شریک درد نہیں کوئی بڑھکے آنکھوں سے
کہ ایک روتی ہے جب دوسری بھی روتی ہے

آستیں یار نے چڑھائی ہے — وقت تقدیر آزمائی ہے

کس نگہ سے تم نے دیکھا تھا امیر — روتے روتے ان کو ہچکی لگ گئی

کہا جب اے صنم جلوہ دکھا دے — تو وہ بولا کہ یہ دولت خدا دے

پوچھا نہ جنس دل کو بازار میں کسی نے — سو بار لیگئے ہم سو بار پھیر لائے

راتوں کو کہا کرتا ہے بلبل سے یہ صیاد — ظالم تری فریاد تو سونے نہیں دیتی

چھڑک کر میرے زخموں پہ نمک قاتل یہ کہتا ہے — نمک سے پاٹ دونگا آج میرا دل یہ کہتا ہے

لگاؤں دم سے تلوار وہ قاتل یہ کہتا ہے — لپٹ جاؤں میں جوہر بنکے میرا دل یہ کہتا ہے

زبان شمع کہتی ہے کہ میں تجکو جلا دونگی — میں کب ٹلتا ہوں پروانہ سر محفل یہ کہتا ہے

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگذشت کون سنے

سمجھا نہ میں تو حضرت ناصح کی ایک بات — کچھ خود ہی وہ کہا کئے خود ہی سنا کئے

جب کہا میں نے تو کیوں مجھے کرتی ہو شہید — ہنسکے کہنے لگے للہ بھی اک کام سہی

اسکی پروا مجھے نہیں تکلیف یا آرام ہے — اے غم جانان مجھے تیری خوشی سے کام ہے

نجد میں گھبرا کے جا نکلے جو ہم — قیس بولا پیر و مرشد خیر ہے

آپ ہی تم امیر کھوئے گئے — یار کی جستجو کو نکلے تھے ..

کیا اس بت نے قتل الحمد للہ — یہی تو ہم خدا سے چاہتے تھے

ترے در تک تو لایا ہے ہمیں شوق — یہاں سے گھر تلک اب کون لیجائے

پھر تو نے امیر اس سے کی بات — سو باتیں ابھی سنا چکا ہے

انسان جو چاہے کہ نہ ہو اسکو کبھی رنج — زنہار کسی سے کوئی امید نہ رکھے

یہ دل نے کنج قناعت سے آشنائی کی — کہ ہاتھ اٹھا کے دعائے شکستہ پائی کی

دیکھا خزاں میں ہمنے بلبل کے آشیاں کو
دو چار پر شکستہ دو چار استخواں تھے

پہنچے جو ہم عدم کو اہلِ عدم یہ بولے
مدت کے بعد آئے اتنے دنوں کہاں تھے

میں نہ کہتا تھا فغاں کی مجھ سے فرمائش نکر
باغباں سب پھول مرجھا کر چمن میں رہ گئے

جو وہاں جاتا ہے پھر اسکی خبر ملتی نہیں
نامہ بر کے واسطے بھی نامہ بر درکار ہے

منہ دیکھتے ہیں مقتل میں اجل کا ترے ہوتے
اے خنجرِ قاتل تجھے غیرت نہیں آتی

چھانتا ہوں تری گلی کی خاک
دل مرا ہے یہیں ملے نہ ملے

کوئی دم بے تکلف ہو کے مستو میں اگر بیٹھے
تو جو کچھ عرش پر ہی دیکھلے زاہد وہ گھر بیٹھے

مرآۃ الغیب اور گوہر انتخاب کا انتخاب ناظرین کی نظر سے گذر چکا اور یہ بھی دیکھ لیا گیا کہ ان میں کیسے کیسے مضامین بلند و برتر اور کیسے کیسے نشتر و خنجر ہیں اور یہ چوٹی کے اشعار دو چار نہیں بلکہ آٹھ سو سے زائد ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دوسرا دیوان جس کا نام صنمخانۂ عشق ہے کس پایہ کا ہوگا۔ ع

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

صنمخانۂ عشق کی جیسی مقبولیت ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ارباب سخن کا اس پر اتفاق ہے کہ امیر جیسے جیسے مسن ہوتے گئے انکی شاعری جوان ہوتی گئی بمصداق۔ ع۔

ہم پیر جب ہوئے تو طبیعت جواں ہوئی

اگرچہ امیر کی ہمہ گیر طبیعت تغزل میں گوناگوں مذاق کی جامع تھی مگر انکا اپنا خاص رنگ جو فطرتاً تھا یہ تھا کہ مضمون واشگافتہ ہو - نیا ہو - نازک ہو اور زبان کے سانچے میں ڈھلا ہو مثلاً ذیل کے اشعار -

لذت جو ملی مرے لہو کی | خنجر نے بلائیں لیں گلو کی
کی جب پہ نگاہ تجھ کو دیکھا | اب تک تو تلاش کی نہ تو کی
ساقی نے سنگھائی غش میں مٹی | سوندھی سوندھی مجھے سبو کی
تھا چار طرف اُسی کا جلوہ | کیوں لاش ہماری قبلہ رو کی
پلکیں دم جوشش خونفشانی | دھاریں نظر آتی ہیں لہو کی
دل ہی نہ رہا امید کیسی | جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی
اب کیوں ہیں کلیم غش میں خاموش | پہلے نہ سنبھل کے گفتگو کی
کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ | ق | خود دید کی اپنی آرزو کی
تھا پردۂ ظاہری جو منظور | آواز بدل کے گفتگو کی
کلفت نہ مٹی امیر دل سے | اشکوں نے ہزار شست و شو کی

یہ اُس زمانے کی غزل ہے جب امیر مرحوم حضرت اسیر کے شاگرد ہوئے تھے -

مرے ہی سامنے دامن اُٹھا کر ناز سے چلنا | مجھی سے پھر گلہ اُلٹا مرے چاک گریباں کا
جنوں کا جوش گھٹا تھا کہ فصل گل آئی | سمند ہوش رکا تھا کہ تازیانہ ہوا
شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو | کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا
سُنا کسی سے جو نام دوائے درد جگر | تڑپ کے دل نے صدا دی کہ ہائے درد جگر

جو ہے بہار اسکو خزاں کا خطا بھی ہے
اے باغباں بسنت کی تجھکو خبر بھی ہے

پھبتی وہ کاٹ کے جو نخلِ تمنا کی بہار
پھول کم بخت میں آ کر نہ کبھی پھل آئے

مجھ مست کو مے کی بو بہت ہے
دیوانے کو ایک ہو بہت ہے

دل کو ظفر نگہ نہ ناچتا لے آئے
تیر بھی آئے تو لے پر کی اڑاتے آئی

وا حسرتا کہ نہ گیا قاتل کا
بچ گیا میں تو قضا لوٹ گئی

ہنس پڑے آپ تو بجلی تڑپی
بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی

ہم اگر قتل ہوئے خیر یہ تقدیر اپنی
آپ بدنام ہوں کیوں تیغ و شمشیر اپنی

جب خوب رو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں
کہتا ہے حسن میں نہ رہونگا حجاب میں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

آنکھ مجھ سے دل ملے اغیار سے
یار درگزرا میں لیسے پیار سے

زمانہ ہو گیا مدہوش چشم مست دلبر سے
تماشا ہے چھلکی محفل کی محفل ایک ساغر سے

امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
مزار ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر
کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

نرگس کو صبا نہ چھیڑ اتنا
سونے دے غریب سو رہی ہے

مرے جنازے پہ اب آتے شرم آتی ہے
حلال کرنے کو بیٹھے تھے جب حجاب نہ تھا

لحاظ ہم سے نہ قاتل کا ہو سکا دم قتل
سنبھل سنبھل کے تڑپتے وہ اضطراب نہ تھا

دم منتے بیٹھے جو دے بیٹھے قتل عام کا حکم
ہنسی تھی انکی کسی پر کوئی عتاب نہ تھا

جب کہا میں نے شبِ غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا

کیا بلا تھی نگہِ ہوشربا ساقی کی
اٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا

جوشِ وحشت اسی کہتے ہیں کہ آتے ہی بہار
ہاتھ ڈالا تو گریباں میں کوئی تار نہ تھا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہگار ہوں میں
اس گنہ پہ مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

بہار آئی عجب حالت ہے ان دنوں ہر دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقارِ عنادل کی

سرِ مرقد کو ٹھکرانے قیامت بنکے آتے ہیں
پڑا ہوں میں یہاں آ کر تو یوں مجھکو ستاتے ہیں

وہ مست جب کبھی گزرا ہے میکدے کی طرف
چھلک کے دستِ سبو جا پڑا ہے ساغر پر

اے صبر میں تو تو نہیں قافلۂ الوں سے جدا
تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا

تو نے تو اے سیاہیِ شب ہلے تا ہجر
دھبا لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

ہما و آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں
تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ڈوبی ہوئی لہو میں نظر آئیں کیوں نہ گل
سینچے ہوئے مری مژۂ خونفشاں کے ہیں

خنجر کو چوم چوم کے کہتے ہیں میرے زخم
ظالم مزے بھرے ہوئے تجھ میں کہاں کے ہیں

کسکے کوچے سے یہ آتے ہیں ہوا کے جھونکے
کہ مری شمعِ لحد روز بجھا جاتے ہیں

واہ اے بیخودیِ شوق کیا خوب سلوک
اسکو جب ڈھونڈ نکالا تو کیا گم مجکو

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

شکوہ جو کیا درد کا تلوار نکالی
خوب اُسنے دوائے دلِ بیمار نکالی

طرزِ رفتار سے مارا ہے تو پامال بھی کر
دیکھ قاتل یہ بڑی چال رہی جاتی ہے

گنا ہگاروں کا چور نگ کھیل ہے اُنکا
ادھر ادھر گئے دو چار ہاتھ مار آئے

اِس رنگ کے اشعار سے دیوان مراۃ الغیب بھرا پڑا ہے کہاں تک نقل کیے جائیں اور گو ہر انتخاب کے تو کل اشعار اسی رنگ کے ہیں جنکی تعداد نو سو گیارہ ہے ۔

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ جب نواب کلب علیخاں والی رامپور نے امیر کی شاعری پر نظرِ غائر ڈالی تو اسی رنگ کے دلدادہ ہو گئے اور کیونکر نہ ہوتے۔ یہ رنگ تو شاعری کی جان ہے۔

قاعدہ ہے کہ جو فرمانروا شاعری کا ذوق رکھتا ہے وہ اپنے ذوق کے اعتبار سے ایک رنگِ سخن قایم کر دیتا ہے اور وہی رنگ اُسکے دربار کا مذاقِ شاعری قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ دربارِ رامپور میں سکۂ رائج الوقت یہی گوہر اُنکا رمان لیے گئے تھے۔ اور آج بھی نواب صاحب حال با لقابہ حضرت امیر کے خلفِ اکبر جناب صریر کے شاگرد ہیں اور اسی رنگ کو پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنمخانۂ عشق جو صرف رام پور کی گویائی کا نتیجہ ہے اول سے آخر تک ایک رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے اور وہ وہی رنگ ہے جسکے امیر مُوجد تھے۔

صنمخانۂ عشق دیکھکے حیرت ہوتی ہے کہ بول چال کی زمینوں میں بھی جن میں روز مرہ کے سوا کسی مضمون کی گنجائش نہ تھی حضرت امیر نے وہی جدّت طرازی کی ہے جو اُنکی طبعِ معنی آفریں کا خاصہ ہے۔ اس سے بڑھکر قادر الکلامی کیا ہو سکتی ہے۔ اور ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ زبان کی اصلاح جو لکھنؤ میں ناسخ کی کوشش سے ہوئی تھی اُس اصلاح میں جو کسر رگئی تھی رام پور میں حضرت امیر کی توجہ سے وہ بھی نکل گئی اور اردو زبان بالکل صاف ہو کر آئینہ ہو گئی۔

اب صنمخانۂ عشق کے اشعار ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ میں کہیں کہیں سے کچھ کچھ نقل کرتا ہوں ورنہ دیوان سراپا انتخاب ہے۔

انتخاب صحیفۂ عاشق

یہ آفتاب ہے گرمِ اُسکی کبریائی کا | ہر ایک ذرہ جو ہے آئینہ خودنمائی کا
دراز عمر ہو مشاطۂ تصور کی | دکھا وصال کا دیتا ہے غم جدائی کا
نگاہِ مست ہے یہ انداز و ناز توبہ شکن | کہاں آئے جو ہے دعویٰ ہو پارسائی کا

میں ترا بدمست ہوں جنت مرا کاشانہ تھا | حوضِ ساقی چشمۂ کوثر مرا پیمانہ تھا
ہم غلط فہمی سے سمجھے قتل کرنے کو عتاب | اور وہاں اک چھیڑ تھی انداز معشوقانہ تھا
یار اُدھر بدمست میں بیخود تکلف برطرف | ایسی صحبت میں جو آتا ہوش کیا دیوانہ تھا
چھپتا پھرتا ہے غم اُسکا مرے سینے میں اب | کیا ہوا وہ جو یہاں ان کا مکاں ویرانہ تھا
جامِ جم کو دیکھتے ہی میں نے پہچانا امیر | میرے ہی خانے کا چھوٹا سا اک پیمانہ تھا

آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا | دروازے سے ہی گھر تک سارا ظہور تیرا

یہ شکوہ بیوفائی کا یہ رونا کج ادائی کا | سزا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا
درازی میں نہیں آتی ہے کچھ روزِ قیامت کی | کہ اک پیوند ہے پیراہنِ روزِ جدائی کا
زمانہ کہتا ہے مختصر تو شاید کہ ہم ہو مجلس | قیامت تو مرا نا حال ہے روزِ جدائی کا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

گردن تنِ بسمل سے جدا ہو گئی کب کی
گردن سے جدا خنجرِ قاتل نہیں ہوتا

دھبا نہیں چھٹتا ہے لہو حسرتِ دل کا
اس خون سے تر دامنِ قاتل نہیں ہوتا

دل مجھ سے لیا ہے تو ذرا بولیے ہنسیے
چپکے ہیں ملنے کیلیے دل نہیں ہوتا

جس بزم میں شمع رخ سے اٹھا دیتے ہیں پردہ
پروانہ وہاں شمع پہ مائل نہیں ہوتا

تیر اس نے لگایا وہ پڑا آ کے جگر پر
بے چین ہے وہ کیا جانے ادھر دل نہیں ہوتا

تم اور کوئی کام امیر اس کو سکھاؤ
تڑپانے تڑپنے کے لیے دل نہیں ہوتا

~~~

کوچۂ قاتل میں اپنا دل گیا
خاک میں ملنے کا رستہ مل گیا

اے گناہِ یاس تیرا ہو برا
گھر تلک روتا ہوا قاتل گیا

مرحلے طے کنجِ عزلت میں کیے
بیٹھے بیٹھے سیکڑوں منزل گیا

~~~

دامنوں کا نہ پتا ہے نہ گریبانوں کا
حشر کہتے ہیں جسے شہر ہے عریانوں کا

موجیں دریا میں جو اٹھتی ہوئی دیکھیں سمجھا
یہ بھی مجمع ہے ترے چاک گریبانوں کا

بیخودی آٹھ پہر گم یہ مجھے رکھتی ہے
دن کو شب رات کو ہو صبح اگیانوں کا

قدرداں چاہیے دیوان ہمارا ہے امیر
منتخب سمجھی دیکھے دیوانوں کا

~~~

سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب
عید کے دن جسکو غربت میں وطن یاد آگیا
~~~

روبرو آئینے کے تو جو مری جان ہوگا
آئینہ ایک طرف عکس بھی حیران ہوگا

ہوں وہ دیوانہ مرے ہاتھ میں روزِ محشر
عوضِ نامۂ اعمال گریباں ہوگا

اک پری رُو نے ہماری یہ بنائی صورت
سیکڑوں پر یونہیں کیا حالِ سلیماں ہوگا

آگ دل میں جو لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
اور کیا تجھ سے بھرا دیدۂ گریاں ہوگا

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دلبر مجھے اختیار ہوتا

ترا میکدہ سلامت ترے خم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اُترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زبان سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

اثر اسقدر تو ہوتا مرے لوٹنے کا اُن پر
کہ وہ کروٹیں ہی لیتے جو میں بیقرار ہوتا

مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشاں تک نہ رکھا
میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا
نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو وہ دل کے پار ہوتا

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

جھونکا ادھر نہ آئے نسیمِ بہار کا
نازک بہت ہے پھول چراغِ مزار کا

عالم وہی ہے سن سے اُتر کر بھی یار کا
جوبن خزاں نے چھین لیا ہی بہار کا

پھر بیٹھے بیٹھے وعدۂ وصل اُس نے کر لیا
پھر اُٹھ کھڑا ہوا وہی روگ انتظار کا

وہ شوخ اپنی راہ ہے یہ اپنی راہ ہے
قابو کا دلربا ہے نہ دل اختیار کا

ساقی کے ہاتھ سے جو گرا جام کھا اٹھا
ٹوٹا وہ دل کہیں کسی امیدوار کا

شاخوں سے برگِ گل نہیں جھڑتے ہیں باغ میں
زیور اتر رہا ہے عروسِ بہار کا

شیشوں نے ہچکیوں کی جھڑی ہی لگائی کیوں
سنبھلے کو ارادہ ہے کس بادہ خوار کا

ہمراہ ہی جو حسرت و ارمان کی بھیڑ بھاڑ
تابوت اٹھا امیرِ غریب الدیار کا

جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

بیدرد جانے والو ٹھہر جاؤ دم تو لو
کچھ تم سے کہتے ہیں لبِ خاموشِ نقشِ پا

ہم بے زبان تھا اک نشینوں کا عیش کیا
تھا اک تبسم لبِ خاموشِ نقشِ پا

ڈرتے ہیں پاؤں رکھتے کہ ایسا نہ ہو کہیں
چپکے سے چوم لیں لبِ خاموشِ نقشِ پا

نازک بہت ہیں پاؤں رکھو آہستہ قدم
چھالے نہ ڈالے گرمیِ آغوشِ نقشِ پا

اے مستِ ناز دیکھ کے رکھ راہ میں قدم
چھلکے کہیں نہ بادۂ سرجوشِ نقشِ پا

اللہ رے شبِ غم کی سیاہی کہ تیرگی
پڑتی ہوئی آتی ہے عمل ردِ بلا کا

خوش ہوں کہ تری کوچے کی راہیں خاک لو لیا
بے مانگے ملا کرتا ہے بوسہ کفِ پا کا

اک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولا جاتا رہا

آنے والا جانے والا بیکسی میں کون تھا | ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا
مجھکو گلیوں میں جو دیکھا چھیڑ کر کہنے لگے | کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا
جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکوے تھے | تم گلے سے مل گئے سارا گلا جاتا رہا
کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر | جانے دو اک بیوفا جاتا رہا جاتا رہا

غنی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا | مگر جو کسی کو دیا لے گیا
بہت تھے اسیرانِ زندانِ ہوش | جنوں آ کے سبکو چھڑا لے گیا

پرسش کو مری کون مرے گھر نہیں آتا | تیور نہیں آتے ہیں کہ چکر نہیں آتا
ڈرتا ہے کہیں آپ نہ پڑ جائے بلائیں | کوچے میں ترے فتنۂ محشر نہیں آتا
جو مجھ پہ گذرتی ہے کبھی دیکھ لے ظالم | پھر دیکھوں کہ رونا تجھے کیونکر نہیں آتا
پھول اسنے کھلائے کہ تو یہ نہ کہو تم | اللہ کے گھر سے ہمیں زیور نہیں آتا
ہنجاتی ہیں چلمن رخِ روشن کی شعاعیں | آتا بھی باہر تو وہ باہر نہیں آتا

کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا | نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا
جوشِ فصلِ بہار میں اے گل | رنگ ہے تیری نوجوانی کا
مثلِ شبنم ہماری قسمت میں | ایک دانہ ہے وہ بھی پانی کا
زیست کا اعتبار کیا ہے امیر | آدمی بلبلا ہے پانی کا

آہوں سے سوزِ عشق مٹایا نہ جائیگا — آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا
لاکھوں کو خاک میں تو ملا دیگا آسماں — ظالم سے دو دلوں کو ملایا نہ جائیگا

مستی اُن آنکھوں کی آتی ہے تو کہتا ہے حجاب — دیکھ تو آئی تو میں گھر سے نکل جاؤنگا

دمِ اخیر ہے لازم نظارہ کر لینا — خدا سے کام پڑا ہے بتو خبر لینا
حریم کوچۂ قاتل کی راہ گر لینا — سمندِ عمر سے او شہسوار اُتر لینا
پڑا ہے دیر سے مٹی خراب ہوتی ہے — لگا دو ہاتھ جنازے کو پھر سنور لینا
وہ مسکرا کے مرے چھیڑنے کو کہتے ہیں — کہاں چمک کے یہ بجلی گری خبر لینا

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا — درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا
کہتے ہیں کیا میں کروں سنکے فسانہ دل کا — وہی جھگڑا وہی دکھڑا ہے پرانا دل کا
آفریں کہتے ہی رک جاتا ہے قاتل میرا — لذتِ قتل گھٹاتا ہے بڑھانا دل کا
آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا — آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

کیا میں اے پردہ نشین قتل کا خواہاں ہوتا — شرم آتی تجھے خنجر بھی جو عریاں ہوتا

ہم سے دل دردِ محبت کا اُٹھایا نہ گیا — زخم کھایا کئے ٹانکا کبھی کھایا نہ گیا
نبض کی چال سکھائی تپش دل نے مجھے — عمر چلتے ہوئے گزری کہیں آیا نہ گیا

قیس کی خاک اڑانے کو ہوا آئی ہی تھی | پردۂ محمل لیلیٰ کو اٹھایا نہ گیا

جب میں کہتا ہوں نہ جھگڑا سر گردن کا تھا | تیغ کھینچی ہے مجھے بیچ میں ڈالا ہوتا
ایسا الفت جنوں میں ہیں دہکا نہیں | کوئی ... کا تھا کوئی تھاما ہوتا
... ان کو گرایا تو تلف کیا پایا | کسی کے ... کو سنبھالا ہوتا
حسن بے پردہ سر طور پکارا آکر | پھینکتے جب ہم کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا
لطف ... کی نگاہوں کا تو جب تھا کہ پھر | ان نگاہوں کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

اٹھ کے اس محفل سے گھبراہٹ کا احساں رہ گیا | زانوی جاناں کے نیچے دب کے داماں رہ گیا
دیدۂ بسمل پہ حیرانی نے پٹی باندھ دی | مرتے دم نظارۂ قاتل کا ارماں رہ گیا
پردہ پوشی تو بہت کی زخم دامن دار نے | خنجر قاتل مگر عریاں کا عریاں رہ گیا

جب دیکھتی ہیں ابر کے ٹکڑے ہیں ہم مست | جاتا ہے یہ اڑتا ہوا میخانہ کسی کا
بدلی ہے کہ میخانہ ہے بجلی ہے کہ مے ہے | یہ رعد ہے یا نعرۂ مستانہ کسی کا

رقیبوں سے وہ خوش ہیں رقیب ان سے راضی | برا کہلے میں کیوں ہوں دشمن کسی کا
چمکتی نہیں ابر سے برق تاباں | لٹکتا ہے پردے سے دامن کسی کا
ادھر بھی کرم اے نسیم بہاری | ترستا ہے پھولوں کو مدفن کسی کا

حسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی رنگا دو ۔ جسقدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

شوق خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا ۔ آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا

شفق شام نہیں ہے۔ یہ مرے ماتم میں ۔ منھ کو آیا ہے کلیجا شب تنہائی کا

آئینہ دیکھ کے آتے ہیں مزے ہیں ایسے ۔ خود وہ منھ چومتے ہیں اپنی تماشائی کا

پیاس انکی جو بجھیگی تو مری کوثر سے ۔ ظرف عالی ہے امیر اس مہ زیبائی کا

صیاد کچھ تو پاس ہے لازم غریب کا ۔ لٹکا دے شاخ گل سے قفس عندلیب کا

عشاق کی خزاں ہے معشوق کی بہار ۔ تازہ ہے روے گل کو لہو عندلیب کا

عیش میں سوختہ بختوں کو ہے اندوہ نصیب ۔ شمع کو محفل شادی میں بھی روتے دیکھا

ہر صبح کو یہ شور ہے مرغ سحری کا ۔ چونکو کہ زمانہ نہ رہا بے خبری کا

وعدہ آنے کا جو فرمائیے گا ۔ جیسے آج آئے تھے کل آئیے گا

سب کی نظروں پہ نہ چڑھیے اتنا ۔ دیکھئے دل سے اتر جائیے گا

ہاتھ میں نے جو بڑھایا تو کہا ۔ بس بہت پاؤں نہ پھیلائیے گا

تم اپنی اٹھتی جوانی کی شوخیاں دیکھو ۔ ابھر ابھر کے بڑھاتی ہے ولولہ دل کا

بدل کے یار نے چتون مٹا دی جھگڑ کر — نہ میں رہا نہ رہا دل نہ وہ گلہ دل کا

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

ای برق حسن یار یہ اچھا ظہور تھا — دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

ای شور حشر قہر کیا کیوں جگا دیا — گوشہ مزار کا مجھے آغوش حور تھا

فرقت میں کیوں نہ تھا کسی کروٹ مجھے قرار — کیا دونوں پہلووں میں دل ناصبور تھا

صورت تری دکھا کے کہونگا یہ روز حشر — آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

وہ شوخ آنکھ شوخ نگہ شوخ تھی مگر — سب کا جواب ایک دل ناصبور تھا

سو شعر ایک جلسے میں کہتے تھے ہم امیر — جبتک نہ شعر کہنے میں ہمکو شعور تھا

یاں تو ہی دل میں کھٹک اور وہ فرماتے ہیں — سچ کہو تم یہ چرالائے ہو پیکاں کس کا

جب ہوا وعدہ اور وفا نہ ہوا — ہو گیا ایک سب ہوا نہ ہوا

کام جاں حسب مدعا نہ ہوا — دل پسا تو مگر حنا نہ ہوا

خامشی میں بھی کیا حلاوت ہے — کہ کبھی لب سے لب جدا نہ ہوا

داغ و سوز تو ہوا اے درد — تو کسی درد کی دوا نہ ہوا

بیوفائی کو تیری لگتا داغ — وعدہ اچھا ہوا وفا نہ ہوا

صورت لالہ اس چمن میں امیر — داغ دل سے مرے جدا نہ ہوا

اے فلک یہ رُت یہ متوالی گھٹا — اب تو راتیں ہجر کی کالی گھٹا
تم بھی جوڑا کھولدو وہ آ گئی — بال کھولے گیسوؤں والی گھٹا
گل نہیں بوئے چمن میں لائی ہے — میکشوں کی نذر کو ڈالی گھٹا
آپ اچھے وقت پر آئے امیر — خوب میخانے پہ جب چھائی گھٹا

تکا کرتی ہے چاند سا منھ کسی کا — ستارہ ہے چمکا ہوا آرسی کا
قضا نے کچھ اس ناز سے جان مانگی — کہ یاد آ گیا مجھکو غمزہ کسی کا

ہو جائیگا ای شیخ مرا دامنِ تر خشک — میدانِ قیامت میں پڑیگی جو کڑی دھوپ
برسات میں کھلاؤ کبھی رُخ کبھی گیسو — دو چار گھڑی سایہ ہو دو چار گھڑی دھوپ

نہ راستی کا نشاں سرو میں نہ گل میں ہے بو — بدل گئی چمنِ روزگار کی صورت

پردے سے جو اُس حور نے دیکھا ہی ادھر آج — آنکھونکو مری چبھتی ہے میری نظر آج
غیروں سے کبھی ہے کبھی مجھ سے ہی لگاوٹ — بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج
آنکھیں مری نشے سے نہیں سرخ ہیں زاہد — کچھ کچھ چھلک آیا ہے ادھر خونِ جگر آج

حیف کہ رستے میں مجھے ہم سفر چھوڑ گئے نقشِ قدم کی طرح

تو یہ وصل ستاتی ہے دل کے داغوں کو بہار لوٹتی ہے باغ کو خزاں کی طرح
یہ میکدہ ہے کہ کوئی طلسم ہے ساقی جو آئے پیر کی صورت گئے جواں کی طرح

یہ جھاگ پڑا جہاں میں دریا بہا دیا ساقی تجھے ہے ہمتِ دستِ سبو پسند
زاہد کو گریہ وقت عبادت ضرور ہے اللہ کو نماز نہیں بے وضو پسند
تعریف دوستوں کی نہیں معتبر امیر اچھا ہے وہ کلام کرے جو عدو پسند

یارب پڑی ہے کس رخِ پر نور پر نظر ہوتے نہیں جو دیدۂ خورشید و ماہ بند

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر سر فروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کوہکن کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں ہے جو عاشق دل معشوق میں گھر پیدا کر
رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا نکہت گل کی طرح شوق سفر پیدا کر
قطرۂ اشک ہے گوہرِ گوشِ جاناں آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر

کونسی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
میرے ہی دل پہ گرے کاش یہ بجلی بنکر اے فلک آہ میں اتنا تو اثر پیدا کر

حال کیا پوچھتے ہو میرے دل پرخون کا دیکھ لو بادۂ گلرنگ سے مینا بھر کر
عطر تحفے میں نہ بھیجو مجھے بھیجو کسی دن شیشیوں میں گل عارض کا پسینا بھر کر

آمادہ وہ مژگاں ہیں ناوک فگنی پر منہ تیروں کا بسے گا غزال ختنی پہ
ساتھ اپنے جو لیجائیں مجھے بھی وہ سفر میں قربان وطن ایسی غریب الوطنی پہ

بیکاری سے جی بھرتا نہیں پر شرم آتی ہے کہاں تک بوجھ رکھیے کاتب اعمال کے سر پہ

حیا آتی ہے کیا منزل پہ جاؤں کہ کانٹے روکتے ہیں پاؤں پڑ کر
یہ جنگ زرگری در پردہ ہے صلح ملا دیتی ہے دل کو آنکھ لڑ کر

منعم ہے شکر فرض جو سائل ہوں تیرے گرد فانوس سی چاہیے کوئی شمع حیات پر
درکار ہے بہانہ لیے مغفرت امیر تقویٰ پہ منحصر ہے نہ صوم و صلوات پر

بہار لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھینگے چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہ واپسیں ہو کر

مرے پھولوں میں لویں آو چمن صدقے ہو جوبن پر — ملو ہاتھوں میں مہندی خون سبکا میری گردن پر

الٰہی وہ بھی دن آئے کہ میرا ہاتھ محشر ہیں — کبھی جیب کفن پر ہو کبھی قاتل کے دامن پر

شرار آتش دل ہیں کہ قطرے اشک خونیں کے — نظر آتی ہیں کچھ چنگاریاں سی جیب و دامن پر

کدورت کب جگہ پاتی ہے دل میں صاف طینت کے — نہ دیکھا گرد کو جمتے کبھی دریا کے دامن پر

کسی گل پیرہن کی جامہ زیبی رنگ لائی ہے — گریباں آج کل لوٹا ہوا ہے میرے دامن پر

عجب لذت بھری تلوار سے قاتل نے مارا ہے — مرا خون اسکے سر پر اسکا احساں میری گردن پر

وبال معصیت سے پاک ہیں دل صاف ہے جن کا — عذاب بیکشی ہوتا نہیں شیشے کی گردن پر

میں جب لکھتا ہوں اسکو مجھکو تیری شرم نے مارا — تو شوخی سی حیا الزام رکھدیتی ہے چتون پر

...ایسا کیا ویراں اجل نے قصر شاہی کو — کہ آنکھیں رکھ کے روئی بیکسی ایک ایک روزن پر

...ری سفاکیاں پہنچیں یہاں تک — کہ ڈرتی ہے حیات جاوداں تک

...کڑی ہے اسقدر منزل عدم کی — کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک

...پائی گرد نالوں نے اثر کی — زمیں سے خاک چھانی آسماں تک

جو عکس ہو باہر اسے کیونکر کوئی دیکھے — روشن ہے کہ جاتی ہے نظر حد نظر تک

...کیا خوب پر و بال لگائے بلبل — اڑتے ہی پڑگئی صیاد کے پالے بلبل

انھیں درکار ہے اک چلبلا دل　　یہ سنتا تھا کہ بجلی بن گیا دل
اُسے دیکھا تصدق کر دیا دل　　کسیکو کیا مری آنکھیں مرا دل
تری اٹکھیلیوں پر خون اس کا　　چلا اس چال سے تو پس گیا دل
تمھارا ہو نہو اسکی خبر کیا　　ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا دل
تمھیں افسردہ پایا بجھ گیا جی　　تمھیں دیکھا شگفتہ کھل گیا دل
تڑپنے سے ہے روز وصل کیا کام　　یہ تمکو پیار کرتا ہے مرا دل

جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہی وہ اُس سے جا کے کہدینا　　ہمارا حال اے قاصد نہیں تحریر کے قابل
امیر اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لے چل　　یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

ہے حسن سے قدرِ عشق بالا　　گل سے ہے بلند جائے بلبل

جاتا تو اُس کے کوچے میں ہے بار بار دل　　کھائے نہ چوٹ یاس کی امیدوار دل
بزم وصال ہے کہ کوئی صید گاہ ہے　　میرا شکار تم ہو تمھارا شکار دل
جسدم نکل چلا مرے پہلو کو توڑ کر　　رویا لپٹ کے تیر سے بے اختیار دل

گنتا ہے ترے ہجر کی ایک ایک گھڑی دل　　ہے عاشقِ بیتاب کے سینے میں گھڑی دل

جنوں میں پاس یہ پامالیِ ضعیف کا ہے　　کہ پھونک پھونک کے رکھتے ہیں پاؤں خار پہ ہم

(ہم لوٹتے ہیں وہ سو رہے ہیں | کیا ناز و نیاز ہو رہے ہیں)
کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں | دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
دنیا سے الگ جو ہو رہے ہیں | تکیوں میں مزے سے سو رہے ہیں
سوتے ہیں لحد میں سونے والے | جو جاگتے ہیں وہ رو رہے ہیں
ارباب کمال چل بسے سب | تو ہیں کہیں ایک دو رہے ہیں
اے حشر مدینے میں نہ کر شور | چپ چپ سرکار سو رہے ہیں
آئیگی نہ پھر کے عمر رفتہ | ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں
زانو پہ امیر سر کو رکھے | پھر دن گزرے کہ رو رہے ہیں

آنے دے غیر کو آتا ہے اگر خلوت میں | کچھ تری شرم نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف | وہ مجھے دل سے بھلا دیں میں بھلا بھی نہ سکوں
نقشِ ہستی میں ابھی محو کیئے دیتا ہوں | خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

ہائے وہ دن کہ گذر جاتی تھی شب باتوں میں | اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریدار نہیں ہیں | تو سراپا ناز ہے میں ناز بردار نہیں ہوں
حشر میں اتنا کہونگا اس سے میں محرومِ وصل | پاکدامن تو ہے میں کیونکر گنہگار نہیں ہوں

جان پر صدمہ جگر میں درد دل کا حال زار
گھر کا گھر ہاں کس کے پرستار نہیں ہوں

ہائے رے غفلت نہیں ہے آج تک اتنی خبر
کون ہوں مطلوب ہوں کسکے طلبگار نہیں ہوں

وہ کرشمے شان رحمت نے دکھائے روز حشر
شیخ ادھر اسیر جگنو میں بھی گنہگار نہیں ہوں

زاہد کو کافی ہے اتنی بات بخشش کیلئے
اسکو شوق مغفرت ہے میں گنہگار نہیں ہوں

کسطرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیران قفس ہم بھی گرفتار نہیں ہوں

بیگناہ ہو نہیں چلا زاہد جو اسکو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آئیں گنہگار نہیں ہوں

اونچے اونچے مجرموں کی ہوگی پرسش حشر میں
کون پوچھیگا مجھے میں کن گنہگار نہیں ہوں

بیگناہی کا تو دعوی انکے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگار نہیں ہوں

ضبط کرنا دل حسرتیں نہ کہیں
چوٹ لگجا ئیگی کہیں نہ کہیں

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برق تجلی نے راہ میں

اندھیر کر رہی ہے یہ چشم سیاہ میں
شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں

کیا دخل جا سکے کوئی اس جلوہ گاہ میں
غمزہ چھری لئے ہوئے بیٹھا ہے راہ میں

دل ہے تباہ قافلۂ اشک و آہ میں
گھیرا ہے آندھی پانی نے بیکس کو راہ میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

ہم مست مے بھی پیتے ہیں تو کانپتے ہوئے
توبہ پڑی ہوئی ہے ہمارے گناہ میں

قالب میں دل ہے دل میں ہے وہ قدرت اس کی
یوسف گرا ہے لیکے زلیخا کو چاہ میں

وہ دیکھتے ہیں خونِ تمنا جما کے آنکھ
مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ مین

ڈرتا ہوں جذبِ شیخ کا سن سنکے غلغلہ
کھنچ جائے دخترِ رز نہ کہیں خانقاہ مین

آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جسکے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ مین

قدرت خدا کی ہے کہ ملیں خاک میں تو ہم
اور سرمہ گھر کرے تری چشمِ سیاہ مین

تیرے جلال میں بھی مزہ ہے جمال کا
چشمِ کرم چھپی ہے غضب کی نگاہ مین

یہ عکس کسکے چاند سے چہرے کا پڑ گیا
پانی کو ناز ہے کہ ہیں یوسف ہوں چاہ مین

قالب کو بھی قیام نہیں روح کی طرح
منزل چلی ہے ساتھ مسافر کے راہ مین

ہم ہیں سیاہ کار تو رحمت ہے پردہ پوش
مے پیتے ہیں تو سایۂ ابرِ سیاہ مین

اللہ رے رشک جمع نہیں ہوتے دو حسین
روزِ ازل سے پھوٹ ہے خورشید و ماہ مین

آنسو ہمارے دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں وہ
پازیب موتیوں کی ہے پائے نگاہ مین

ای تیغِ ناز ہاتھ جو تو نے اٹھا لیا
لیتا نہیں کوئی مجھے اپنی پناہ مین

آئینہ جب سے دیکھ لیا لوٹ ہی رہا
یوسف مرا ابھر نہ سکا گر کے چاہ مین

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ مین اور آہ آہ مین

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعرِ امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ مین

چلے ساقی ہنسے بولے اگر آئی ہے یاروں میں
دلھن بنکر نہ بیٹھے دخترِ رز بادہ خواروں مین

حقیقت عاشقوں کی مرگ کی ہم سے کوئی پوچھے
بہت جب نیند آئی سو رہے جا کر مزاروں مین

فرشتوں سے کہو اتنی قیامت میں خبر رکھیں
کہیں چھپ چھپ کے زاہد مل نہ جائیں بادہ خواروں میں

جدا ہے دخترِ رز کا نام مہرِ صحبت ہے ای ساقی
پڑی ہے میکشوں میں جو رہی پرہیزگاروں مین

کسی شہید کا ہے رنگِ خون بہار نہیں — کسی [illegible] پہ چراغان ہے لالہ زار نہیں
نہ دو رقیب کو تم داغ اپنی الفت کا — [illegible] زمینِ شور سزاوارِ لالہ زار نہیں

مثلِ تارِ نظر نظر میں نہیں — اس لیے گھر میں ہوں کہ گھر میں نہیں
عجز بندوں کا کیوں پسند نہو — [illegible] خدا کے گھر میں نہیں
دیکھیے تو اسی میں ہے سب کچھ — کون کہتا ہے کچھ بشر میں نہیں

وہ انتظار کسی کا کرے جو آپ میں ہو — ہم ایک عمر سے اپنی ہی راہ دیکھتے ہیں

غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار — مسکرانے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں
اپنے موقع پہ ہر اک چیز بھلی لگتی ہے — کانٹا [illegible] دل کے اچھے جو گریباں میں نہیں

کلیاں یہ سرخ سرخ نہیں لالہ زار میں — مہندی لگی ہے دستِ عروسِ بہار میں

شرم آتی ہے کہ یار کو میں بے وفا کہوں — اچھا کہا ہے جسکو اسے کیا برا کہوں

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں — بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں
وہ گلعذار کہ کھلتے تھے روز پھولوں میں — انھیں کی خاک شرابِ آج ہے بگولوں میں
نظر جو آئے ترے بال بال میں موتی — گمان ہوا کہ حسین جھولتے ہیں جھولوں میں

محمدِ عربی سا کہاں ہے کوئی پیمبر — خدا کے فضل سے سرتاج ہیں سوا لاکھ میں

یہی ہے شرم تو وہ آچکے آغوش میں میرے — چھپا لیتے ہیں آنکھیں چاند ہوتا جو ہالے میں

دل جدا مال جدا جان جدا لیتے ہیں — اپنے سب کام بگڑ کر وہ بنا لیتے ہیں
مجلسِ وعظ میں جب بیٹھتے ہیں ہم میکش — دخترِ رز کو بھی پہلو میں بٹھا لیتے ہیں
جی اکیلے شبِ فرقت میں جو گھبراتا ہے — فتنۂ حشر کو نالوں سے جگا لیتے ہیں
ہو ہی رہتا ہے کسی بت کا نظارہ تا شام — صبح کو اٹھ کے جو ہم نامِ خدا لیتے ہیں

فراقِ یار میں شب ہے کہ دن تمام نہیں — جو اسکی صبح نہیں ہے تو اسکی شام نہیں
ملی ہے دخترِ رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے — جہاد کرکے جو عورت ملے حرام نہیں
یہاں کمال تواضع وہاں کمال غرور — ادھر ہیں سجدے پہ سجدے اُدھر سلام نہیں
گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی لے زاہد — ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں
زمانے بھر میں پڑی ہے پکار حاتم کی — دیا ہے جسنے کہ حاتم کو اُس کا نام نہین
کہا جو میں نے کہ رخ سے کبھی نقاب الٹو — تو ہنسکے بولے کہ منظور قتلِ عام نہیں
جو میکشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو — امیر مسجدِ جامع میں آج امام نہین

کہتا ہے کون آہ میں ذرا بھی اثر نہیں — ہاں دل دکھے کسی کا یہ مدِ نظر نہین
گھر جانے کا ابھی سے ارادہ نہ کیجیے — یہ میرے دردِ دل کی چمک ہے سحر نہین

دریا ہے طرفہ میکدۂ بیخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

دیکھی مجنوں کی شبیہ آج جو تصویر نہیں
ہڈیاں سوکھی سی دو چار تھیں زنجیر نہیں
تیغ پر بارہ جو رکھوائی ہے قاتل نے امیر
عید قرباں کی خوشی پھیلی ہے نخچیر نہیں

جو بوئے گل چمن میں ڈھونڈتے ہیں
مسافر کو وطن میں ڈھونڈتے ہیں
ہمیں اے باغباں غنچوں سے کیا کام
ہم اپنا دل چمن میں ڈھونڈتے ہیں

وحدت و کثرت تو دونوں ہیں اسی کی جلوہ گاہ
پھر جو خلوت میں نہیں ہے انجمن میں کیوں نہیں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں
ترے کرم میں کمی کچھ نہیں کریم ہے تو
مرا قصور ہے جھوٹا امیدوار ہوں میں
پڑا ہے دست اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بے قرار ہوں میں
کچھ آج میں نے نئی پی ہے حضرت واعظ
ازل کا مست پرانا شراب خوار ہوں میں
نگاہ گرم سے مجکو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں
پھر اسکی شان کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہدے گناہگار ہوں میں
جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں
بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

وہ شوخ لاکھ پردوں میں پردہ نشیں نہیں
اور پھر جو دیکھیے تو کہاں ہے کہیں نہیں

گزرا ہوا زمانہ پھر آتا نہیں کبھی
وہ کونسا ہے دم جو دمِ واپسیں نہیں

نقشِ سجود سے درِ دلدار ہے چمن
اک پھول ہی جبیں کا ہے داغِ جبیں نہیں

غش میں پڑے ہیں جلوہ گہِ ناز میں کلیم
تحسیں نہیں سپاس نہیں آفریں نہیں

تو قابلِ سجود ہے اے پیرِ بے نیاز
پر قابلِ سجود کسی کی جبیں نہیں

واعظ کو تم تو دیکھتے ہی ہنس پڑے امیر
باتیں تو ان بزرگ کی تمنے سنیں نہیں

یادِ قاتل میں لہو سے جو ہوئیں تر پلکیں
بن گئیں طائرِ مذبوح کے شہپر پلکیں

اثرِ سوزِ محبت نے دکھایا اعجاز
بہہ گیا آنکھ سے دریا نہ ہوئیں تر پلکیں

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں
صبحِ بہار ہوں جو گریباں دریدہ ہوں

اے اہلِ بزم مجھکو اٹھاؤ نہ بزم سے
شمعِ سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہوں

میں اور جم ہیں پیرِ مغاں دو ترے مرید
لیکن وہ بد عقیدہ ہیں میں خوش عقیدہ ہوں

مجروحِ تیغِ حسن ہوں اک بے خبر نہیں
یوسف کی جلوہ گاہ میں دستِ بریدہ ہوں

اب تک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی
حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہوں

پیدا کیے کی شرمِ الٰہی ضرور ہے
تو آفریدگار ہے میں آفریدہ ہوں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثلِ سرو میں دامن کشیدہ ہوں

دیکھوں کسی کے عیب تو کیا خاک کہہ سکوں
ہاں غم سے آئینے کی طرح آبدیدہ ہوں

بلبل ہوں میں نہ گل ہوں گلستانِ دہر میں
ہاں اک پرِ شکستہ و رنگِ پریدہ ہوں

شگفتگیم اے امیر ملے ہیں مجھے نصیب
گل ہنس پڑے چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

نالہ ذرا کرے تو سمجھ بوجھ کر کرے
بلبل سے کوئی کہدے کہ ہم بھی چمن میں ہیں

تھوڑا سا لطف اور بھی اے پنجۂ جنوں
دو چار تار اور ابھی پیرہن میں ہیں

پیاسی ہیں آبِ خنجرِ قاتل کی دیر سے
جتنی رگیں امیر ہمارے بدن میں ہیں

عزیز احباب ساتھی مر کے ہیں پھر چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی
مرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

عجب کانٹا ہے ساقی محتسب جب آ نکلتا ہے
تو سب جام و سبو چھالوں کی صورت پھوٹ جاتے ہیں

شہیدِ عشق جی جاتے ہیں جی سی کیا گزرتے ہیں
خدا یہ موت دے سبکو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں

یہاں آنکھوں میں دم ہے اب کوئی ساعت میں مرتے ہیں
قضا کہتی ہے جلدی کیا ہے آئینگے سنورتے ہیں

نکلجاتے ہیں وہ جس راہ سے بیچین کرتے ہیں
ہزاروں چٹکیاں لیتے ہیں جس دل میں گزرتے ہیں

لگاتے ہیں جو سرمہ آئینے کو دور دھرتے ہیں
ستم دیکھو وہ اپنی چتونوں سے آپ ڈرتے ہیں

کسے ہے ہوش وصلِ گل میں رختِ نو بدلنے کا
بدن ہی مثلِ گل چھلکر یہاں کپڑے اترتے ہیں

تفاوت اسقدر ہے زاہدوں میں اور رندوں میں
کہ وہ کچھ دل میں لے رہتے ہیں یہ سب کہہ گزرتے ہیں

شمیمِ گل ہیں ہم بھی تم اگر بادِ بہاری ہو
جدھر چلتے ہو چلتے ہیں جہاں ٹھہرو ٹھہرتے ہیں

لیا تو میں نے بوسہ خنجرِ قاتل کا مقتل میں
اجل شرما گئی سمجھی کہ مجھکو پیار کرتے ہیں

کبھی مدِ نظر گر عاشقوں کا قتل ہو تم کو
ہمیں بھی یاد رکھنا ہم بھی تمکو پیار کرتے ہیں

عجب پردہ ہے پردہ شرم عصیاں کا دم آخر | اسی پردے میں ساری عمر کے بگڑے سنورتے ہیں
مرا خط پھینک کر قاصد کے منھ پر طنز سے بولے | خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں
مدد اے آبِ خنجر رحم کر اب تشنہ کاموں پر | نہ انکی پیاس مرتی ہے نہ یہ پیاسے ہی مرتے ہیں
نہ اتنا محتسب کا خوف ہے ہمکو نہ قاضی کا | کہیں توبہ نہ میخانے میں آئے اس سے ڈرتے ہیں
نہ میخانے میں حاجت ساز کی ہے کچھ نہ مطرب کی | شکستِ توبہ کی آواز پر ہم وجد کرتے ہیں
چل اے بادِ بہاری اک ذرا آہستہ آہستہ | کہ وہ مجھ سے الجھتے ہیں جو بال انکے بکھرتے ہیں
لب ایسے جاں فزا خط کا یہ رنگ اس قہر کی آنکھیں | مسیح و خضر و عزرائیل تینوں تم پہ مرتے ہیں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں | فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں
چھوڑا ہے شگوفہ یہ نیا ناز و ادا میں | اک شاخ تغافل کی لگا دی ہے جفا میں
شرمانے لگی چتونوں پر اسکی نہ جانا | شوخی بھی چھپی بیٹھی ہے پہلوے حیا میں
بیمارِ محبت نے کبھی منھ نہ لگایا | تاثیر کھلی جاتی ہے اس غم سے دوا میں
کہتی ہے شبِ وصل یہ چتونوں کی شرارت | آج آگ لگا دونگی میں دامانِ حیا میں

قابلِ عفو ہیں آلودۂ عصیاں ہو لوں | اے اجل صبر کر اتنا کہ پشیماں ہو لوں
پھر وہی میں ہوں وہی جامہ دری وحشت میں | پہلے واعظ سے ذرا دست و گریباں ہو لوں

غم نے ترے نچوڑ لیا سر سے پاؤں تک | رگ رگ پکارتی ہے کہ نشتر سے کیا کہیں
خالی ہی جب نہ دے تو گلہ آسماں سے کیا | ساقی نہ منھ لگائے تو ساغر سے کیا کہیں

با قسمت دلوں کے کبھی یا پیہ آخر بیگانہ — آنکھوں میں اپنا حال کسی در سے کیا کہیں
قسمت سے سامنا کبھی ہوتا بھی ہے اگر — پہروں یہی سوچتے ہیں کہ لب سے کیا کہیں

ستارے صرف دیکھے بھالے ہوئے ہیں — یہ سب گیند انھیں کے اچھالے ہوئے ہیں
کبھی خون سودائیوں کا گرا تھا — اچھل کر وہی قطرے لالے ہوئے ہیں
نہ تھی کوچہ گردی نہ صحرا نوردی — یہ رستے ہمارے نکالے ہوئے ہیں

ذرا چلمن تک آئیں گھر میں وہ کیا بن کے بیٹھے ہیں — ہزاروں سر بکف مشتاق آگے چھوٹ کے بیٹھے ہیں
ادھر ہے عکس ادھر وہ دونوں بانکے بن کے بیٹھے ہیں — غضب ہیں یہ دو دو گز تو لے تن کے بیٹھے ہیں
ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم انکی نہیں جاتی — نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں
علاقہ میرے دشمن سے نہیں جاتا نہیں جاتا — نہیں وہ دشمن تو اب سوگ میں دشمن کے بیٹھے ہیں
وہ آمادہ سنورنے پر ہم آمادہ ہیں مرنے پر — ادھر وہ بن کے بیٹھے ہیں ادھر ہم ٹھن کے بیٹھے ہیں
یہی انصاف سے کہدیں کہ ہے کس کی جگہ اچھی — بغل میں ان کی ہم پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں
نہیں اے ماہوش یہ آسمان پر جا بجا تارے — بچھا کر کچھ تمہاری اشک رخ روشن کے بیٹھے ہیں
امیر آتی ہے مجکو شرم اس محفل میں کچھ پڑھتے — کہ ہیں استاد جس محفل میں کامل یہاں فن کے بیٹھے ہیں

آزمائش میں جان لیتے ہیں — خوب آپ امتحان لیتے ہیں
فقرے فقرے میں لیے ہیں چوٹیں — باتوں باتوں میں جان لیتے ہیں
کیوں سراپا نہ جان ہوں معشوق — سارے عالم کی جان لیتے ہیں

نہیں ساقی یہ قلقل مینا — ہچکیاں نیم جان لیتے ہیں
یہ ملا اوج خاکساری سے — کہ قدم آسمان لیتے ہیں
پھیر دیں دل نہیں جو ان کو پسند — کیوں غریبوں کی جان لیتے ہیں

غش ہیں گر الجھے زلف سنگھاتے بھی نہیں — جائیے جائیے ہم آپ میں آتے بھی نہیں
نیم جاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے — ہاتھ اٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں
روٹھنا روز کا ٹھہرا ہے تو یہ سن رکھئے — روز کے روٹھنے والے کو مناتے بھی نہیں
آ کے تربت پہ مری کہتے ہیں لو اٹھ بیٹھو — اب تو مدت ہوئی ہم تم کو ستاتے بھی نہیں
لطف مرنے کا دکھائیں کسی فرقت میں امیر — وہ نہیں آتے تو ہم جان سے جاتے بھی نہیں

جھوٹے موتی جو سمجھا ہے انہیں تو دل میں — اور اس غم سے گھلے جاتے ہیں آنسو دل میں
گرمیاں کر کے رلاتے ہو مجھے یاد رہے — چھالے ڈالینگے یہ جلتے ہوئے آنسو دل میں
ہجر میں ہوش نہیں صبر نہیں تاب نہیں — اُٹھ بھی اے دردِ دل اب کیوں ہے پڑا تو دل میں
ہے نگہ تیر ادا تیر بلا تیر قضا — دل ہی پہلو میں مرے تیر سے پہلو دل میں
کھینچکر سرمے کا دنبالہ دکھائی مجھے آنکھ — پھر گئی کوکبِ دمدار کی جھاڑو دل میں
ناوکِ ناز و ادا کا ترے اللہ رے ادب — حسرتیں جلتی ہیں بیٹھی ہیں دوزانو دل میں
ایک ایک اس میں شرارہ تھا جہنم کا امیر — آگ لگجاتی جو رہجاتے یہ آنسو دل میں

دارِ فانی میں پتا اسکا میں کس سے پوچھوں — سب ہیں پردیسی یہاں اسکا کوئی ساکن ہی نہیں

نالہ کش دل کو نہ دیکھا تو وہ کافر بولا
اچھی مسجد ہے جہاں کوئی مؤذن ہی نہیں

جب کہا میں نے کہ اب رحم ہو واجب بولے
آپ واجب کہیں یا فرض یہ ممکن ہی نہیں

اے صنم وصل میں کیا قید کہ ٹھہرے کس دن
سب دن اللہ کے ہیں کوئی برا دن ہی نہیں

اُن سے ہے وصل کی درخواست وہ جو چاہیں کہیں
غمزہ کہدیں بیچ میں لول اُٹھتا ہی ممکن ہی نہیں

بے جگہ شام ہوئی جاتی ہے جنگل میں امیر
ہائے کیا پہونچیں گے منزل پہ کہ اب دن ہی نہیں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب میں ہوں خفا تم سے کہ تم مجھ سے خفا ہو

گھبرا گئے وہ بولے جو سُنا شورِ قیامت
دیکھو مرے عاشق کا جنازہ نہ اُٹھا ہو

کیا شوق تھا مرقد سے قیامت میں میں پہنچا
کہتا ہوا اب وعدۂ دیدار وفا ہو

جھنجلا کے سزا دیں وہ مجھے ہاتھ سے اپنے
ایسی کوئی اے دل جو خطا ہو تو مزا ہو

ہر رنگ میں ہے یار نیا رنگ تمہارا
بے پردہ جو شوخی ہو تو در پردہ حیا ہو

لایا مہِ نو بدر کا آئینہ بغل میں
اتنا بھی نہ اپنا کوئی مشتاقِ لقا ہو

کیا ہاتھ میں درکار امیر اُن کو ہے مہندی
چھو لیں گلِ عارض تو وہی رنگِ حنا ہو

بولے وہ آئے جو ناصح مرے سمجھانے کو
کون ہو تم نہ ستاؤ مرے دیوانے کو

تو نے کمبخت کبھی پی ہی نہیں کیا تجھے قدر
محتسب دیکھ مری آنکھ سے پیمانے کو

گور میں آئے نکیریں تو میں یہ سمجھا
ناصح آ پہنچے یہاں بھی مرا سر کھانے کو

ساقیا دخترِ رز کا تو بڑا رتبہ ہے
بے وضو میں کبھی چھوتا نہیں پیمانے کو

واعظ نہ تم جیسے سمجھے ہو سحاب تر مست — بے اثر تو یہ صبا دو شیشہ پیمانے کو

پردے ہی میں تم ہو نہ سپید عالم حسن کا — پردے سے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو
جب پوچھتا ہوں ان سے دوا درد عشق کی — کہتے ہیں چپ چاپ غش کی اپنے دوا کرو

آج وہ چھاؤں میں تاروں کی سدھارے گھر کو — لگ گئی آگ دھندلکے میں ہمارے گھر کو
گھر سے ہم وادیِ وحشت کی طرف چل نکلے — چھوڑ کر خانہ خراب کے سہارے گھر کو

گھر میں بستو نہ آ جنگل بیٹھو — فصل گل ہے چمن میں چل بیٹھو
دیکھو نکلی شہیدِ ناز کی لاش — تم بھی گھر سے ذرا نکل بیٹھو
جب میں اٹھتا ہوں کوئی قاتل سے — روک کر کہتی ہے اجل بیٹھو
شوق دیدار کا تقاضا ہے — حشر میں سب سے پہلے چل بیٹھو
درد کہتا ہے مجھ سے رہ رہ کر — دیکھو اٹھتا ہوں میں سنبھل بیٹھو

ہے ایک عمر سے جہاں اسے ملال نہ ہو — شبِ فراق میں ذکرِ شبِ وصال نہ ہو
جو اوچھے زخم بھی ہنستے ہیں بیچ ڈرتا ہوں — ہنسی ہنسی میں کسی کو کہیں ملال نہ ہو
کرو بناؤ سنوارو تم اپنے گیسو کو — پر اس قدر کہ پریشان کسی کا حال نہ ہو
عروسِ مرگ سے بھی میں لپٹ نہیں سکتا — خیال ہے کہ انھیں اور کچھ خیال نہ ہو

ہٹی جو زلف یہ چہرے کی روشنی پھیلی — میں ڈر گیا کہیں صبحِ شبِ وصال نہ ہو
ترے مریضِ محبت کو کوئی کیا جانے — وہی بتائیگا یہ حال جسمیں حال نہ ہو

مار ہی ڈالتے ہیں گیسوے دوتا دل کو — پیچ پر پیچ ہیں اللہ بچا لے دل کو
پھوٹ کر آبلے ناسور ہوئے جاتے ہیں — ہائے چھلنی کئے دیتے ہیں یہ چھالے دل کو
کوئی پامال ہی کرنے کو نہیں لیتا ہے — مجھکو وہ جبر ہے کروں کس کے حوالے دل کو
ہو گیا سرد تڑپ کر تو وہ بولے ہنس کے — کیا ہوا آج مرے چاہنے والے دل کو
سخت نادان ہے کہ لٹتا ہے وہ پاؤں کے تلے — کچھ بھی سمجھے تو کلیجے سے لگا لے دل کو
کہتے ہیں شوق سے آئیں مری محفل میں امیر — ساتھ لائیں نہ مگر لوٹنے والے دل کو

اے جنوں لے چل اب وہاں کہ جہاں — یہ زمیں اور یہ آسماں نہ ہو
یوں مٹا الفتِ خدا میں خودی — نام باقی رہے نشان نہ ہو

دیکھ لے حالِ شمع و پروانہ — گھر جہنم ہے زن مریدوں کو

غیر سے آنکھیں چار کرتے ہو — جاؤ بھی کس کو پیار کرتے ہو
ہے جو نفرت امیدواروں سے — کیوں پھر امیدوار کرتے ہو
ایک نالہ جو ہم کریں تو ابھی — منتیں تم ہزار کرتے ہو
روز آنے کو جب کہا بولے — اک تمہیں مجھکو پیار کرتے ہو

بوسۂ لب لیکے خود ہی بنگیا ہی بُت امیر — بات کیا ہے تم کبھی چپکے سے ہو رہو جا بیٹھو بھی

کشتۂ عشق ہوا دیکھ کے آنکھیں اسکی — شیر کے منہ پہ لگا لیگئے آہو جسکو

پھر مزا مجکو چکھا دو نہیں دل آزاری کا — چار دن کو بھی جو مل جائے ترا دل مجکو
کچھ اس انداز سے وہ ناز سے ہاتھ چلے — آگئی نیند تہِ خنجرِ قاتل مجکو
ناتوانی نے بنایا ہے مجھے نقشِ قدم — پاؤں رکھتا ہوں جہاں ملتی ہی منزل مجکو

فنا نہیں اسی کی ہیں یہی جڑ ہے فساد کی — پہلو میں دل نہو تو کوئی آرزو نہو

غضب ہے اپنے عیبوں کا خیال آئے نہ انساں کو — کیا ہے شرمِ عریانی نے خم شمشیرِ براں کو
گلوں سے جا کے ہیں ہم داغِ دل اپنے ملا آئے — نہیں شبنم پسینا آگیا ہے یہ گلستاں کو
تڑپتا جانتا ہوں لذتِ ناوک ہی اے قاتل — نہیں سوفار کو جانوں نہ پہچانوں میں پیکاں کو
میں اک غربت زدہ باقی رہا تھا میں بھی آتا ہوں — مبارک باد دے آئے کوئی گورِ غریباں کو
خیالِ سودگانِ خاک کا دل سے نہیں جاتا — لیئے پھرتا ہوں اپنے ساتھ میں گورِ غریباں کو
پری کو بھی اترتے یوں نہیں دیکھا ہی شیشے میں — عجب انداز سی تو نے اتارا دل میں پیکاں کو
بہت ہی مختصر ہے وصل کی شب کچھ تو بڑھ جائے — مری خاطر سے دم بھر کھولدو زلفِ پریشاں کو
بہت ہی زور پر دستِ جنوں ناصح الگ رہنا — ترا دامن نہ پکڑے چھوڑ کر میرے گریباں کو
امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہونچوں اڑکے پھولوں تک — کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

گرد اغیار بیچ میں تُو ہو
ہائے کیونکر قضا پہ قابو ہو
پاس سے تم اٹھو تو دل بیٹھے
کبھی خالی نہ اپنا پہلو ہو

وصل کی رات تو راحت سے بسر ہونے دو
شام ہی سے ہے یہ دھکی کہ سحر ہونے دو
تلملانے میں تڑپنے میں کمی کی کس دن
ہے جو اسپر بھی خفا درد جگر ہونے دو
ہم تصور میں نہ کھینچیں یہ نہ ہوگا ہم سے
لاکھ نازک ہے حسینوں کی کمر ہونے دو

کیوں وصل کی شب ہو خبر کی
آمد ہے جو شام سے سحر کی
اے یاس نہ دل میں پاؤں پھیلا
پھانسیں نہ چبھیں مرے جگر کی
خط لیتے ہی چل دیا عدم کو
اتنی ہی لکھی تھی نامہ بر کی
غفلت میں نہ کھو شباب اے دل
یہ رات ہے جان عمر بھر کی
شام شب ہجر عمر آخر
امید امیر کیا سحر کی

جتنی کمی کہ نامہ سیاہی میں رہ گئی
اُتنی ہی دیر عفو الٰہی میں رہ گئی
آنکھ اسنے پھیر لی تو کہاں پھر ہماری زیست
آدھی تو جان نیم نگاہی میں رہ گئی
تھے زار کوے یار میں کیا جاتی اپنی خاک
اتنی تھی کم کہ اڑ کے ہوا ہی میں رہ گئی
دیکھا تجلیاں مری قندیل آہ کی
کیسی لٹک کے عرش الٰہی میں رہ گئی
منہ روز حشر موڑ گئی تیغ یار بھی
چلتی ہوئی زبان گواہی میں رہ گئی
صد شکر منہ سے نام محمدؐ نکل گیا
بات اپنی بارگاہ الٰہی میں رہ گئی

ابرو پر اسکے آ گئی اڑ کر ہوا سے زلف
کیا رویت ہلال سیاہی میں رہ گئی

صد شکر حق نے میری تواضع قبول کی
اچھی تھی ہستے خزانۂ شاہی میں رہ گئی

پردے سے اسکی ذات کو کیا کام تھا امیر
چھپ کر صفاتِ ناتمنا ہی میں رہ گئی

آئینہ ترے حسن کا دل بھی ہے جگر بھی
ہے ایک ہی صورت کہ ادھر بھی ہے ادھر بھی

غیروں سے ہیں باتیں بھی عنایت کی نظر بھی
پر دیکھتے جاتے ہیں کنکھیوں سے ادھر بھی

تو چشمِ سخن گو سے مجھے پوچھ دے آنا
ہیں باتیں ہی باتیں کہ ہے کچھ مدِ نظر بھی

کمہلائے چلے جاتے ہیں گل کس کی ہے آمد
گھبرائی ہوئی پھرتی ہے کچھ بادِ سحر بھی

رک رک کے جو چلتا ہے گلے پر مرے خنجر
کچھ دل میں ہے قاتل کے ترحم کا اثر بھی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختیٔ جاں سے
ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

جاتا ہے مجھے واعظ کی محفل میں نہ کر دیر
ساقی ہے گل رنگ سے ساغر ذرا بھر بھی

جب قتل کو آیا ہے مرے غمزۂ قاتل
کیا تیز چھری کھینچ کے نکلی ہے نظر بھی

کیا غم ہے جو ہیں طاقتِ پرواز
نکلینگی جو کلیاں تو نکل آئینگے پر بھی

ہے شوق جو بالوں کے بڑھانیکا تو اے جان
پیدا کرو اس بوجھ اٹھانے کو کمر بھی

بیمار ہیں کس کا ہوں کہ آئے جو مسیحا
تعظیم کو اٹھا نہ مرا دردِ جگر بھی

فرقت میں امیر ایسی برستی ہے اداسی
روتے ہیں مرے حال پہ دیوار بھی در بھی

پیکان ہی ترے تیر کا پہلو میں در آئے
ٹھنڈا ہو کلیجا ہی امید بر آئے

رخصت ترے بیکس کو کرے کون دمِ نزع
ہچکی ہی الٰہی کوئی وقتِ سحر آئے

اللہ رے ستم جو ہوئی عشق کے ہم پر — تم آپ یہاں آئے تو کہا تم کدھر آئے
آئے وہ وہم یار پس یوں صحن گل تر پہ — [illegible] کہیں پا نہ کی پچھلے پہر آئے
کوٹھے سے نزاکت تو اترنے نہیں دیتی — تم آنکھوں سے دل میں مرے کیونکر اتر آئے
کس طرح امیر ان سے بنا ہے کوئی الفت — [illegible] چلا آئے

ہیں اشارے یہ تیغ قاتل کے — آؤ ارمان نکالیں دل کے
شرم لیلیٰ تو مانع دیدار — [illegible] پردے محمل کے
ہم سے سیکھیں جو طرز نالہ کشی — پھول [illegible] عنادل کے
دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے — تم تو ارمان بن گئے دل کے
فیصلہ کر رہے ہیں مجنوں کا — بیچ میں پڑ کے پردے محمل کے
غم کونین سے مجھے کیا کام — کس کو لالے پڑے ہیں دل کے
پوچھتے ہیں وہ مجھ سے عید کے دن — کہو کیا مل گیا گلے مل کے
اسکی رحمت سے لو لگا کہ امیر — آڑے آئیگی وقت مشکل کے

وہ بن سنور کے ادھر آتے ہیں جفا کیلئے — ٹھہرے ہیں آج دل درد آشنا کیلئے
دکھاؤنگا شب وصل انکو پھول داغوں کے — لگا رہا ہوں یہ ڈالی اک آشنا کیلئے
یہ ہچکیاں نہیں آتی ہیں نزع میں پیہم — بچھائی جاتی ہے ڈاک آمد قضا کیلئے
وہ آہیں نزع میں چلتی نہیں زباں نہ چلے — نگاہ یاس تو ہے عرض مدعا کیلئے
امیر کعبے کو جاتا ہوں میں تو دیر سے بت — پکارتے ہیں ادھر بھی ذرا خدا کیلئے

جھک رہی ہے شرم میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

کھل گیا جوبن تو عصمت سے حیا نے یہ کہا
ایک انگڑائی سے ہم دونوں کی رسوائی ہوئی

رکھ تو اے گلچیں اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں ہیں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

موت آئی روح جاتی ہے کرے کون اہتمام
اک نگاہِ واپسیں پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

شعر گلدستے میں مجھ افسردہ دل کے کیا امیر
دامنِ گلچیں میں ہیں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی

رندو جو ملو حضرتِ قاضی سے تو دب کے
سمجھو کہ بزرگوں میں ہیں یہ بنتِ عنب کے

اُٹھیں تو وہ محشر میں ذرا چہرے سے پردہ
آگے ابھی ہو جائیں گے پیچھے ہیں جو سب کے

لیں ساتھ مجھے ڈرتے ہیں کیوں حضرتِ موسیٰ
طالب ہیں وہ خود دیدۂ دیدار طلب کے

معشوقِ حقیقی میں بھی گرمی کی ہیں باتیں
قرآن میں بھی آئے ہیں آیات غضب کے

گھر بیٹھے ہمیں ہاتھ لگی منزلِ مقصود
جب توڑ کے ہم بیٹھ رہے پاؤں طلب کے

سو بار ہیں دیکھا کئے وہ مصحفِ رخسار
اس سال میں سب چاند ہوئے ہم کو رجب کے

ہر مرتبہ کہتے ہو کہ ہم جاتے ہیں گھر کو
سب باتیں تو اچھی ہیں یہ فقرے ہیں غضب کے

نازکی کہتی ہے تسمہ تو لگا رہنے دے
ناز کہتا ہے لگی میری بلا رہنے دے

بے پر و بال ہوں طاقت نہیں اُڑنے کی صبا
اک ذرا شاخِ نشیمن کو جھکا رہنے دے

جب وہ بت ہی نہیں جنت میں تو جنت کیسی
ایسی جنت سے تو دوزخ میں خدا رہنے دے

لب پہ جو ہے تبسم وہ دہن کس کا ہے — باتیں منہ چومیں وہ انداز سخن کس کا ہے
فتنے لیتے ہیں یہ بے ساختہ پن کس کا ہے — حشر کی کچھ نہیں چلتی یہ چلن کس کا ہے
بات پھنس پھنس کے نکلتی ہی نہیں لب پر — اسقدر تنگ سوا تیرے دہن کس کا ہے
تیر چٹکی میں کماں ہاتھ میں خنجر قریب — انتظار اب تجھے اے تیر فگن کس کا ہے

دل کی یا رب وہ دلربا نہ سنے — ایسی حسرت بھری صدا نہ سنے
یوں وہاں چل کہ پاؤں کی آہٹ — پاسباں کیا ہے نقش پا نہ سنے
کسی نا آشنا کا کیا شکوہ — آشنا کی جب آشنا نہ سنے
جو کسی کو برا بھلا نہ کہے — وہ کسی سے برا بھلا نہ سنے
دل وہاں ٹھنڈی سانسیں لیتا ہے — کوئی فقرہ جلا بھنا نہ سنے
وائے قسمت جو سب کی سنتا ہے — وہ بھی عاشق کی التجا نہ سنے
دل جو کہتا ہے بے اثر ہے دوا — درد کھتا ہے چپ دوا نہ سنے
پھول آہستہ توڑ اے گلچیں — دیکھ ظالم کہیں صبا نہ سنے
وعدۂ وصل چپکے چپکے ہو — غمزہ عشوہ ادا حیا نہ سنے
حال پھولوں کا جو خزاں نے کیا — کہیں بلبل ماجرا نہ سنے
میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو — بت ہی سن لیں اگر خدا نہ سنے
درد پر دل نثار دلبر درد — ایسے دیکھے ہیں آشنا نہ سنے
بہت اے دل وفا وفا نہ پکار — کہیں وہ دشمن وفا نہ سنے
میں تو سنتا ہوں تو جو کہتا ہے — اے ستمگر مگر خدا نہ سنے

رات تھوڑی سی حسرتیں ہیں بہت   کیا کہے کیا سنے وہ کیا نہ سُنے
جو کوئی درد آشنا ہو امیر   ادھر آ کے مرا فسانہ سُنے

دل میں جو داغ ہیں محبت کے   پھول ہیں سب یہ باغِ جنت کے
مہکے جب پھول میری تربت کے   دوڑے سقّے سحابِ رحمت کے
چھپتی پھرتی ہیں حسرتیں پسِ مرگ   گوشے گوشے میں میری تربت کے
اس ادا سے چلے وہ حشر کے دن   فتنے پس پڑ گئے قیامت کے
عیش کر لو نئی جوانی ہے   یہی دو چار دن ہیں فرصت کے
ہجر کی ایک شب نے دکھلائے   سیکڑوں دن مجھے قیامت کے
دیکھکر دخت رز کو پگھلے شیخ   اہتو ٹھنڈے وضو ہیں حضرت کے
وصل کے دن قریب آتے ہیں   جوڑ چلنے لگے نزاکت کے
تیری صورت بنا کے بیٹھ رہے   کارکن کارگاہِ صنعت کے
قتل کو دوڑ کر چلے آئے   وصل میں عذر تھے نزاکت کے
رکھ کے خنجر گلے پہ کہتے ہیں   کیوں چکھا دوں مزے محبت کے
جتنے تکیے ہیں سو رہے ہیں امیر   یار ہیں سب ہماری صحبت کے

یہ گالی جو اے دلربا مل رہی ہے   دعا دی تھی اُسکی سزا مل رہی ہے
لگا چاہتی ہے کوئی آگ تازہ   شرارت سے اُنکی حیا مل رہی ہے
پھر آتے ہیں ہیں عیادت کی باتیں   مریضوں کو اچھی دوا مل رہی ہے

مرا دل وہ تلوؤں سے ملتے نہیں ہیں — یہ مٹی میں میری وفا مل رہی ہے

قد نے گیسو کو سر چڑھایا ہے — سرو سے بھی بلند سایا ہے
خود نہیں ابر گھر کے آیا ہے — شوق مستوں کا گھیر لایا ہے
روح پھر آ گئی بدن میں میرے — دیکھو تربت پہ کون آیا ہے
سجدے کرتے ہیں طاق ابرو میں — ہم نے کعبہ نیا بنایا ہے
مشربِ صلحِ کل ہیں اے زاہد — دیر بھی ایک حرم کا سایا ہے
طرفہ آفت ہے روزِ فرقت بھی — حشر نے راس اسے بٹھایا ہے
دیدۂ تر سے کر کے ہم چشمی — کیا سمندر نے غوطہ کھایا ہے
نقدِ طاعت جو روز کرتے ہیں نذر — خلد کا پیشگی کرایا ہے
انس پیکاں سے کیوں نہ ہو دل کو — اپنا ہمشکل یار پایا ہے
گھڑیوں روتے ہیں ہم امیر لہو — زخم کوئی جو مسکرایا ہے

کیوں وہ شرمائیں اپنے درباں سے — حوریں چھپتی نہیں ہیں رضواں سے
آبلے دل کے جب دکھاتا ہوں — چھیڑ دیتے ہیں نوکِ مژگاں سے
چاک کرنے کی وضع پوچھتی ہے — صبحِ محشر مرے گریباں سے
یادِ مژگاں ہوئی پیامِ اجل — خون آنے لگا رگِ جاں سے
پھول جھڑتے نہیں خزاں میں امیر — روٹھے جاتے ہیں گل گلستاں سے

شکل آئینہ جو حیرت ہو گی — دیکھ لینے کی تو صورت ہو گی
وصل میں شام سے یہ خوف رہا — صبح کو کیا مری حالت ہو گی
دوڑ ساقی کہ ترے مستوں کو — ہوش آیا تو قیامت ہو گی
ہے یہی چال تو دو ہی دن میں — آگے تم پیچھے قیامت ہو گی
آئنہ دیکھئے ہنسئے نہ مجھے — آپ کی بھی یہی صورت ہو گی
بیخودی شیشہ نہ ٹوٹے کوئی — مجکو ساقی سے خجالت ہو گی
آپ گھر غیر کے جائیں ہم بھی — مر ہی جائینگے جو غیرت ہو گی
ہم سے دیوانے اگر جمع ہوئے — کیا پریشان قیامت ہو گی
دل اٹھاؤنگا میں اس سے ناصح — ناز اٹھانے سے جو فرصت ہو گی
ہم بھی محشر میں طلب ہونگے امیر — کیا قیامت میں قیامت ہو گی

جب اس شعلہ رو سے مقابل ہوئی — چراغ سحر شمع محفل ہوئی
چھری کھچکے اس ترک کی میان سے — کلیجے میں رکھنے کے قابل ہوئی
ہوا وصل اس سے تو اک دم کے دم — یہ سمٹی کہ شب آنکھ کا تل ہوئی
میں دیوانہ کیوں ہوش میں آگیا — یہ کیسی مری عقل زایل ہوئی

بوقت مرگ لیلیٰ کی دعا تھی — الٰہی خوش رہے مجنوں جہاں ہے
تم اپنے پاؤں سے کانٹے نکالو — مجھے اے ہمرہو فرصت کہاں ہے
کرے دو حصے مجکو تیغ اس کی — امیر ایسی مری قسمت کہاں ہے

مہر الفت میں تیری جلتا ہے
صبح کا تجھ پہ دم نکلتا ہے

ہے زمانہ بھی کیا ترا بیتاب
رات دن کروٹیں بدلتا ہے

شمع کہتی ہے یہ پتنگوں سے
کہو پہلے سے کون جلتا ہے

سوزِ غم بعدِ مرگ بھی ہے وہی
ہڈیوں سے دھواں نکلتا ہے

مے گلرنگ یہ نہیں ہے امیر
دہن شیشہ لعل اگلتا ہے

پھری نہ مرضیِ جلاد سے کبھی گردن
ہزار بار تہ تیغ امتحاں آئی

کوئی جاناں میں ہوئی ہے جو شہادت میری
دامن حور کے سائے میں ہے تربت میری

ہنسکے فرماتے ہیں وہ دیکھکے حالت میری
کیوں تم آسان سمجھتے تھے محبت میری

بعد مرنے کے بھی چھوڑی نہ رفاقت میری
مری تربت سے لگی بیٹھی ہے حسرت میری

چارہ گر مجھ سے مکدر ہے الٰہی کیا ہے
آج مٹی ہوئی جاتی ہے طبیعت میری

ہو چکے قتل دو عالم تو کہا ظالم نے
آج کچھ رنگ پر آئی ہے طبیعت میری

چاہے قتل کرو پیار سے مٹی دیدو
ہائے اتنی بھی نہیں تم کو مروت میری

جرم الفت سے میں انکار اگر کرتا ہوں
آئینہ سامنے رکھدیتی ہے حیرت میری

تجھ سے اے بادِ صبا مجکو یہ امید نہ تھی
چار پھولوں کو ترس جائیگی تربت میری

دھوم ہے روزِ قیامت کی قیامت کیسی
آئی ہے بھیس بدلکر شبِ فرقت میری

پھول داغوں کے مرے دل میں جو دیکھا تو کہا
کیاریاں خوب بناتی ہے محبت میری

درِ قاتل کا پتا دیتی ہے مشتاقوں کو
خضر بن بیٹھی ہے اس کوچے میں تربت میری

تم کبھی کہتے کہ تم سے کا نہ پوچھا چھوڑا / گھر کی طرح لگی رہتی ہے نیت میری

تم تو دیتے ہو مجھے یار نہ پرستش کا پتا / میرے گم ہونے سے عالم میں ہے شہرت میری

غیر سے حشر میں کیونکے چھڑایا مجھ کو / جانے دے اسکی طرفدار ہے رحمت میری

دل سے تو بھی باتیں میں کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں / سن رہا ہوں میں کہے جاؤ شکایت میری

[illegible] مرے دل کو لیئے زلفوں کی / انھیں گیسوئیں میں اٹک جاتی ہے نیت میری

کہوں کس طرح کہ وہ دل چھین کے لیتے ہیں امیر / وہ مرا گھر ہے رہے جس میں محبت میری

وہاں شیشہ میں کبھی [illegible] وہ در پہ رہا ہوں میں امیر / اس قدر ضعف پر اللہ رے طاقت میری

جب مرے حالت یہ ہے گلزار کی / نکہتِ گل سانس ہے بیمار کی

ہوں وہ لاغر دیا اسکے گر پڑا / کھا کے ٹھوکر سایۂ دیوار کی

حال مجھ سے سر پٹکنے کا نہ پوچھ / دیکھ لے حالت در و دیوار کی

خشک نگیں ہے یار خفا میں تو ہو / ہم نظر پہچانتے ہیں پیار کی

آکے بالیں پر مرے بولی اجل / میں دوا ہوں عشق کے آزار کی

گل بہت عارض کے دیوانے ہوئے / پھاڑ کے کپڑے راہ لی بازار کی

اے امیر اسکی لگاوٹ پوچھنا / مار ڈالیں گی نگاہیں پیار کی

دم گھٹا ہم تو گئے الفت پوشیدہ کا بھرنے والے / دل جلے سینہ جلے اُف نہیں کرنے والے

عشق بازی سے گزرتے ہیں گزرنے والے / موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنے والے

آکے ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے / او غریبوں کے مزاروں پہ گزرنے والے

آخری وقت بھی پورا نہ کیا وعدہٴ وصل | آپ آتے ہی رہے مر گئے مرنے والے
نزع کا وقت جو گزرا تو خوشی کیا اسکی | ایسے صدمے ابھی کتنے ہیں گزرنے والے
پھر کہاں دل کا پتا دل میں حسین جب آئے | گھر بھی لیجاتے ہیں اس گھر میں ٹھہرنے والے
موت کہتی ہے کہ دیتے تو حسینوں پہ ہیں جان | اور سب مجھسے مفت لئے مرتے ہیں مرنے والے
نقش پا سے بھی اپاہج کہیں پیچھے ہی نہیں | ہر قدم پر یہ مسافر ہیں ٹھہرنے والے
قابلِ رحم قیامت میں نہ ٹھہرینگے امیر | رحم دنیا میں غریبوں پہ نہ کرنے والے

خاکی نژاد خاک کے اندر چلے گئے | جس گھر سے آئے تھے پھر اسی گھر چلے گئے
شیشے پکارتے ہیں کہ رندانِ بادہ نوش | آئے تباہ کرکے مرا گھر چلے گئے

جو گھر میں پھر کے ہم ان کے حضور سے آئے | کلیم بہرِ ملاقات طور سے آئے
خدا تو عفو کرے بار بار دیکھے جرم | غضب ہے باز نہ بندہ قصور سے آئے
ہمیں نہ تم سے ملا کچھ رہے وہی اچھے | کہ خالی ہاتھ تو موسیٰؑ نہ طور سے آئے
گناہ گار ترے گیسوؤں کے محشر میں | بندھے ہوئے رسنِ زلفِ حور سے آئے
امیر اپنی جو آنکھیں ہوں طالبِ دیدار | چمک کے برق ابھی کوہِ طور سے آئے

میں وہ دیوانہ عریاں تھا کہ مرقد میں عزیز | دفن کرنے لگے مجکو تو کفن بھول گئے

دل کو اب کب قرار آتا ہے | سن لیا ہے کہ یار آتا ہے

تیرے وعدے کی عشق ہے اسکو — ساتھ ہی اعتبار آتا ہے
وصل میں اسکو کس نے بلوایا — غصہ کیوں بار بار آتا ہے
روز تکیوں میں جا کے دل میرا — دوستوں کو پکار آتا ہے
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ — مجھکو غصے پہ پیار آتا ہے
فتنے لکھتے ہیں دیکھکر اُسکو — فتنۂ روزگار آتا ہے
جائے شکوہ مری زبانپہ امیر — شکر بے اختیار آتا ہے

تند مے اور ایسے کمسن کے لئے — ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے
جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — لوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے
دن بھرا روتا ہے میری رات کو — رات روتی ہے مری دن کے لئے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا — میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
ذرہ ذرہ دُردِ مے کا زاہدو — دوربیں ہے چشم باطن کے لئے
کیمیا گر آگ سا دیکھا نہیں — تار سونے کے دیئے تنکے لئے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجتا ہے ایک کمسن کے لئے
سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند — اب کوئی حور آئیگی ان کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے
دُختِ رز سی پاک دامن چاہیے — شیخ جی سے پاک باطن کے لئے
کہتے ہیں چھپنے کی بھی اچھی کہی — پردے میں بیٹھینگے ہم ان کے لئے

دل کا ضامن تو ترا کیا اعتبار — پہلے اک ضامن ہو ضامن کے لیے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیرؔ — آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے
صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیرؔ — بھیجتے تحفہ موذن کے لیے

ادا میں کیا چلتی ہیں رنگ تلوار اسنے تولی ہے — لہو کی چلتی ہیں پچکاریاں مقتل میں ہولی ہے
عجب ناگن ہی زلف اسکی کہ جس محفل میں کھولی ہے — وہاں سے جو چلا ہے لُٹ کے اُسکے ساتھ ہو لی ہے
عجب ملبوس ہے ہم وحشیوں کا رختِ عریانی — گریباں ہے نہ دامن ہے نہ پردہ ہے نہ چولی ہے
گھٹا کی سیر حجرے سے نکل کر دیکھ اے زاہد — نہانے کو یہ چولی حور نے جنت میں کھولی ہے
صراحی دور میں آتی ہے زاہد ہوں جو محفل میں — جھکا لیں اپنی آنکھیں دخترِ رز کی یہ ڈولی ہے
نظر بازی ہی جو ملتی ہے لذت دیکھتے ہیں — ترے دیدار کے بھوکے فقیر دل کی یہ جھولی ہے
ادا ہی سے تری مرتا ہے جو مرتا ہے دنیا میں — قضا کہتے ہیں جسکو وہ اسی سانچے کی گولی ہے
صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کسکی چوری کی — کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی لُچھی ٹٹولی ہے
گلوری کھائی اس غنچہ دہن نے تو یہ مرجھائی — کہ ہے جو پھول گلشن میں ترے پانوں کی ڈھولی ہے
خوشامد اے دلِ بیتاب اس تصویر کی کب تک — یہ بولا چاہتی ہے پر نہ بولیگی نہ بولی ہے
امیر ایسے شگفتہ ہیں مضامین نازک و رنگیں — غزل کیا ہے یہ پھولوں سے بھری گلچیں کی جھولی ہے

لپٹ کے تم سے تصور میں کوئی سوتا ہے — کدھر خیال تمہارا ہے کچھ خبر بھی ہے
نہ دستِ ناز میں رکھیں تو کیا کریں آخر — کہاں وہ تیغ کو باندھیں کمر کہیں بھی ہے

نالۂ بلبل سے دل پہ چوٹ ایسی لگ گئی
روتے روتے باغباں کو آج ہچکی لگ گئی

ہمصفیرو اس چمن میں ہوں میں وہ درد آشنا
غنچہ بھی چٹکا تو میرے دل پہ گولی لگ گئی

بیعتِ پیرِ مغاں سے مل گیا بامِ مراد
سلسلہ پیدا ہوا رفعت کا سیڑھی لگ گئی

واہ رے شوقِ تماشا وہ ابھی گھر ہی میں ہیں
اٹھ گئی دیوار۔ در پر بھیڑ ایسی لگ گئی

تا کجا بیداد اب فریاد کی طاقت نہیں
باغباں آواز میں بلبل کی پتی لگ گئی

دردِ دل نے اٹھ کے پہلو سے ذہیں چوکا دیا
رات بھر میں ایک پل جب آنکھ میری لگ گئی

روتی ہے شبنم گلستاں میں تو ہنس پڑتے ہیں پھول
پانی پانی جو کرے دل کو وہ آنسو اور ہے

بوئے یوسفؑ مصر سے کنعاں میں لائی ہے صبا
اب دماغِ حضرتِ یعقوبؑ میں بو اور ہے

بھر بالش حور کا زانو ہمیں در کار کیا
جس پہ ہم سر رکھ کے سوتے ہیں وہ زانو اور ہے

یار آیا دیکھنے اب تو ٹھہر جا کوئی دم
میرے تڑپانے کا وقت اے دردِ پہلو اور ہے

تذکرہ کچھ تو کیا میری پریشانی کا
آج اُلجھے وہ بہت زلف کی سرگوشی ہے

دو جہاں چھوڑ کے عشاق ترے غم میں رہے
دونوں عالم سے جدا تیسرے عالم میں رہے

عمر بھی رو یا تجھے پیمانہ بھی رو دیا مجھ کو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے

آکے بگڑی ہوئی اس باغ کی دیکھی جو ہوا
شور ہے کوچ کے شب بھر گل و شبنم میں رہے

دل میں عصیاں کے یہ ہے ایک نہ ہو داخل خلد
عفو کہتا ہے کہ کوئی نہ جہنم میں رہے

باتیں ناصح کی سنیں یار کے نظارے کیے
آنکھیں جنت میں رہیں کان جہنم میں رہے

مرگِ عاشق کی خبر آئی تو جھنجلا کے کہا
روز سو مرتے ہیں کب تک کوئی ماتم میں رہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے
آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

دل ہی شے گردِ کدورت میں ستم ہے کہ نہیں
ہائے کیا خاک میں ظالم نے ملا رکھا ہے

کہتے ہیں میری بلا جانے ترا دل ہے کہاں
چھوڑ ہیں کیا مرے دشمن کا چرا رکھا ہے

کہتے ہیں ناز کی لذت کا تو کچھ شک نہیں
اور مزہ یہ ہے کہ نام اُس کا جفا رکھا ہے

ہیں تمھارے ہی تو جلوے کے کرشمے سارے
اسکو کیا تکتے ہو آئینے میں کیا رکھا ہے

یاد آتا ہوں کبھی میں تو پہن لیتے ہیں
ایک جوڑا مرے پھولوں میں بسا رکھا ہے

ہیں تغافل میں بھی سرگرمِ ستم وہ آنکھیں
آپ تو سوتے ہیں فتنوں کو جگا رکھا ہے

ناز سے وار کیا اُسنے یہ کہکر مجھ سے
لے یہ خنجر بھی ترے دم کو لگا رکھا ہے

حشر پر قامتِ جاناں کا ہی جلوہ موقوف
اس قیامت کو قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

جان بھی ہجر میں دیدیتے مگر ہم نے امیرؔ
کسی موقع کے لیے اِسکو لگا رکھا ہے

قاتل ابھی سوار بھی گھر سے نہیں ہوا
کشتوں کا ڈھیر چارطرف رہگزر میں ہے

رکھتا نہیں زمیں پہ مارے خوشی کے پاؤں
شاید جواب خط کا مرِ نامہ بر میں ہے

آنکھوں کے نیچے پھرتی ہے تصویر یار کی
پتلی سی اک بندھی ہوئی تارِ نظر میں ہے

قاصد کو ہاتھ داغ کے بھیجا ہے اپنے
خط کی نئی رسید کفِ نامہ بر میں ہے

آجاؤ تیغ باندھکے پھر سیر دیکھ لو
میرے گلے پہ ہے کہ تمہاری کمر میں ہے

آئینہ سامنے آتا ہے عروس لینے کو
ہوشیار او مرے دیوانہ بنانے والے

ہم جو پہنچے تو قیامت میں ہوا غل آئے
دھجیاں دامنِ محشر کی اڑانے والے

جامِ مے کاتبِ اعمال کو بھی دے ساقی
دو بزرگ آئے ہیں ساتھ اگلے زمانے والے

بولے حسرت سے وہ تابوت کو کاندھا دیکر
بوجھ اٹھواتے ہیں اب ناز اٹھانے والے

لاش پر میری وہ آئے تو نزاکت نے کہا
کہ یہ کاندھے نہیں تابوت اٹھانے والے

اپنے آئینے سے وہ پوچھتے ہیں کون ہو تم
میری تصویر کو سینے سے لگانے والے

کیا ہی راہِ عدم آباد ہے ہموار امیر
چین سے سوتے چلے جاتے ہیں جانے والے

دمِ اخیر تو ظالم ذرا نگاہ سے ملے
کچھ اس غریب مسافر کو زادِ راہ ملے

فنا جو قبلِ فنا ہو بقا کی راہ ملے
یہ قلعہ وہ ہے جہاں موت سے پناہ ملے

پڑا ہوں وہ کعبہ نشیں جا کے دیر کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

ہزاروں وعدے کیے پر نہ کی دعا اک دن
فقیر بھی ہیں چھوٹوں کے بادشاہ ملے

کرم کرے جو وہ بندہ نواز بندوں پر
بتوں کو ڈھونڈنے نکلیں خدا کی راہ ملے

چلا ہوں دشتِ مصیبت میں چال سوز کی
قدم قدم پہ مجھے ڈوبنے کو چاہ ملے

سرِ راہِ عدم گورِ غریباں طرفہ بستی ہے
کہیں غربت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقات رحمت کے
ہمارے میکدے میں رات دن رحمت برستی ہے

خمارِ نشۂ مے سے نگاہیں آنکھ کی ہٹتی ہیں
یہاں کیا کام تیرا یہ تو متوالوں کی بستی ہے

دمِ مستی صراحی کی اشکباری دیکھ اے ساقی
گھٹا ہلکی سی ہے پر جھوم کر کیا کیا برستی ہے

کبھی کروٹ نہیں لیتا کوئی گورِ غریباں میں
یہ کیسی نیند سوتے ہیں یہ کیسی انکی مستی ہے

چلے نالے ہمارے یہ زبانِ حال سے کہہ کر
ٹھہر جانا ہو تھک کر عرش پر ہمت کی پستی ہے

ترے قرباں آمرگِ غریبی جلد آ تب لے چل
وطن کے دیکھنے کو روح مدت سے ترستی ہے

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری ہمت کی پستی ہے

نہ ہو جو آپ ہی میں اُس سے کچھ پایا اور کیا پایا
تکلف برطرف ساقی کہ وقتِ جوشِ مستی ہے

بڑھا اے آہِ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہونچی
بلندی کو بلندی جانتا ہمت کی پستی ہے

تری آنکھوں کو کیا تشبیہ دیں ہم چشمِ آہو سے
وہاں شوخی ہی شوخی ہے یہاں شوخی و مستی ہے

نفس کی آمد و شد پر نہ دم بھر زندگانی کا
ارے غافل یہی مقراضِ بہرِ رختِ ہستی ہے

نئی ترکیب پائی چشمِ بدور اُنکی آنکھوں نے
غزالوں کی ہے شوخی نرگسِ شہلا کی مستی ہے

امیر اک تختۂ ہموار ہے یہ شعر کا کوچہ
طبائع کے تفاوت سے بلندی اور پستی ہے

امیر آتی ہے یہ آواز ناقوسِ برہمن سے
بتِ پندار کو توڑو جو شوقِ بت پرستی ہے

بلبلو پھولوں سے کیا پوچھتے ہو حالِ چمن
باغ میں یہ تو ہیں دو روز کے رہنے والے

گلفروشوں کا ملے رتبۂ گل اتنے کہاں
وہ پکاریں مجھے اے پھولوں کے گہنے والے

منزلِ گور سے دم لیکے بڑھیں گے آگے
ہم مسافر ہیں بڑی دور کے رہنے والے

ہجو مے ہو چکی ممبر سے اب اُتریں نیچے
رند کچھ حضرتِ واعظ سے ہیں کہنے والے

سادہ سمجھو نہ انھیں رہنے دو دیوان میں میر
یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے

چھٹ گئی افشاں جبیں پر کچھ ستارے رہ گئے — آسمانِ حسن پر گنتی کے تارے رہ گئے
تیغ کا پانی پلایا سب کو اوس سفاک نے — تشنہ لب ہم ایک دریا کے کنارے رہ گئے
موت آئے یا وہ آئے یا قیامت ہو امیر — اب یہی دو تین جینے کے سہارے رہ گئے

آنکھ اُس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے — چلئے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے
جس نے لکھا ہے نامہ اُس عالم آشنا کو — جانے کو جان میری تیار ہو گئی ہے
ہم تم چمن میں چل کر جب چار دن رہے ہیں — بلبل میں اور گل میں تکرار ہو گئی ہے
سب کی نظر میں ہیں وہ گو دل میں ہیں ہمارے — خلوت کی کوٹھری بھی بازار ہو گئی ہے
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں — جس دن سے کھچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے
رنگیں بیاں ہوئی ہے بلبل یہ وصفِ گل میں — پتی گلاب کی اب منقار ہو گئی ہے

جلوہ گر یار مگر قتلگہِ عام میں ہے — جب بُلاتا ہوں میں سنتا ہوں قضا کام میں ہے
دورِ جاری رہے ہر وقت مئے گلگوں کا — پڑھ لے ساقی یہی تحریر خطِ جام میں ہے
نہ ہوا نالۂ مظلوم سے ظالم بیدار — پھنک چکا صور یہ مردہ ابھی آرام میں ہے
آنکھ خالی نہ دکھا لطف بھی کر اے ساقی — جام ہی جام ہے یا مے بھی کہیں جام میں ہے
الفتِ پنجتنِ پاک سے دل ہے معمور — پانچ میخانوں کی مے ایک مرے جام میں ہے
روز کی وعدہ خلافی ہے ترا وعدہ بھی — رات دن میری طرح گردشِ ایام میں ہے
نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر — یہ بڑا حسنِ خداداد مرے نام میں ہے

غضب کی عشوہ گری ہے ردِ خشمگیں میں رہی — کرشمہ بن کے شکن یار کی جبیں میں رہی

تری شبیہ میں کی صرف اس قدر لطافت — سکت نہ پھر قلم صورت آفریں میں رہی

گھٹا عتاب تو پہنا لباس آرائش — جبیں سے چین جو اتری تو آستیں میں رہی

عجب رسائی قسمت ہوا ہے حنا تیری — چمن جو چھوٹ گیا دستِ نازنیں میں رہی

تنگ آ کر ترے بیمار نے بیتابی میں — جب مسیحا کو پکارا ہے اجل آئی ہے

موت کو ہم جو حیاتِ ابدی سمجھے ہیں — ملک الموت کو بھی نازِ مسیحائی ہے

بیکسی پھرتی ہے قمری کی طرح گرد امیر — سروِ آزاد مرا مصرعِ تنہائی ہے

او بندۂ بت دیکھ خدا اور ہی کچھ ہے — بت پردہ میں پردے میں چھپا اور ہی کچھ ہے

آغازِ جوانی میں ادا اور ہی کچھ ہے — اُٹھتی ہوئی کونپل میں مزا اور ہی کچھ ہے

قاصد یہ زباں اُنکی بیاں اُسکا نہیں ہے — دھوکا ہے تجھے اُسنے کہا اور ہی کچھ ہے

کہتے ہو کہ ہم درد کسی کا نہیں سُنتے — میں نے تو رقیبوں سے سنا اور ہی کچھ ہے

ہم مر بھی گئے مر کے ہوئے خاک بھی لیکن — ظالم یہی کہتا ہے وفا اور ہی کچھ ہے

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد دعا کی — پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

ہم مر گئے آنے کی جو آن کے خبر آئی — افسوس اجل چار قدم پیشتر آئی

کہئے جو چاہیے مسجد میں جنابِ واعظ — آپ سے ہم سے تو میخانے میں حضرت ہوگی

لیے سب نفس کشی کیا فقرا کرتے ہیں — ترکِ لذت میں بھی انکو کوئی لذت ہوگی

دستِ معشوق کے ہیں جیبِ گریباں مشتاق — ای جنوں یہ ترے ہاتھوں نہیں چھٹنے والے

جو نازک طبع ہیں محفوظ ہیں قہرِ الٰہی سے — کبھی چھالے حبابوں کے نہ پھوٹے خارِ ماہی سے

وہ خوش ہنگامِ آرائش ہیں اپنی کج کلاہی سے — لرزتا ہے مرا دل آئنے کی بد نگاہی سے

وہ مجرم ہوں گنہ کا عذر بھی ہو کر نہیں سکتا — کہ رحمت اسکی شرماتی ہے میری عذر خواہی سے

مرا دل اوت تکر چلتے چلتے کر دیا چھلنی — نگاہیں بر چھیاں مڑ مڑ کے کیا کیا کج نگاہی سے

الٰہی وہ بھی دن آئے کہ وہ بت مجکو بلوائے — کہوں میں ایک دم فرصت نہیں یادِ الٰہی سے

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے — قربان ہونے والے پہ قربان جائیے

خنجر کمر سے کھینچ کے گردن پہ رکھدیا — اور بولے ابتو کہہ ترے قربان جائیے

اچھا ہوا کہ حضرتِ دل واں دھرے گئے — کس نے کہا تھا نکلے نگہباں جائیے

جیسا ہو دیس بھیس بھی ویسا ہی چاہیئے — جنگل کو چاک کر کے گریبان جائیے

اس بانکپن سے قتل ہوا ہیں کہ کہہ اٹھو — ایسا ہو جان نثار تو قربان جائیے

یہ رشک مد بلا ہے دمِ رخصتِ حبیب — کیونکر کہوں خدا ہے نگہبان جائیے

جانے کو منع میں نہیں کرتا مگر حضور — دل سے مرے نکال کے ارمان جائیے

کیا ہند میں کمی ہے معشوق کی امیر — شیراز جائیے نہ خراسان جائیے

کسقدر زار ہے عاشق تیرا — رنگ کے ساتھ اُڑا جاتا ہے
سر بکف میں ہوں وہ شمشیر بکف — فیصلہ آج ہوا جاتا ہے
دل لگی سمجھے ہو دل کا آنا — جان جاتی ہے جب آجاتا ہے

قتل میں کس لیے ہے اب تاخیر — آپ موجود بندہ حاضر ہے
چشمِ پرخوں کے دیکھنے سے امیر — دل کا جو رنگ ہے وہ ظاہر ہے

یوں آنسوؤں سے ہے دلِ مضطر کی خرابی — برسات میں ہو جیسے کسی گھر کی خرابی
ہر چند کہ ہو صاف سخن لاف ہے بیجا — ہوتی ہے گرج جانے سے گوہر کی خرابی

ساقی ہو برقِ مے کہیں شیشے سے جلوہ گر — گلشن پہ کیا سیاہ ہیں بادل گھرے ہوے

ہاتھ طوقِ گردنِ مینا کیے — میکدے میں ہم مزے لوٹا کیے
ہم وہ میکش تھے کہ پی جب تک شراب — دامنِ قاضی سے منہ پونچھا کیے
حضرتِ ناصح یہاں آئے تھے آج — دیر تک کچھ بیٹھے جھک مارا کیے
آئینے کو تم نے دکھلایا جمال — ہم سہارے بیٹھے منہ دیکھا کیے
مہکے جب داغِ دل بولا وہ گل — پھول جو ہمنے دیے تھے کیا کیے
دخترِ رز آئی ہمارے پاس امیر — اور میکش دور سے تاکا کیے

نیمجاں چھوڑی ہوی مقتل سی جاتا ہی وہ شوخ — اَی نگاہِ یاس یہ تیرے اثر کا وقت ہے،

صبا کو یہ کیا موج آج آگئی — کہ پھولوں سے تربت مری چھا گئی
نئی چشمِ ساقی کو موج آگئی — مری عمر کا جام چھلکا گئی
جہاں سے مجھے لائی تھی پیریِ عمر — وہیں سیر دکھلا کے پہنچا گئی
خدا جانے وہ تیغ کیا وقتِ قتل — گلے مل کے بسمل کو سمجھا گئی
مرے عشق کی وجہ ناصح نہ پوچھ — طبیعت ہی تو ہے ادھر آگئی
اُدھر شرم ادھر تو بہ ٹوٹی امیر — شکست آج دونوں طرف آگئی

کہیں یہ بھی نہ چھپ جاے نظر سے — نزاکت لپٹی جاتی ہے کمر سے
نہ آیا تیر جب کوئی اُدھر سے — لپٹ کر خوب رویا دل جگر سے
تڑپنے کا مزہ جی بھر کے لیلوں — ذرا تھم تھم کے درد اُٹھے جگر سے
مبارک تجھکو اے شوقِ شہادت — وہ لی تلوار قاتل نے کمر سے
ستم ہے تیر سے ہوتے آبِ پیکاں — مرا دل بوند بھر پانی کو ترسے
ہجومِ آرزو ہے وقتِ آخر — پتنگے لپٹے ہیں شمعِ سحر سے
ذرا ٹھہر وابھی جوڑا نہ کھو لو — نزاکت پوچھ لے پہلے کمر سے
امیر اُس قتلگہ کو لے چلا ہے — لپٹ کر خود مرا دامن کمر سے

رُکا خنجر جو دستِ نازنیں سے — چھری جھنجھلا کے لی چینِ جبیں سے

حذر مے سے مسلم اور جو واعظ ملے دست بتان نازنیں سے
یہ کس کا آستانہ ہے کہ سجدے گرے پڑتے ہیں آغوش جبیں سے
جفائے آسماں کی داستانیں سنو گور غریباں کی زمیں سے
چڑھاؤ تیوریاں تم آئینے پر تمہارے ناز اُٹھیں گے تمھیں سے
اجل بھی چیخ اُٹھی ہم نے دم نزع وہ چٹکی لی نگاہ واپسیں سے

رہ عشق میں جس جگہ گر پڑا میں کہا ضعف نے تیری منزل یہی ہے
مرے دل کو ٹھکرا کے مجھ سے وہ بولے بڑی دھوم جسکی تھی وہ دل یہی ہے
عدو کو میں اس بزم سے تو اٹھاؤں جگہ اُسکے دل میں ہے مشکل یہی ہے
امیر اس کرم پر میں صدقے کہ اس نے کہا میری رحمت کے قابل یہی ہے

یہ کس بیدرد کس ظالم پہ اپنا دم نکلتا ہے یہ رہ رہ کر کلیجا چٹکیوں سے کون ملتا ہے
ذرا سی جان ہے پر دل جگر پروانے کا دیکھو کہ جلتی آگ میں کس شوق سے گر گر کے جلتا ہے
خرام ناز پر اُنکے گریبان چاک کرتا ہوں کسی کے پاؤں چلتے ہیں کسی کا ہاتھ چلتا ہے
جو کہتا ہوں کہ میرا دم نکلتا ہے تو کہتے ہیں ہمارے وصل کا ارمان تو یوں ہی نکلتا ہے
سزا قاضی کی کیا چھڑوائیگی مستوں سے میخواری قلم جب باغباں کرتا ہے انگور اور پھلتا ہے

زاہدوں کی توبہ ٹوٹی لڑکھڑایا پائے شیخ کچھ عجب مستانہ رُت ہے ساقیا برسات کی
ہجر میں سب بے مزہ ہے وصل میں سب بامزہ فصل گرمی کی ہو یا جاڑے کی یا برسات کی

ہم دل جلے گئے تو جہنم پکار اُٹھا — یارب سزا ملی یہ مجھے کس گناہ کی
کس کی سواری آتی ہے صحرا میں اے جنوں — اُٹھ اُٹھ کے رقص کرتی ہے کیوں گردِ راہ کی

ہم پر کسی نے لطف کیا یا ستم امیر
ہم نے اسی کی شانِ کرم پر نگاہ کی

پوچھتا کیا ہے کہاں دل جگر اے جان گئے — جاتے کمبخت کہاں سب ترے قربان گئے
کیا کہیں دل سے کہاں وصل میں ارماں گئے — ناز کے صدقے تو انداز کے قربان گئے
قاضی و محتسبِ شہر سد بارے حج کو — میکشو خوب پیو حلق کے دربان گئے

حق شناسی کی حقیقت کو انھیں نے جانا
اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو — اور معشوقوں کی ہوتی ہے اجازت کیسی
کیاریاں پھولوں کی دیکھیں جو کبھی گلشن میں — یاد آئی مجھے احباب کی صحبت کیسی
درد اُٹھ اُٹھ کے تہِ خاک جو تڑپاتا ہے — بیٹھی ہے مجھکو دبا کر مری تربت کیسی
ناوکِ ناز کی آمد جو یہ کہہ سن لی ہے — دل میں گھبرائی ہوئی پھرتی ہے حسرت کیسی

دیکھ غفلت میں جوانی کو نہ کھو — عمر بھر میں اک یہی تو رات ہے
بوتلوں سے راتدن ڈھلتی ہے مے — یہ نئی بدلی نئی برسات ہے

ہے توکل پر گزارا ہی امیر
اُسکے در کی بھیک پر اوقات ہے

دکھلا کے اک جھلک جو وہ روپوش ہوگئے
کیا کیا خیال خواب فراموش ہوگئے

بوسے لئے جو زلف کے مستی میں تو کہا
مے پیتے پیتے تم تو بلانوش ہوگئے

دفتر گرا ادھر تو ادھر کاتب عمل
تڑپے ہم اسقدر کہ سبکدوش ہوگئے

کاندھا ابھی جنازے کو دینا ہی جان من
کب کاٹ کر سر آپ سبکدوش ہوگئے

افسردہ داغ دل ہوے پیری میں کیا امیر
گویا چراغ صبح کو خاموش ہوگئے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے
نکیلے سجیلے جوان کیسے کیسے

ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا
مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے

اٹھائے ہیں مجنوں نے لیلی کی خاطر
شتر غمزۂ سارباں کیسے کیسے

جہاں چھیڑ نے پر وہ باتوں میں آئے
چلی بیکے نشتر زباں کیسے کیسے

کہیں قتل پر عشق میں خاتمہ ہے
ابھی دینے ہیں امتحاں کیسے کیسے

لٹکائے کیوں گئے ہیں یہ کیسی سزا ہوئی
گیسو تو خود بلا تھے انھیں کیا بلا ہوئی

موجود آکے وصل میں بھی لو حیا ہوئی
اک جان کا عذاب ہوئی شرم یا ہوئی

رحم آگیا کریم کو۔ محتاج دیکھ کر — حاجت ہی اس غریب کی حاجت روا ہوئی
اک عمر ہوگئی شبِ فرقت کو میرے گھر — اب بھی جو ابتدا ہے تو بس انتہا ہوئی
دیکھا نگاہِ گرم سے آج اسنے غیر کو — مقبول کس جلے ہوئے دل کی دعا ہوئی
آئنہ عاشقوں سے سوا ہے ستم نصیب — پہلے اسی غریب پہ مشق ادا ہوئی
گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اسقدر امیر — اتنی ہی سی تو بات ہے کہ حد وخطا ہوئی

بخشا امیر روزِ ازل ہی کریم نے
یاں پہلے مغفرت ہوئی پیچھے خطا ہوئی

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے — ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ ملجائے — سَو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے
دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بیتابی کو — ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے
راتیں اچھی ہیں دن اچھے ہیں مہینے اچھے — اچھے معشوق سے صحبت ہو تو سال اچھا ہے
دونوں آئینے ہیں آپس ہی رقیب اپنے حبیب — خوابِ معشوق سے عاشق کا خیال اچھا ہے
آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب — وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے
ماہ کامل مہ نو دونوں حسین ہیں لیکن — اک ذرا سن جو ہے کم اس سے ہلال اچھا ہے
روز آتا ہے مرے دل کو تسلی دینے — تجھ سے ای دشمنِ جاں تیرا خیال اچھا ہے
ناز کو جان کی ہے تاک ادا کو دل کی — دونوں خوش فکر ہیں دونوں کا خیال اچھا ہے
گرمیِ شوق یہ کہتی ہے چلو دیکھیں تو — سنتے ہیں طور پہ بھی ایک نہال اچھا ہے
برق اگر گرمیِ رفتار میں اچھی ہے امیر — گرمیِ حسن میں وہ برق جمال اچھا ہے

ساقیا جاتے ہیں پیاسے ترے میخانے سے — گھونٹ دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے

راز میخانے کے باہر نہوں میخانے سے — محتسب چھین نہ لے خط کہیں پیمانے سے

رقص کرنے لگا دم بھر میں چھلک کر ساقی — کہہ دیا جھک کے یہ کیا شیشے نے پیمانے سے

وہ تو معشوق ہی تڑپانے میں ملتا ہے مزہ — درد دل تجھکو ملا کیا مرے تڑپانے سے

کہتے ہیں وصل میں دیکھے کوئی چل پھر انکی — بڑے ہوشیار ہیں جو بنتے ہیں دیوانے سے

میرے غمخوار جو گھیرے ہیں انھیں میں کیا دوں — غم مرے پاس بچے بھی جو مرے کھانے سے

زاہد و وعظ کی مجلس ہی کسے ہے انکار — تم چلو پی کے میں آیا ابھی میخانے سے

شمع سے کتنے ہی اک ساتھ لپٹ جاتے ہیں — رشک مطلق نہیں پروانے کو پروانے سے

ساقیا دختر رز بھی ہے عجب مشاطہ — آ کے شیشے کو ملا دیتی ہے پیمانے سے

کی تھی ہم چشموں میں تعریف تری شوخی کی — آنکھ نیچی ہوئی میری ترے شرمانے سے

خوب جی بھر کے تصور کا ترے موقع ہے — میں بہت خوش ہوں شب ہجر کے بڑھ جانے سے

زیست کا لطف تو یاروں ہی کے دم تک ہے امیر — بیٹھ جاتا ہے دل احباب کے اٹھ جانے سے

ذکر مجنوں کس دل وحشی نے کیا ہے کہ امیر
وہی آواز چلی آتی ہے ویرانے سے

جب آنکھ اس شاہ خوباں پر پڑی ہے — نگہ تقدیر بن بن کر لڑی ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے — کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

نظر کس چشم فتاں سے لڑی ہے — کہ آنکھوں کو لئے نرگس پڑی ہے

زمانے بھر کی آنکھ اس سے لڑی ہے — جدھر دیکھو یہی آفت پڑی ہے

شبِ غم مجھ سے بیٹھا جائے کیونکر — تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

کلی کو باغ میں چھیڑا ہے کس نے — صبا یہ منھ لپیٹے کیوں پڑی ہے

بہت جلدی نہ کر قاتل دمِ ذبح — یہی تو حاصلِ عمر اک گھڑی ہے

نہیں رکتی چلی جاتی ہے دن رات — مری عمرِ رواں بھی اک گھڑی ہے

فلک کو پھونکتی ہے آہ دل کی — ذرا سی شمع لو اتنی بڑی ہے

ملا کر خاک میں آئے ہو کس کو — یہ کیسی گرد دامن پر پڑی ہے

نگاہِ ناز ہوتی ہے برآمد — سلامی کو صفِ مژگاں کھڑی ہے

اجل آئی ہے نذر اُس کے کریں کیا — ہماری جان تو تم میں پڑی ہے

تمھارے لب ہیں باغِ حسن کے پھول — تبسم اُنکی نازک پنکھڑی ہے

وہ بیٹھے ہیں مگر تیوری چڑھائے — مسیحا پاس - اجل سر پر کھڑی ہے

گرے ہیں جو لگن میں شمع سے پھول — پرِ پروانہ اُن کی پنکھڑی ہے

گرہ بندِ قبا کی کھل رہیگی — وہ کھولو جو گرہ دل میں پڑی ہے

مری میت کو ٹھکرا کر وہ بولے — کہاں کی نیند تم کو پھٹ پڑی ہے

زباں دی بہرِ وصل اور خود ہی بولے — میں سچ کہتا ہوں یہ چھوٹی بڑی ہے

نہیں پلکوں کی اوجھل ہیں وہ پتلی — دلہن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

ادا قاتل ہے الزام اُسکے سر پر — قضا کیا مفت میں ماری پڑی ہے

ہنسے ہیں جب دہانِ زخمِ بسمل — تو اک تلوار اور اُسنے جڑی ہے

آگے آگے فتنۂ محشر چلے — چال قاتل کی اگر خنجر چلے

ابلے کے مانند ہم اس باغ میں
داغ لینے آئے تھے لیکر چلے

کوئے قاتل میں گزر آساں نہیں
آدمی تلوار پر کیونکر چلے

چھپ کے اس کوچے میں راتوں کو گئے
اپنے سائے سے بھی ہم بچکر چلے

یہ ملی کس جرم پر دم کو سزا
حکم ہے دن بھر چلے شب بھر چلے

جرم اپنا موج کی تقصیر کیا
کیوں حباب اتنا اٹھا کر سر چلے

گل گیا آخر تہ تربت کفن
ایک جوڑا حشر تک کیونکر چلے

ضعف اس کوچے میں کہتا ہے امیر
بیٹھئے صاحب کہاں اٹھکر چلے

رہنے کیا دنیا میں آئے تھے امیر
سیر کر لی اور اپنے گھر چلے

تری صورت کچھ ایسی کلک قدرت سے حسیں نکلی
کہ اسکی ہر ادا سے شان صورت آفریں نکلی

وفا کی داد دینے میں بھی شرمیلی دُہن میں
دُہن پردے سے نکلی یا زباں سے آفریں نکلی

ہوا دیدار اُس کا خواب میں باتیں تصور میں
کوئی حسرت کہیں نکلی کوئی حسرت کہیں نکلی

عجب لذت بھرے ہاتھوں سے قاتل نے کیا زخمی
کہ منہ سے اُف نکلنے کی جگہ بھی آفریں نکلی

تن بیجاں کو زیر خاک کیا دھر دھر کے پیسا ہے
ستم کرتے میں اُستاد آسماں کی بھی زمیں نکلی

شریک حال عاشق بیکسی میں کون ہوتا ہے
جو نکلی بھی تو کچھ دل سوز آہ آتشیں نکلی

خبر ہے نعش پہ کس بیوفا کے آنے کی
کہ جان ابھی سے ہے مشتاق جا کے آنے کی

نکالے لیتے ہیں وہ مانگ اور دل یہ کہتا ہے
نکل رہی ہے سڑک یہ بلا کے آنے کی

شبِ وصال میں اس شوخ کو پلا کے شراب | میں راہ میں روک رہا ہوں حیا کے آنے کی

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کے وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

یہ آتا ہے جی میں کہ کوثر پہ چلیے | خرابات میں دُور کی سوجھتی ہے

یہاں تو مری جان پر بن رہی ہے | تمھیں جانِ من دل لگی سوجھتی ہے

بُرا دختِ رز کو کہے کیوں نہ واعظ | بُرے کو بھلی بھی بُری سوجھتی ہے

بُری ہو نہ قسمت الٰہی کسی کی | کہ جو سوجھتی ہے بُری سوجھتی ہے

جو کہتا ہوں اُن سے کہ آنکھیں ملاؤ | تو کہتے ہیں تم کو یہی سوجھتی ہے

امیر ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں
نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے

جوہرِ انتخاب

گوہرِ انتخاب کی طرح یہ بھی افراد کا ایک مختصر مجموعہ ہے مگر گوہرِ انتخاب سے بہت کم ہے۔ کل دو سو چوراسی شعر ہیں۔ صنم خانۂ عشق کے آخر میں مثل ضمیمہ کے چھپا ہے۔ ایک ایک شعر فصاحت کی تصویر اور بلاغت کی جان ہے۔ زبان کی شیرینی بیان میں نہیں آسکتی۔ میری رائے میں جس شاعر کے خزانۂ تصنیف میں صرف جوہرِ انتخاب ہو وہ زبانِ اردو کا سحبانِ وائل ہونے کا دعوے کر سکتا ہے اور کوئی اسکی تردید نہیں کر سکتا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہاتھ رکھکر مرے سینے پہ جگر تھام لیا
تم نے اسوقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

وحشت میں کہاں اب کوئی ہمپایہ ہے میرا
سب چلدیئے ہمزاد ہے یا سایہ ہے میرا

راہ بتلادی عدم کی خضرِ منزل مل گیا
گھر سے اچھے وقت نکلے تھے کہ قاتل مل گیا

کیف حاصل ہو لگے داغ نہ میخواری کا
مستیٔ عشق بڑا کام ہے ہشیاری کا

جاکر دوست وہ ہوئے شاکی
چاہیے شکر اس شکایت کا

لے گئے مسجد سے مجھکو شیخ بہکے
توبہ توبہ میں پکارا ہی کیا

بسترِ خواب کو دیکھو کہ ہے سکڑی سکڑی
حال کیا پوچھتے ہو ہجر کی بیتابی کا

قبر کھولی تو مگر سینۂ وحشت سے ڈرا
اپنی چادر بھی یہیں دفن کفن چھوڑ گیا

خط وطن کو لئے جاتا ہے تو لیجا قاصد
پر مرا حال نہ یارانِ وطن سے کہنا

مجھ سے بیکس کے پاس رہتا ہے — کتنا مسکین نواز ہے غم دوست

حسن کہ وہ جہاں میں ہے ذاتِ الٰہ ایک — دو آنکھیں جسطرح کہ ہیں اُنمیں نگاہ ایک

سے ہے قصد شب غم میں کریں دل ہی سے باتیں — پھر کہتے ہیں دیوانے سے کیا بات کریں ہم

دن گیا رات ہوئی رات گئی دن آیا — نہ ہوئی پر نہ ہوئی گردشِ ایّام تمام

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — رہ گئی ایک نہیں ہاں کا کہیں نام نہیں

دیکھنے کو تمہیں اے اہلِ عدم آتے ہیں — خیر اگر تم نہیں آتے ہو تو ہم آتے ہیں

ہر چند نہیں وصال ممکن — وہ چاہے تو ہے محال ممکن

کھا کے تلوار جو قاتل کی فغاں کرتا ہوں
لذّتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں

کوئے جاناں سے میں کب جاتا ہوں — روز کہتا ہوں کہ اب جاتا ہوں

کبھی وہ دن تھے کہ خورشید تھا میں — اب تو سائے سے بھی دب جاتا ہوں

ہجومِ رنج ہے اس کا خیال کچھ بھی نہیں — ملال یہ ہے کہ اُن کو ملال کچھ بھی نہیں

دل بھی ہے انتظارِ یار میں گم — اب کہو کس کا انتظار کروں

بعدِ مرگ آئے ہیں وہ تربت پر — اب کہاں جان جو نثار کروں

کیوں کہوں اُن سے کہ چھوڑو شیوۂ جور و ستم
ترکِ عادت ہے عداوت میں کوئی دشمن نہیں

اُس کوچے میں کچھ رہرو ونکے نقشِ قدم ہیں
کچھ طالبِ دیدار بچھا آئے ہیں آنکھیں

کہاں کوئی محرم کہوں کس سے غم — کہ غم کے سوا کوئی محرم نہیں

ٹھہر ٹھہر کے ذرا ایچلو مرا تابوت　　کہاں اُمید کہ پھر آؤں کوئے قاتل میں

ترے وعدہ پہ شاد ہوں کیونکر　　اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں

فقط دو ہاتھ سو ہے ایک میں جام ایک میں شیشہ

کہاں وہ ہاتھ ہے اب جو پڑے ساقی کی گردن میں

جان دی تب ملی مجھے راحت　　موت سے کچھ میں شرمسار نہیں

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو　　تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

نہیں گھیرا ہے پلکوں نے یہ چشم مست دلبر کو

لیا ہے دونوں ہاتھوں سے کسی میکش نے ساغر کو

منکر گوشہ نشینان خرابات نہو　　کہ یہی گوشہ کہیں قبلہ حاجات نہو

پہلے زلفوں کو سنگھا کر مجھے بے ہوش کرو

پھر مرے سینے سے تم تیر کا پیکاں کھینچو

سناؤں کیا انہیں نالے میں اپنے راتوں کو

وہ دل میں خوب سمجھتے ہیں ایسی باتوں کو

آپ تو دیکھتے چلتے ہیں وہ جوبن اپنا　　دیکھتا میں ہوں تو کہتے ہیں کہ کیا دیکھتے ہو

دیکھے کہاں تھے ایسے حسینوں کے جمگھٹے　　محشر کا روز اور الٰہی دراز ہو

ٹالتے ہیں روز وہ پر دل مرا مسرور ہے　　آج کل کب تک کرینگے کیا قیامت دور ہے

ہے دُختِ رز حلال تجھے کیا تمیز ہے　　واعظ یہ زر خرید ہماری کنیز ہے

دل چرایا ہے مرا پروہ خجل کتنا ہے　　فق ہوا جاتا ہے منہ چور کا دل کتنا ہے

وہ دوپہر کو گھر سے ہمارے نکل گئے　　ہم دن ڈھلا تو گور کے سانچے میں ڈھل گئے

جاری ہے لین دین یہ رسمِ زمانہ ہے
دریا کا ابر ابر کا دریا خزانہ ہے

وہ ہم نازک دلوں کو آنکھ دکھلائے تو کیا گزرے
دکانِ شیشہ گر میں مست آ جائے تو کیا گزرے

میرے گھر ہے قصد آنیکا تو آؤ ناز سے
پر ذرا چھپ کر سپہر تفرقہ پرداز سے

بتوں کی روش کوئی کیا جانتا ہے
بڑے بے وفا ہیں خدا جانتا ہے

فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے
آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے

اسلئے در پر صدا دیتا ہوں میں
بول اُٹھے شاید وہ آتا کون ہے

جینا بھی دل جلوں کو تمہارے ممات ہے
اخگر کو موت قطرۂ آبِ حیات ہے

نشۂ مے نے کر دیا اندھا
خاک سوجھے رہِ صواب مجھے

پسند آئی نہ دستِ جنوں کی بیکاری
جنوں میں اس لئے پھاڑا ہے پیرہن ہمنے

ہم بتوں سے امیدوارِ کرم
کارخانے ہیں اُسکی قدرت کے

عجب دلچسپ نقشہ عالمِ ایجاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اُسے دل یاد رکھتا ہے

نہ یہ ساعد نہ یہ بازو نہ یہ آنکھیں نہ یہ ابرو
فقط تیرا سا قد ہے اور کیا شمشاد رکھتا ہے

دلِ بے آرزو بھی دی تو بے لطف
یوں تو سب کچھ دیا خدا نے مجھے

دے کہیں حکم نہ وہ گھر سے نکلوانے کا
بیخودی جلد مجھے آپ سے باہر کر دے

دیت کے واسطے محشر میں کب ہوں دامنگیر
مجھے نمود ہے منظور اپنے قاتل کی

کہہ دو جانا ہے کہیں سے مطلب
جان لینے کو اجل آتی ہے

اک دن مرے گھر ماہِ محرم میں تو آؤ — اب مہندی لگانیکا بہانہ تو نہیں ہے

مجھے جب دور سے دیکھا وہ بولے — کوئی ناوک فگن ہے یا نہیں ہے

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں — صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے

پرزے خط کے ہیں دستِ قاصد میں — ایک کیا سو جواب لایا ہے

شبِ فرقت تو ابد تک نہیں ہونے کی تمام
ترے عشاق کو اندیشۂ فردا کیا ہے

میں ہر اک سے جو خطا اپنی بیاں کرتا ہوں
ہے یہ مطلب کہ اسے کوئی ستمگر نہ کہے

دشمنوں کا شکوہ کرتے ہیں حضورِ دوستاں
دوست جب دشمن ہو پھر کس سے شکایت کیجئے

وعدۂ وصل نے کیا بیخود — دیکھئے کیا وصال میں گزرے

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ
اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

خوشا تقدیرِ بلبل بیٹھ کے گل کہتی ہے حال اپنا
نہ قاصد کی ضرورت ہے نہ حاجت ہے کبوتر کی

مشتاقِ ستم ہوگا نہ مجھ سا کوئی بسمل — ہر زخم کی قاتل کی طرف آنکھ لگی ہے

چمن اشکِ مجنوں سے سینچا ہے شاید — کہ سنبل میں گیسوے لیلی کی بو ہے

خواب میں آئے تھے وہ غیر کے ساتھ — کھل گئی میری آنکھ خیر ہوئی

تکلیف ہی پر شکر گدا کو ہے مناسب — شاہوں کی طرح کچھ غمِ عالم تو نہیں ہے

محامد خاتم النبیین

یہ حضرت امیر کا نعتیہ دیوان ہے۔ نعت گوئی میں وہ آزادی کہاں جو عاشقانہ تغزل میں ہوتی ہے۔ باوجود اس کے حضرت امیر کا نعتیہ کلام بہت رنگین و بامزہ ہے۔ جو شخص ان اشعار کو سنتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ عاشق رسول کا کلام ہے۔ اور محافل میلاد و سماع میں اس کلام سے بڑی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور کیوں نہو یہ شاعری دراصل امیر کی چکش خاطر ہے۔

مولانا غلام امام شہید رح کی نعت بھی عشق میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن امیر کی نعت میں عشق کے ساتھ متانت اور فصاحت و بلاغت کا زیادہ لطف ہے۔ اور قوت گویائی مصرع مصرع سے نمایاں ہے تھوڑے سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

مژدہ اے امت کہ ختم المرسلیں پیدا ہوا — انتخاب صنع عالم آفریں پیدا ہوا
نور جسکا قبل خلقت تھا ہوا اسکا ظہور — رحمت آئی رحمۃ للعالمیں پیدا ہوا
کان رحمت سے ہوا یا قوت رمانی کا ظہور — قلزم توحید کا دُرِ ثمیں پیدا ہوا

داغ سینے میں جو حضرت کی محبت کا پڑا — ہم یہ سمجھے کہ چراغِ شب تربت پایا

بالائے آسمان کہ سرِ لامکاں نہ تھا
احمدؐ کے حسنِ پاک کا جلوہ کہاں نہ تھا

معراج کے سفر میں ملائک تھے راست و چپ
افسوس میں غبارِ پسِ کارواں نہ تھا

اچھا ہوا کہ اُلفتِ حضرتؐ میں جان دی
ان داموں اے امیرؔ یہ سودا گراں نہ تھا

مومن کو عشقِ سرورِ عالی صفات کا
طوفانِ حشر میں ہے سفینہ نجات کا

یہ بھی حضرتؐ کی محبت کا تصرف ہے امیرؔ
غرقِ دریا ہوے دامن نہ ہوا تر اپنا

بیاں کیا ہو شہنشاہِ عرب کی شان و شوکت کا
فلک جس کے درِ دولت پہ نقارہ ہے نوبت کا

دکھاتا ہے تماشہ لختِ دل کیا یادِ عارض میں
مژہ سے گرتے گرتے پھول بنجاتا ہے جنت کا

خلف وہ ہے کرے جو نام روشن جدِّ امجد کا
الف احمدؐ کا میم احمدؐ کا دال آدم میں احمدؐ کا

کھچا ایسا پری نقشہ سراپائے محمدؐ کا
کہ نقاشِ ازل نے آپ سایہ رکھ لیا قد کا

اُتر کر عرش سے لیتے ہیں بوسے رات دن قدسی
دبایا سنگِ در نے تیرے پہلو سنگِ اسود کا

شبِ معراج حوروں نے بچھائیں اسقدر آنکھیں
کہ سبزۂ نرگستاں ہوگیا چرخِ زبرجد کا

مدینے میں نہ کیونکر لہلہائے سبزۂ جنت
خضر چھڑکاؤ کرتے پھرتے ہیں آبِ زمرد کا

تمنا ہے کہ اک اک بال کی موشو بلائیں لے
دلِ عدو چاک شانہ بن کے گیسوئے محمدؐ کا

قدم سے کیا ہی تیز آئی سواری جانبِ امکاں
نہ پہونچا سا تھ آخر رہگیا سایہ وہیں قد کا

سیہ کارانِ اُمت اور سب کڑیاں اُٹھالینگے
الٰہی سلسلہ چھوٹے نہ گیسوئے محمدؐ کا

امیرؔ اُس روضہ پر پہونچوں تو استغنا ہی اور میں ہوں
جو یہ مقصد روا ہو قصد ہے پھر ترک مقصد کا

قاب قوسین جسکو کہتے ہیں	ہے وہ ادنیٰ مقام احمدؐ کا
ہم نے میخانۂ ازل میں امیرؔ	پی لیا بھر کے جام احمدؐ کا

کیوں عالمانِ دین کا نہ قایل ہوں میں امیرؔ
یہ لوگ بھی ہیں مظہرِ انوارِ مصطفیٰ

تو اے دلِ وحشت زدہ دیوانہ ہی کس کا | کس شمع پہ قربان ہے پروانہ ہی کس کا
حوروں نے کہا دیکھ کے ملبوسِ اویسی | بخشا ہوا یہ خلعتِ شاہانہ ہی کس کا
کن اُلجھے ہوئے بالوں کی سلجھائی کی دُھن ہے | یارب دلِ صد چاک مرا شانہ ہی کس کا
دعویٰ جو کرے اُلفتِ محبوبِ خدا کا | یہ حوصلہ اے ہمتِ مردانہ ہی کس کا
حضرتؐ کے جو مستوں کا دہاں دُور نہیں ہے | خورشید چھلکتا ہوا پیمانہ ہے کس کا
ہیں دیدہ و دل دونوں امیرؔ اُس کے ٹھکانے | یہ قصر ہے کس کا وہ جلوخانہ ہی کس کا

جب مدینے کو رواں ہند سے محمل ہوگا | مجھ سے بھی چار قدم آگے مرا دل ہوگا
آپ کے نور کو خالق نے کیا جب پیدا | آئی آواز یہ پیغمبرِ کامل ہوگا
حضرتؐ آتے ہیں دمِ نزع نہ گھبرا تو امیرؔ | ابھی آسان ترا عقدۂ مشکل ہوگا

یہ سوال آخری ہے بندۂ درگاہ کا | خاتمہ بالخیر ہو صدقہ رسول اللہ کا
طوف کرتے کرتے روضے کا چمک اُٹھی نصیب | گرد پھرتے پھرتے ہالہ بن گیا ہیں ماہ کا

قطرے کے منہ سے نام جو اُن کا نکل گیا | بادل سے گر کے روئے ہوا پر سنبھل گیا
لکھا جو وصفِ گیسوئے پیچانِ مصطفےٰ | کچھ مغفرت میں کل جو رہا تھا نکل گیا
حضرتؐ نے جس کے حق میں کہا جو وہی ہوا | کیا اختیار تھا کہ مقدر بدل گیا

میں نے چاہا ہے اُسے جس کو خدا نے چاہا | دل دھڑکتا ہے کہ کیا روزِ قیامت ہوگا

جھونکا جو کوئی آئے مدینے کی ہوا کا ٹھنڈا ہو کلیجا ترے مشتاق لقا کا
بیمار رہوں میں الفتِ محبوبِ خدا کا اس درد میں ملتا ہے مزہ مجکو دوا کا

خلشِ دردِ محبت میں بڑی لذت ہے اور اس درد کو پہلو میں بڑھا دے یارب
غش تری شانِ جلالی سے مجھے آیا ہے دامنِ شافعِ محشر کی ہوا دے یارب

کیا سناتے ہیں یہ واعظ ہمیں جنت جنت اپنے نزدیک تو ہے روضۂ حضرت جنت

چل مدینے وقت تو نے ہند میں کھویا بہت رات اب تھوڑی ہے چونک اے بے خبر سویا بہت
جاگتے سوتے اُدھر کی لَو رہی دل کو لگی پھر نہیں پروا ہے تو جاگا جو کم سویا بہت

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آجکی رات آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آجکی رات
ہے سرِ شام سے رحمت کے فرشتوں کا نزول لیلۃ القدر ہے عالم میں مگر آجکی رات
حوریں فردوس سے نکلی ہیں نچھاور کرنے سر پہ رکھے طبقِ لعل و گہر آجکی رات
سر پہ سلطانِ دو عالم کے ہے سایا کرنا سب ملک بیٹھے ہیں تولے ہوئے پر آجکی رات
روشنی پھیلی ہے خورشیدِ رسالت کی امیر میرے گھر شام سے مہمان ہے سحر آجکی رات

وہ دائرہ جسکا کہیں آغاز نہ انجام نقطہ تھا جو اندر وہی باہر شب معراج

اللہ رے پاسِ ادبِ احمدِ مرسل — جبریل نے آنکھوں سے جگایا شبِ معراج

بازو درِ عرفاں کا ہے بازوئے محمدؐ — زنجیر اُسی دروازے کی گیسوئے محمدؐ
قوسین ہے تفسیرِ دو ابروئے محمدؐ — کونین تہہِ ظلِّ دو گیسوئے محمدؐ

ہوں مست مے اُلفتِ گیسوئے محمدؐ — ڈوروں کی جگہ آنکھوں میں ہیں موئے محمدؐ
دل میں ہے خیالِ رُخِ نیکوئے محمدؐ — اللہ کے گھر میں ہے بسی بوئے محمدؐ
کیا رنگِ تصور ہے کہ ہر سانس سے ملکر — آتی ہے ہوائے چمنِ کوئے محمدؐ
محشر میں مزہ ہوگا کہ اُٹھ اُٹھ کے لحد سے — سب سوے جناں جائینگے ہم سوے محمدؐ
ابرو مہِ نو عید کا دن ہے رُخِ پُرنور — عاشق کی شبِ قدر ہے گیسوئے محمدؐ
سبطینؓ سے ظاہر ہے وہی شان وہی آن — اک بوئے محمدؐ ہے تو اک خوئے محمدؐ
کس طرح اُٹھائے ہوئے ہیں بارِ دو عالم — ظاہر میں تو نازک سے ہیں بازوئے محمدؐ
اللہ رے رفاقت کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے — چھوڑا نہ پسِ مرگ بھی پہلوئے محمدؐ
رحمت کا وہاں شوقِ شفاعت کا یہاں ذوق — خالق کو پسند آئے نہ کیوں خوئے محمدؐ
سینے سے لگاؤں میں امیرؔ آنکھوں میں رکھوں — ہیں پھول مجھے خار و خسِ کوئے محمدؐ

تھے جلوہ گر زمیں پہ حضرتؐ مگر امیرؔ — دیتے تھے قدسیوں کو سبق آسمان پر

خوش تھے یوں اصحاب روئے مصطفٰےؐ کو دیکھکر

مصطفیٰ جس طرح انوارِ خدا کو دیکھکر

چٹک کے کہتا ہے غنچہ غنچہ گُلوں سے بڑھکر بہار تم پر
چہک رہی ہے چمن میں بلبل ہزار جانیں نثار تم پر
جلاؤ دوزخ کو کیسا کیسا بساؤ خلدِ بریں کو کیا کیا...
مزا ہو روزِ جزا جزا کو جو رکھدے پروردگار تم پر
نبوّت اک بے بہا تھا گہنا کہ سلسلہ وار سب نے پہنا
تمہیں کیا خاتم النبیین کھُلا کچھ ایسا یہ ہار تم پر

پوچھ لوں شہ سے تو لکھوں حور سے شادی کا خط
مانگتا ہے مجھ سے رضواں خانہ دامادی کا خط
شافعِ محشر جو حضرت ہیں تو پھر کیسے گناہ...
نامۂ اعمال ہے دوزخ سے آزادی کا خط

خلق کے سرور شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلّم
مرسلِ داور خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلّم
نورِ مجسّم نیّرِ اعظم سرورِ عالم مونسِ آدم
نوح کے ہمدم خضر کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلّم
فخرِ جہاں ہیں عرش مکاں ہیں شاہِ شہاں ہیں سیف زباں ہیں

سب پہ عیاں ہیں آپ کے جوہر صلی اللہ علیہ وسلم

بحرِ سخاوت کانِ مروت آیۂ رحمت شافعِ امت
مالکِ جنت قاسمِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم

قبلۂ عالم کعبۂ اعظم سب سے مقدم راز سے محرم
جانِ مجسم روحِ مصور صلی اللہ علیہ وسلم

دولتِ دنیا خاک برابر ہاتھ کے خالی دل کے تونگر
مالکِ کشور تخت نہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

رہبرِ موسیٰ ہادیِ عیسیٰ تارکِ دنیا مالکِ عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم

چشمۂ جاری خاصۂ باری گرد سواری بادِ بہاری
آئینہ داری فخرِ سکندر صلی اللہ علیہ وسلم

مہر سے مملو ریشہ ریشہ نعت امیرؔ اپنا ہے ہمیشہ
وردِ ہمیشہ دن بھر شب بھر صلی اللہ علیہ وسلم

پہونچ ہی جائینگے محبوب کے دیار میں ہم
یہ شوق ہے کہ نہیں اپنے اختیار میں ہم

کیا ہے جذبۂ کامل نے قافلہ سالار
امام سمجھے تو ہیں گو نہیں شمار میں ہم

امیرؔ لے کے چلے داغِ عشقِ شاہ کا گل
کرینگے سیرِ جناں گوشۂ مزار میں ہم

ضعف سے گو ہی اٹھانا مجھے دشوار قدم
شوق کہتا ہے کہ ہے شہرِ نبی چل قدم

سوئے تو آپکے کوچے میں پہونچ کر سوئے — واہ رکھتے ہیں عجب طالعِ بیدار قدم
ساتھ جب تک کہ نہ لی لینگے گنہگاروں کو — مصطفیٰ خلد میں رکھینگے نہ زنہار قدم

جو عرق ہیں وہ لائے رسالت مآب ہیں — کیونکر جلینگے حشر کے دن آفتاب میں
سبطین مصطفیٰ ہیں جو زہرا کے نورِ عین — رحمت کے یہ دو سورے ہیں اُم الکتاب میں
آئینہ ہے یہ پنجتن و چار یار کا — نقطے ہیں چار حرف میں پانچ آفتاب میں
جتنے سوال چاہیں کریں منکر و نکیر — حضرت کا ایک نام ہی سب کے جواب میں
مجرم ہو پاک آئے جو حضرت کے سامنے — ہوتا ہے خشک دامنِ تر آفتاب میں
کس قیدی بلا کا نہیں آپ کو خیال — پہونچے خبر جو بند ہوا ہو حباب میں
جائے جو سوئے عالمِ بالا نگاہِ قہر — پانی کا قطرہ قطرہ شرر ہو سحاب میں

مقامِ امتحاں میں دل جو اپنا تول لیتے ہیں — وہی سودائے بازارِ محبت مول لیتے ہیں
رقم کرتے ہیں جب مضمون سوادِ چشم حضرت کے — سیاہی مردمک کی آنسوؤں میں گھول لیتے ہیں
کشائش سب طرح کی ہی سرِ مژگانِ احمد میں — اسی ناخن سے عاشق دل کی عقدے کھول لیتے ہیں
ترازوئے طبع سنجیدہ ہی اپنی فیض حضرت سے — یہیں اچھے برے اعمال اپنی تول لیتے ہیں
امیر الفت جو دل میں رکھتے ہیں ابروئے حضرت کی — وہ اس کنجی سے قفلِ بابِ جنت کھول لیتے ہیں

جو لوگ الفتِ حضرت میں جان دیتے ہیں — ملک انہیں کو جناں کی زبان دیتے ہیں

کہدو رضواں سے ہمیں سیر کی تکلیف نہ دے — ہم مدینے ہی کو گلزارِ ارم سمجھے ہیں

وہ دن بھی ہو کہ روضۂ اقدس پہ ہوں مقیم — رضواں بلائے مجھکو کہوں میں یہاں نہیں
بے شبہ ہے ثبوت کے لایق وہ آستاں — پر لایقِ سجود کسی کی جبیں نہیں

دستگیری نہیں کرتے ہیں محمد کس کی — کون گرتا ہے کہ وہ تھام نہیں لیتے ہیں
اب تو للہ اٹھئے رخِ انور سے نقاب — دل جگر سینے میں آرام نہیں لیتے ہیں
خاکساروں کو ترے آبِ بقا سے کیا کام — خضر دیتے ہیں انہیں جام نہیں لیتے ہیں
جان دیتا ہے جو حضرت پہ وہ پاتا ہے بہشت — ایک کا مال وہ بے دام نہیں لیتے ہیں

پہونچا امیر خیرِ وری کی جناب میں — ہے لاکھ لاکھ شکر خدا کی جناب میں

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں — حسرت آتی ہے یہ پہونچا میں رہا جاتا ہوں
المدد المدد اے شافعِ روزِ محشر — بوجھ بھاری ہے گناہوں کا دبا جاتا ہوں
دو قدم بھی نہیں چلنے کی ہے طاقت مجھ میں — شوق کھینچے لئے جاتا ہے میں کیا جاتا ہوں
کاروانِ رہِ یثرب میں ہوں آوازِ درا — سب میں شامل ہوں مگر سب سے جدا جاتا ہوں

دودھ پیتے ہوئے اطفال نہ کیونکر بولیں — جب لبِ لعل کی تاثیر سے پتھر بولیں
دلِ زائر میں جو اکسیر کا آجائے خیال — بوٹیاں آپ ہی جنگل میں برابر بولیں

عاشقِ شاہ ہوں جھگڑیں جو قیامت تک
ہے یقیں میری طرف سارے پیمبر بولیں

ہوں تو مجرم پر نہیں شبہ مرے اقبال میں
نام حضرتؐ بھی ہے میرے نامۂ اعمال میں
یادِ احمدؐ میں جو روئیں اپنی آنکھیں اے امیر
ابرِ تر بھر بھر کے موتی لیگئے رومال میں

غل ہے معراج کی شب شاہِ امم آتے ہیں
مالکِ مہر و مہ و لوح و قلم آتے ہیں
آپ بالائے براق آتے ہیں اور روح امیں
بوسے دیتے ہوئے بالائے قدم آتی ہیں
نکلیگی عالمِ امکاں سے سواری شب کو
روشنی کرنے کو انوارِ قدم آتے ہیں
شان و شوکت کوئی دیکھے تو شہنشاہی کا
کہ ملایک لئے ہاتھوں میں علم آتے ہیں
اہلِ ہستی کا تو کیا ذکر ہے ایسی ہے خوشی
تہنیت کیلئے اربابِ عدم آتے ہیں
غول کے غول ملائک میں ادھر اور ادھر
واہ کس شان سے با جاہ و حشم آتے ہیں
جو گھڑی آتی ہے آواز یہ آتی ہے امیر
تو ہراساں نہو ہم آتے ہیں ہم آتے ہیں

نہیں ہے آپ کے رخ کا شمار پھولوں میں
بسی ہوئی ہے عروسِ بہار پھولوں میں
نثار کر ہمیں لے چل کے اے صبا اُس پر
پڑی ہوی ہے یہ ہر سو پکار پھولوں میں
ہر ایک گل چمنِ فاطمہ کا ہے اک باغ
یہ انتخاب ہے ستر ہزار پھولوں میں
زمانے بھر میں ہے اصحابِ پاک کی خوشبو
مہک گیا چمنِ دہر چار پھولوں میں
کسی میں آگئی بو ہی کسی میں آپ کا رنگ
عیاں ہے رحمتِ پروردگار پھولوں میں
نہیں ہیں اشک یہ اُس رخ کی یاد میں جاری
امیر ہے یہ رواں آبشار پھولوں میں

فرشتوں میں ہے ہنگامہ رسولِ پاک آتے ہیں
کھلیں رحمت کے دروازے شہِ لولاک آتے ہیں

ستاروں سے کہو آنکھیں بچھائیں انکی آمد ہے
ملائک جنکے در پر جھاڑنے کو خاک آتے ہیں

طلب معشوق کی عاشق نے کی ہے بھیجکر خلعت
لئے جبریل سر پر آپکی پوشاک آتے ہیں

براقِ برق دم سے برق خوش ہو ہو کر کہتی ہے
چلن کیا کیا تجھے اے توسنِ چالاک آتے ہیں

ہے آمد آمد انکی جن کے سودائے محبت میں
عدم سے سوئے ہستی گل گریباں چاک آتے ہیں

اٹھا کر انگلیاں کہتی ہیں موجیں بحرِ رحمت کی
کہ دریائے رسالت کے بڑے پیراک آتے ہیں

مدینے میں دلِ پُر داغ اپنا لیکے جاتا ہوں
بڑے سرکار کے دربار کی ڈالی لگاتا ہوں

مدینے کی زمیں کو جھاڑتا پلکوں سے جاتا ہوں
جو کانٹے راہ میں ملتے ہیں آنکھوں سے اٹھاتا ہوں

بہت ہی ناتواں ہوں نہیں قدم مشکل سے اٹھتا ہے
تو اے دل آگے آگے چل میں پیچھے پیچھے آتا ہوں

ضعیف و زار ہوں گو قافلہ سے مگر دیکھو
میں آواز جرس کیطرح آگے سب سے جاتا ہوں

تصدق اس عنایت پر میں اس اعجاز کے صدقے
کہیں ہوں آپ لیکن میں تو اپنے دل میں پاتا ہوں

فلک جو داغ دیتا ہے مجھے عشق محمد میں
اُسے آغوش میں لیکر کلیجے سے لگاتا ہوں

امیر اب میں یہاں گھبرا گیا ہوں جی نہیں لگتا
اٹھا کر منہ سے بستر مدینے میں لگاتا ہوں

مدینے کو سفر ہم اے دل ناشاد کرتے ہیں
یہ گھر برباد کرتے ہیں وہ گھر آباد کرتے ہیں

چلے جو سوے یثرب اُسکے دامن سے یہ جا لپٹے
ہم اس حسرت میں اپنی خاک کو برباد کرتے ہیں

مجھے افلاک اتنک خاک کا پیوند کر دیتے
مگر تیرا سمجھکر رحم یہ جلاد کرتے ہیں

ادھر عاشق یہ سمجھے ہیں اُدھر معشوق پر قربان
خدا کے ساتھ محبوب خدا کو یاد کرتے ہیں

فدا کرنے کو حضرت پر لئے چلتے ہیں اب اے دل
تو اک مدت کا قیدی ہے تجھے آزاد کرتے ہیں

کلام عاشق و معشوق میں بھی رنگ وحدت ہے
وہی ارشاد باری ہے جو آپ ارشاد کہتے ہیں

شفیع عاصیاں اب جلد آئیں شفاعت کو
گنہگاران امت دیر سے فریاد کرتے ہیں

مدینے میں صبا لائی ہے مژدہ کس کی آمد کا
کہ مرغان چمن شور مبارکباد کرتے ہیں

جدائی میں کہیں اک شعر یا رب وہ بھی وہاں آئے
کوئی کہہ دے کہ چل سرکار تجھکو یاد کرتے ہیں

امیر اتنی حقیقت ہے ہماری نعت گوئی کی
ملا ہے مہرباں فریاد رس فریاد کرتے ہیں

آنسو مری آنکھوں میں نہیں آئے ہوئے ہیں
دریا تری رحمت کے یہ لہرائے ہوئے ہیں

ہم اور عبادات و ریاضات کی لذت
سب تحفے یہ سرکار ہی کے لائے ہوئے ہیں

دیدیجئے پابوس کی اب ہمکو اجازت
کب سے دل بیتاب کو ٹھہرائے ہوئے ہیں

احکام تری شرع کے ہر نفس شقی کو
روکے ہوئے ڈانٹے ہوئے دھمکائے ہوئے ہیں

کیا پوچھتے ہو لوٹتے ہیں کیوں جگر و دل
یہ دونوں تمہاری ہی تو تڑپائے ہوئے ہیں

اللہ رے حیا حشر میں اللہ کے آگے
ہم سب کے گناہوں پہ وہ شرمائے ہوئے ہیں

امت کا مری بال نہ بیکا ہو یہ ہٹ ہے
گیسو سر دوش اسلئے بل کھائے ہوئے ہیں

میں نے چمن خلد کے پھولوں کو بھی دیکھا
سب آگے ترے چہرے کی مرجھائے ہوئے ہیں

کن آنکھوں کا بیمار ہوں یارب کہ مرے گھر
عیسیٰ بھی مجھے دیکھنے کو آئے ہوئے ہیں

عشاق کی آنکھوں کو رلاتے ہو تمہیں تو
یہ جام تمہارے ہی تو چھلکائے ہوئے ہیں

شاخوں میں یہ پتے نہیں اے غیرت گلشن
سب ہاتھ ترے سامنے پھیلائے ہوئے ہیں

پھولونکی طرح ہجر میں عشاق کے دل بھی
افسردہ ہیں پژمردہ ہیں مرجھائے ہوئے ہیں

جی بھر کے ہمیں دیکھنے دو حشر میں دیدار
اک عمر کے ترسے ہوئے ترسائے ہوئے ہیں

روشن ہوئے دل پرتو رخسار نبی سے
یہ ذرے اسی مہر کے چمکائے ہوئے ہیں

آئے ہیں جو وہ بیخودی شوق کو سنکر
اسوقت امیر آپ میں ہم آئے ہوئے ہیں

صدا دے رہی ہے یہ گور غریباں
یہاں سب فلک کے ستائے ہوئے ہیں

دل و دیدہ اجڑی ہوئی گھر تھے دونوں
یہ سرکار ہی کے بسائے ہوئے ہیں

ولہٗ

عمر بھر دولتِ کونین کی کرتا تھا تلاش
مل گئی آج تہہِ دامنِ احمدؐ مجھکو

اے جدِ فخرِ عرب آپ ہیں فخرِ اب و جد
یاد ہے مکتبِ ایماں میں یہ ابجد مجھکو

ہیں وہ محبوبِ خدا اس سے ہیں سب کے محبوب
راست گو ہوں نہیں آتی ہی خوشامد مجھکو

نکہتِ گل کبھی گلشن سے جو لاتی ہے صبا
یاد آجاتی ہے اُس شاہ کی آمد مجھکو

اب کہاں چین خبر دی مرے جی نے مجھکو
کہ مدینے میں بلایا ہے نبیؐ نے مجھکو

عاشقِ چہرۂ حضرت تھا گیا بے کھٹکے
درِ فردوس پہ روکا نہ کسی نے مجھکو

بحرِ آفت میں نبیؐ اور علیؓ ہیں حامی
پار اترنے کو ملے ہیں یہ سفینے مجھکو

عشق کر ختمِ رسل سے کہ خدا راضی ہو
کی یہ تعلیم اویس قرنیؓ نے مجھکو

آتشِ عشق میں جلتا ہوں میں شب بھر دمِ صبح
شمع ساں موت کی آتے ہیں پسینے مجھکو

پر نکل آئیں جو طائر کی طرح دور نہیں
ہمہ تن شوق بنایا ہے خوشی نے مجھکو

شوقِ محبوبِ الٰہی میں نہیں صبر کی تاب
لے چل اے جذبۂ دل جلد مدینے مجھکو

ہے یقیں راہ میں مل جائینگے جبریلِ امیں
سب بتادینگے زیارت کے قرینے مجھکو

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہی غریب الوطنی نے مجھکو

ہو مسرت جو زائر و حاجی ہوں دیئے تین شرف
مکیؐ و ہاشمی و مطلبی نے مجھکو

رات دن ہند میں رہتا ہے یہی دھیان امیر
اب کیا یاد رسولِ عربیؐ نے مجھکو

باج خواں ہوں میں جو آواز نہیں ہے تو نہو
سوز حاصل ہی مجھے ساز نہیں ہے تو نہو

مرتے ہی پھاند کے دیوار میں داخل ہونگا — باب فردوس اگر باز نہیں ہے تو نہو
زندہ دل جتنے ہیں اقرار نبوت ہی آئیں — مردہ دل قائل اعجاز نہیں ہے تو نہو
آپ کا نام تو لیتا ہے موذن ہر صبح — مثل داؤد خوش آواز نہیں ہے تو نہو
درد الفت کا ہوا انجام الٰہی اچھا — خوبصورت اگر آغاز نہیں ہے تو نہو
آشیانہ ہے مدینے کے درختوں پہ مرا — اب اگر طاقت پرواز نہیں ہے تو نہو
دور سے دیکھ لیا کرتے ہیں حضرت کا جمال — پاس اگر جلوہ گہ ناز نہیں ہے تو نہو
رہ نہیں جانے کا میں وادی مدحت میں امیر — توسن فکر سبکتاز نہیں ہے تو نہو

یہ باعث تھا کئے سجدے فرشتوں نے جو آدم کو
کہ دیکھا اُن کی پیشانی میں نور فخر عالم کو
شرف بخشا مدینے کو خدا نے ہفت کشور پر
بلندی جیسے دی ہفت آسماں سے عرش اعظم کو
سفارش سے تمہاری قوت اعجاز دی حق نے
ید موسیٰ عمران کو لب عیسیٰ مریم کو

غبار کوچہ حضرت کا سرمہ ہے عجب سرمہ — کیا ہے جسنے روشن دیدۂ خورشید روشن کو
یہ شوق دید مرقد ہی کہ جب در بند ہوتا ہے — فرشتے جھانکتے پھرتے ہیں دیوار ونکے روزن کو
اجازت طائر سدرہ کو ہو تو نخل یثرب پر — بنائے آشیانہ چھوڑ کر اپنے نشیمن کو
تمہارا بوسۂ در یوں بدوں کو نیک کرتا ہے — بنا دیتا ہی سونا سنگ پارس جیسے آہن کو

براق اُڑتا ہوا قطعِ رہِ معراج کرتا تھا
ملے جب شہسوار ایسا خوشی ہو کیوں نہ توسن کو

طاعتِ حق ہے محمدؐ کی اطاعت مجھکو
حج ہے کعبے کا مدینے کی زیارت مجھکو
شاید آ جائیں وہاں ختمِ رسالت کے قدم
جلد اے مرگ دکھا گوشۂ تربت مجھکو
مظہرِ رحمتِ حق تو میں سراپا عصیاں
مغفرت کیلئے کافی ہے یہ نسبت مجھکو
عشقِ محبوبِ الٰہی میں وہ لذّت ہے امیر
دردِ درماں ہے غم و رنج ہے راحت مجھکو

عشقِ شہؐ والا و دلِ زار کو دیکھو
اس کاہ کو اور کوہِ گرانبار کو دیکھو
کہتی ہے کہ میں پرتوِ چشمانِ نبیؐ ہوں
لو اور سنو نرگسِ بیمار کو دیکھو
فاقوں میں اُس ابرو کا رہے دھیان تو بہتر
ماہِ رمضاں دیکھ کے تلوار کو دیکھو
اے اہلِ جنوں سلسلہ بخشش کا یہی ہے
بل کھائے ہوئے گیسوئے خمدار کو دیکھو
جنّت میں یہ کہتے ہیں فرشتوں سے فرشتے
یثرب میں چلو شاہ کے دربار کو دیکھو

فیضِ قدمِ شہ سے ضیا پائی ہے ایسی
خورشید ہے اک ذرّۂ صحرائے مدینہ
محشر میں ہوا لالۂ گلزارِ شفاعت
جس دل میں پڑا داغِ تمنائے مدینہ
بازارِ محبت میں کہاں مجھ سا خریدار
سر بیچ کے لیتا ہوں میں سودائے مدینہ
ہر صبح بند ہا روضۂ حضرت کا تصوّر
جب آنکھ کھلی کھل گئے درہائے مدینہ

یہ لگی ہے دل میں تمنائے مدینہ
ہر سانس سے آتی ہے صدائے مدینہ

ہے مجھکو ہوائے چمن آرائے مدینہ
جنت میں کروں کیا مجھے ملجائے مدینہ

آنکھیں ہوں یہ محوِ رخِ زیبائے مدینہ
کعبے کو بھی دیکھوں تو نظر آئے مدینہ

اے حسرتِ دیدار دکھا جذب کی تاثیر
پتلی کی طرح آنکھ میں کھچ آئے مدینہ

خضرِ رہِ مقصود ہوائے ولولۂ شوق
دکھلا دے مجھے گنبدِ خضرائے مدینہ

عاشق کے کلیجے سے لگی رہتی ہے ہردم
کیا پیاری تمنا ہے تمنائے مدینہ

سوتے میں بھی آآکے دکھا جاتا ہے جلوہ
غش ہے انہیں باتوں پہ تو شیدائے مدینہ

ہے وصل میں بھی شوق وہی وصل کا باقی
کہتا ہوں مدینے میں بھی میں ہائے مدینہ

یارب یہ جمے رنگِ تمنا مرے دل میں
سینے سے کھلے لالۂ صحرائے مدینہ

یارب وہ عطا کر مری آنکھوں کو بصیرت
گھر بیٹھے رہوں محوِ تماشائے مدینہ

سو جان سے اس بیخودیِ شوق کے صدقے
جب آپ سے باہر ہوئے دیکھ آئے مدینہ

روضے سے امیر آتے ہیں جھونکے جو ہوا کے
کیا جھومتے ہیں مست شجرہائے مدینہ

زہے ہمتِ میزبانِ مدینہ
خدائی ہے سب میہمانِ مدینہ

مدینے میں اک اک سے میں پوچھتا ہوں
کہاں ہے وہ بانکا جوانِ مدینہ

مجھے اور قصوں سے کیا کام واعظ
سنا دے کوئی داستانِ مدینہ

یہ ہے رشک دل کو کہ قاصد جو بھیجوں
بتاؤں نہ ہرگز نشانِ مدینہ

فصاحت ہی صدقے بلاغت ہی قرباں
کچھ ایسی ہے پیاری زبانِ مدینہ

برستا ہے یہ نور دیوار و در سے
کہ ہے لامکاں ہر مکانِ مدینہ

معطر ہیں گلیاں معنبر ہیں راہیں
یہ اے نامہ بر ہے نشانِ مدینہ

امیر اُس پہ کیونکر نہو جان صدقے | کہ جانِ دو عالم ہے جانِ مدینہ

رہتی ہے زباں پر صفتِ شانِ مدینہ | ہوں مرغِ نوا سنج گلستانِ مدینہ

اللہ نے بخشی ہے جسے شاہیِ کونین | سلطانِ مدینہ ہے وہ سلطانِ مدینہ

حاصل ہے مجھے زیست میں بھی سایۂ طوبیٰ | بستر ہے تہِ نخلِ بیابانِ مدینہ

روضۂ شہِ کونین کا کعبے سے نہیں کم | اللہ کا مہمان ہے مہمانِ مدینہ

کہتا ہے امیر اسلئے عالم مجھے سحبان | ہوں حُسنِ طبیعت سے ثناخوانِ مدینہ

دل سے نکلیگی نہ حضرت کی محبت ہرگز | حور باہر نہ کبھی باغِ ارم سے ہوگی

کھینچ لیجائینگے کسطرح فرشتے سوئے نار | خلق لپٹی ہوئی حضرت کے علم سے ہوگی

جاتے تھے جب بُراق پہ حضرت چڑھے ہوئے | قدسی پکارتے تھے کہ آگے بڑھے ہوئے

تعلیمِ جبرئیلِ امیں تھی برائے نام | حضرت وہیں سے آئے تھے لکھے پڑھے ہوئے

اے اشتیاق قافلہ جو مدینے کو ہو رواں | بانگِ جرس سے پاؤں ہوں آگے بڑھے ہوئے

پلّہ جو نیکیوں کا گھٹا ہے تو غم نہیں | امت کے دل ہیں تیری بدولت بڑھے ہوئے

اللہ رے شوق پہونچے مدینے میں دن رہے | منزل سے ہم اگرچہ رواں دن چڑھے ہوئے

حضرت کا علم علمِ لدنی تھا اے امیر | دیتے تھے قدسیوں کو سبق بن پڑھے ہوئے

غُل کرینگے یہ ہمیں دیکھ کے محشر والے | غول کے غول وہ آتے ہیں پیمبر والے

ہو گئے نامۂ اعمال شفاعت سے سفید — اپنے دفتر لئے بیٹھے رہیں دفتر والے

حشر میں دینگے یہ ہم ساقیِ کوثر کو صدا — ایک ساغر ہمیں او شیشہ و ساغر والے

دشمنِ شاہ ابوجہل ہو عاشق ہوں اویس — حیف گھر والوں سے اچھے رہیں باہر والے

ہے جو محبوبِ خدا ہے وہ ہمارا محبوب — حق تو یہ ہے کہ کہاں ہم سے مقدر والے

کوچۂ حضرت کا وہ کوچہ ہے جہاں بیٹھے ہیں — سلطنت چھوڑے ہوئے سیکڑوں کشور والے

خوف کیا حشر میں امت کے سیہ کاروں کو — کہ لپٹینگے انہیں بال وہ گھونگر والے

زور یہ قوتِ بازوے محمد نے کیا — کہ جسے دیکھ کے ششدر رہے خیبر والے

میں نے دیکھا ہے وہ آئینۂ رخسار امیر — کیوں نہ قسمت کی قسم کھائیں سکندر والے

چاہئے مجھ پہ عنایت شہ دیں تھوڑی سی — دیجئے قبر کو یثرب کی زمیں تھوڑی سی

آرزو ہے کہ محبت میں تمہاری کٹ جائے — عمر باقی ہے جو اے خسرو دیں تھوڑی سی

ہے وصیت کہ کفن میں مرے رکھدیں احباب — خاک روضے کی جو ملجائے کہیں تھوڑی سی

زعم میں اپنے ہی یہ بات کہ الفت شہ کی — ہم بہت رکھتے ہیں جبریل امیں تھوڑی سی

سنگِ در آپ کا ملجائے تو سجدے یہ کروں — سودہ ہو کر مری رہجائے جبیں تھوڑی سی

سیر تھی نعمتِ دنیا سے طبیعت ایسی — کہ غذا آپکی تھی نانِ جویں تھوڑی سی

طول کیا دوں کہ مری طبع یہ کہتی ہے امیر — شعر تھوڑے سے کہو ہے یہ زمیں تھوڑی سی

جس روز مدینے کی طرف گھر سے چلینگے — آنکھوں سے رواں ہونگے کبھی سر سے چلینگے

وہ ہم نہیں رہ جائیں جو پیچھے صفتِ گرد — اڑتے ہوئے بڑھتے ہوئے صرصر سے چلینگے

حضرت ہوئے شافع تو گنہگار ہی پہلے　　جنت کی طرف عرصۂ محشر سے چلینگے

جنت ہے درِ خسروِ ذیشاں مرے آگے　　کہہ دو کہ نہ لے دون کی رضواں مرے آگے
شاہی ہے مجھے کوچۂ حضرت کی گدائی　　کیا مال ہے گنجینۂ سلطاں مرے آگے
صدمہ جو ذرا پیاس کا ہو دوڑ کے آئے　　ظلمات سے خود چشمۂ حیواں مرے آگے
لیجاؤ حضورِ شہِ ذیجاہ فرشتو　　لاؤ نہ مرا نامۂ عصیاں مرے آگے

ناجی ہو کیوں نہ حشر میں امت رسول کی　　حضرت نے کی دعا تو خدا نے قبول کی
جائے عجب نہیں جو بہا انگلیوں سے آب　　بحرِ کرم تھی ذات جنابِ رسول کی
وہ ابرِ رحمت کہ طراوت اسی سے ہے　　ایک ایک برگِ نخل کی ایک ایک پھول کی
کافی ہے یہ ثنا کہ حبیبِ خدا تھے وہ　　حاجت نہیں ہے مدحتِ والا میں طول کی

آتے تھے یوں ملائکہ حضرت کے سامنے　　جیسے فقیر صاحبِ دولت کے سامنے
قطرہ ہے بحر آپکی ہمت کے سامنے　　ذرہ ہے مہر مہرِ مروت کے سامنے
ممکن نہیں رکوں میں مدینے کی راہ میں　ق　ہر چند سیکڑوں ہوں قیامت کے سامنے
اندھا کیا ہے شوق میں دریا ہو یا کنواں　　کچھ سوجھتا نہیں ہے محبت کی راہ میں

یادِ شہ میں جو کوئی رات گذر جائیگی　　بہت اچھی مری اوقات گذر جائیگی
دیر ہوتی ہے زیارت میں تو کہتا ہے یہ دل　　عمر اسی طرح سے ہیہات گذر جائیگی

ہوگا اللہ کا فرمان بھی موافق اُسکے | آپ کے ذہن میں جو بات گذر جائیگی

سوے یثرب سے نکلے ہم زائر چلے | شکر کی جا ہے وہاں اپنے پھر چلے
راہِ حضرت کا ہے ایسا اشتیاق | پاؤں تھک جائیں تو اپنا سر چلے
یا رسول اللہ جلدی آ پہنچیے | لشکرِ اندوہ میں ہم گھر چلے
نخلِ دل میں تھے گناہوں کے جو برگ | حبِّ حضرت کی ہوا سے گر چلے

گھر خوشی سے رہِ خالق میں لٹانے والے | چند صابر تھے محمدؐ کے گھرانے والے
لکھ گئے اپنی کتابوں میں نبوت کی نشان | علما موسیٰ و عیسیٰ کے زمانے والے
بھوک میں پیاس میں ایک ایک ہزاروں سے لڑا | کیا بہادر تھے محمدؐ کے گھرانے والے
حیف صد حیف رہی خود لبِ دریا پیاسے | حشر میں چشمۂ کوثر کے لٹانے والے
آج تک نقشِ شریعت نہ مٹا پر نہ مٹا | مٹ گئے آپ ہی جلتے تھے مٹانے والے
تو بھی راہی ہو مدینے کی طرف جلد امیر | غول کے غول چلے جاتے ہیں جانے والے

کبھی جو دیدۂ دل میں فضا مدینے کی | نسیم خلد کو سمجھا ہوا مدینے کی
دماغ بوئے حبیبِ خدا کا ہے مشتاق | ادھر بھی آئے الٰہی ہوا مدینے کی
خدا کی راہ جسے اہلِ دل سمجھتے ہیں | وہ راہ راست ہے گلی کی یا مدینے کی
حسنؑ کو سبز تو رنگت ملی حسینؑ کو سرخ | بٹی نواسوں میں کیسی حنا مدینے کی
جدا ہو دل مرے سینے سے کچھ نہیں پروا | پر آرزو نہ ہو دل سے جدا مدینے کی

مقدم آپ کا ہے نور سارے عالم پر
ہوئی ہے عرش سے پہلے بنا دین کی
کمال ہند میں دل تنگ ہو رہا ہے امیر
دکھا دے وسعت اسے یا خدا مدینے کی

جو مدینے سے رہِ ملکِ عدم لیتا ہے
کب ٹھہرتا ہے کہیں خلد میں دم لیتا ہے
گھر سے چلتا ہے مدینے کی طرف جو زائر
ہر قدم بڑھ کے ثواب اس کے قدم لیتا ہے
طے ہو کس طرح سے میدانِ صفت حضرت کا
ٹھوکریں راہ میں رہوارِ قلم لیتا ہے

بن آئی تیری شفاعت سے روسیاہوں کی
کہ فرد داخلِ دفتر ہوئی گناہوں کی
ثواب جملہ عبادت کا ہے زیارت میں
یہ ایک راہ ہے اے دل ہزار راہوں کی
نہیں ہے گرد نواحِ مدینہ نخلستاں
قطار ہے یہ ترے عاشقوں کی آہوں کی
ذرا بھی چشمِ کرم ہو تو لے اڑیں حوریں
سمجھ کے سرمہ سیاہی مری گناہوں کی
نظارہ کر کے رخِ پاک کا جو پھرتی ہیں
بلائیں لیتی ہیں آنکھیں مری گناہوں کی
فرشتے کرتے ہیں دامانِ زلف حور سے صاف
جو گرد پڑتی ہے اس روضے پر نگاہوں کی
کرے گی آ کے شفاعت تری خریداری
کھلیں گی حشر میں جب گٹھڑیاں گناہوں کی

فرمان ہوا تو بولے مٹھی میں سنگریزے
ایما ہوا تو دوڑے اشجار کیسے کیسے
سچ ہے کہ تھے دلاور اصحاب شاہ کیا کیا
الحق کہ تھے بہادر انصار کیسے کیسے
لیتے تھے مول جنت سر بیچتے تھے اپنا
غازی جری مجاہد دیندار کیسے کیسے

پڑھتے ہیں پانچ وقت نمازیں جو اہلِ دین
بجتی ہے پانچ وقت یہ نوبت رسول کی
مفتاحِ بابِ خلد جسے کہتے ہیں امیر
الفت رسول کی ہے وہ الفت رسول کی

وہ بزمِ خاص جو دربارِ عام ہو جائے
امید ہے کہ ہمارا سلام ہو جائے
ادھر بھی اک نگہِ لطفِ عام ہو جائے
کہ عاشقوں میں ہمارا بھی نام ہو جائے
ترے غلام کی شوکت جو دیکھ لے محمود
ابھی ایاز کی صورت غلام ہو جائے
ہیں قائل آپ کے روضے کا ہوں وہ قائلِ طور
کلیم سے نہ کسی دن کلام ہو جائے
مدینے جاؤں پھر آؤں دوبارہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے
ثنائے زلف و رخِ شاہ کا ہے شوق ایسا
کہ بیٹھوں صبح سے لکھنے تو شام ہو جائے
شکستہ لاکھ ہو دل بادۂ ولا نہ گرے
یہ شیشہ ٹوٹ بھی جائے تو جام ہو جائے
بلاؤ جلد مدینے میں ہے امیر کو خوف
کہیں نہ عمرِ دو روزہ تمام ہو جائے

لحد میں ہم کو سزائے گناہ کیا ہوگی
وہ ناخدا ہے تو کشتی تباہ کیا ہوگی
مقابل آپ کے یوسف کو کون پوچھے گا
کنارِ بحرِ رواں قدرِ چاہ کیا ہوگی
جو رو رہے ہیں غمِ شاہ میں وہ ہیں گناہ سے پاک
برس چکی ہے جو بدلی سیاہ کیا ہوگی
بغیرِ شوق زیارت نصیب ہوتی ہے کب
نہ پیاس ہوگی تو پانی کی چاہ کیا ہوگی

زباں ہی منہ میں خشک ایسی نہیں طاقت تکلم کی
ہمیں بھی کوئی ساغر میسر ہو تو خیر ہو خم کی
پسند آتا ہے کتنا مسکرانا غنچۂ گل کا
شباہت دل کو یاد آتی ہے حضرت کے تبسم کی

زہے رحمت جو گرمی مہر محشر کی ہوئی غالب
سیہ کاروں کے سر پر چھا گئی بدلی ترحم کی
کرو تر دامنوں کو پاک دامن جنبش لب سے
ادھر بھی موج آ جائے کوئی رحمت کی قلزم کی
جو حضرت ناخدا ہیں بحر طوفاں خیز محشر میں
امیر اپنے سفینے کو نہیں دہشت تلاطم کی

در پہ سرکار کے اے کاش میسر ہوتی
میری تربت بھی شہیدی کے برابر ہوتی
تھی جو اے برق سر طور نمائش منظور
آ کے قندیل در روضۂ اطہر ہوتی
راستہ کون مدینے کا بتاتا مجھکو
تپش دل نہ خضر بن کے جو رہبر ہوتی
ہے ترے پیرہن پاک کی حسرت اس کو
ورنہ کیوں نکہت گل جامے سے باہر ہوتی
معرکہ مجھکو نکیرین سے درپیش ہے آج
آج تشریف جو لاتے تو مہم سر ہوتی

یا خدا جسم میں جب تک کہ مری جان رہے
تجھپہ صدقے ترے محبوب پہ قربان رہے
شامیانہ پر جبریل کا ہو تربت پر
کشتۂ عشق محمدؐ کی یہ پہچان رہے
دین و دنیا میں جو پایا وہ وہیں سے پایا
ہم تو جس گھر میں رہے آپکے مہمان رہے
نا عرفناک سے مقصود تھا یہ حضرت کا
بے خبر اپنی حقیقت سے نہ انسان رہے
ناامیدی سے بچانا مرے دل کو یارب
وصل ممکن نہیں تو وصل کا ارمان رہے
کچھ رہی یا نہ رہی پر یہ دعا ہے کہ امیر
نزع کے وقت سلامت میرا ایمان رہے

لے کے جنت سے خبر باد بہاری آئی
اٹھو تعظیم کو حضرت کی سواری آئی
پردۂ رحم میں اے برق تجلی ہو ظہور
دور موسیٰ کا گیا اب مری باری آئی

واہ کیا شانِ کرم ہے جو میں رویا دمِ نزع — مسکراتی ہوئی تصویر تمہاری آئی

یوں مدینے سے نسیمِ سحری آتی ہے — ناز کرتی ہوئی جسطرح پری آتی ہے
غش جو آجائے گا کسطرح میں دیکھونگا جمال — لیجئے جلد خبر بے خبری آتی ہے

بہار آئی ہے گل پھولے ہیں بادل گھر کے آیا ہے — مدینے کا چمن اسوقت آنکھوں میں سمایا ہے
حقیقت پوچھ لی مجھ سے کوئی فردوسِ طیبہ کی — رخِ احمد کا پرتو ہے قدِ احمد کا سایا ہے

عجب بستی مدینہ ہے جہاں رحمت برستی ہے — زیارت کو ہماری روح مدت سے ترستی ہے
تصور میں ہے تصویرِ محمد گرد پھرتے ہیں — ہماری بت پرستی درحقیقت حق پرستی ہے
پری کو حور کو کیا دیکھیں تیرے دیکھنے والے — کن آنکھوں میں یہ شوخی ہے کن آنکھوں میں یہ مستی ہے
مزہ ہے زندگی کا یادِ محبوبِ الٰہی میں — جو غفلت میں بسر ہو موت سے بدتر وہ ہستی ہے
دو عالم کی حقیقت کیا ہے جنسِ عشق کے آگے — عجب نعمت ہے جس قیمت کو ہاتھ آجائے سستی ہے
مدینے کو امیر اب ہند سے چل چونک اے غافل — یہ کیسی نیند سوتا ہے یہ کیسی تیری مستی ہے

یاد جب مجھکو مدینے کی فضا آتی ہے — سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے
کثرتِ جرم سے ایسا ہوں میں مجرم نادم — توبہ کرتے ہوئے بھی مجھکو حیا آتی ہے
شمع پر روضۂ اقدس کی جو گرتے ہیں پتنگ — پرِ جبریل کی کانوں میں صدا آتی ہے
خاک چھانیں تو رہِ عشقِ نبی میں چھانیں — ذرے ذرے سے یہاں بوئے وفا آتی ہے

نغمۂ احمد میں میرے دل کا لگتا ہے دھواں
یا انند تی ہوئی قبلے سے گھٹا آتی ہے

روضۂ پاک میں سب ضبطِ نفس کرتے ہیں
اس گلستاں میں دبے پاؤں صبا آتی ہے

آپ کے عشق میں مرنا بھی عجب دولت ہے
فاد خلق کی در جنت سے صدا آتی ہے

موت کو دیکھ کے کہتا ہے مدینے میں مریض
حور آتی ہے الٰہی کہ قضا آتی ہے

خونِ ناحق شہدا کا جب مجھے یاد آتا ہے
پس کے جب سامنے آنکھوں کی حنا آتی ہے

جب میں جاتا ہوں تو اس روضۂ اقدس سے امیر
پھول دامن میں بھرے بادِ صبا آتی ہے

زہے رحمت کہ ختم انبیا کی آمد آمد ہے
حبیب خاص محبوبِ خدا کی آمد آمد ہے

ملائک مژدہ دیتے ہیں گنہگاران امت کو
کہ خوش ہو شافعِ روزِ جزا کی آمد آمد ہے

زمانہ تیرہ و تاریک تھا اب روشنی ہوگی
مٹینگی ظلمتیں شمعِ ہدا کی آمد آمد ہے

بہار آئیگی گل پھولینگے بلبل چہچہائینگے
چمن میں دھوم ہے بادِ صبا کی آمد آمد ہے

بھٹکتے پھرتے تھے جو قافلے راتوں کو راہوں میں
اب انکے دن پھرینگے رہنما کی آمد آمد ہے

عدم کی راہ لیں کہدو فساد و فتنہ و شر سے
یہاں خیر البشر خیر الوریٰ کی آمد آمد ہے

زمین و آسماں سے متصل ہے نور کی بارش
جہاں روشن ہے نورِ کبریا کی آمد آمد ہے

ازل سے تا ابد ہو جائینگے حل جتنے عقدے ہیں
مبارک ہو شہِ عقدہ کشا کی آمد آمد ہے

یہ مہر و مہ ہیں جسکے فرش پا انداز کے ٹکڑے
اسی شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ کی آمد آمد ہے

عبادت کی جماعت کی مزہ اٹھینگے جی بھر کر
کہ اہل اقتدا میں مقتدیٰ کی آمد آمد ہے

ستم پامال ہوگا دورِ عدل و داد آتا ہے
جفا جاتی ہے دنیا سے وفا کی آمد آمد ہے

کہو شوخی سے اب جا کر چھپی حوروں کی آنکھوں میں
کہ یاں سر تا قدم شرم و حیا کی آمد آمد ہے

ادب آواز دیتا ہے سنبھل بیٹھو سنبھل بیٹھو کہ فخر اولیا و انبیا کی آمد آمد ہے
خدا دی لاکھ جانیں تو امیر اس دم کروں قرباں مری مولیٰ مری حاجت روا کی آمد آمد ہے

گلِ مہتاب سے اس رُخ کا پتا ملتا ہے بو تو کچھ بھی نہیں پر رنگ ذرا ملتا ہے
روضۂ پاک بھی رتبہ میں نہیں عرش سے کم جو پہونچتا ہے اسے قُربِ خدا ملتا ہے
زائروں کیلئے ہی جہدِ زیارت میں ثواب مر بھی جائیں تو ثوابِ شہدا ملتا ہے
چھانتے ہیں جو گدا خاک ترے کوچہ کی صورتِ خضر انہیں آبِ بقا ملتا ہے

یوں تو حُسن ابرو میں ہے ہنر گاہیں ہی گیسو میں ہے حُسن کا اعجاز لیکن نرگسِ جادو میں ہے
ہجرِ حضرت میں یہ کافی ہے میری تسکین کو آپکی تصویر دل میں دل مرے پہلو میں ہے
واہ رے خلقِ نبی بالوں میں بھی ہی میل جول ہے یہی تو وجہ جو پیوستگی ابرو میں ہے
نرگسی آنکھوں کا تیری سے ہے رسیلا پن کہاں یک فقط شوخی ہی شوخی دیدۂ آہو میں ہے

دو عالم کے سرتاج اللہ والے مجھے اب تو قدموں میں اپنے بُلا لے
یہ عالم ہے داغِ جدائی سے دل کا پڑے ہیں مجھے اپنے جینے کے لالے
کھٹک سی کھٹک ہے تپک سی تپک ہے زباں پر ہیں کانٹے جگر میں ہیں چھالے
کہیں مجھکو ٹھنڈا نہ کر دیں جلا کر مری سرد آہیں مرے گرم نالے
نکیرین آنکھیں دکھانے نہ پائیں مجھے آکے دامن میں اپنے چھپا لے
دھڑکتا ہے دل ہجر کی دشمنی سے یہ بیدرد ایسا نہو مار ڈالے

مری جان نکلے تو قدموں پہ تیرے | خدایہ بھی ارمان میرا نکالے
کہیں دفن ہوں عاشقانِ محمد | مگر سب مدینے کو ہیں جانے والے
رسولِ خدا سے جدائی ہے آفت | خدایہ مصیبت کسی پر نہ ڈالے
مری رُوح نکلے بدن سے تو حوریں | کھڑی ہوں درِ خلد پر منہ نکالے
جدائی کے صدمے ضعیفی کا عالم | کہاں تک امیر اپنے دلکو سنبھالے

حلم تھا حضرت کی گھٹی میں پڑا | تھیں حلیمہؓ نام دائی آپ کی
اک جھلک پر دین و دنیا سب نثار | دونوں عالم رونمائی آپ کی
شوق نے برسوں مجھے تڑپا لیا | تب کہیں صورت دکھائی آپ کی
سونگھتے والے جو پڑھتے ہیں درود | بو کہاں پھولوں نے پائی آپ کی

خلق سمجھی ہے جسے سایۂ ابرِ رحمت | ہے وہ اک گوشۂ دامانِ رسُولِ عربی
مہر و مہ ارض و سما حور و ملک جن و بشر | ہیں یہ سب تابعِ فرمانِ رسُولِ عربی
واہ کیا نوک پلک ہے کہ جب آئی دل میں | رگِ جاں بن گئی مژگانِ رسولِ عربی
آب و تاب اور بڑھی جنگ احد میں انکی | درِ غلطاں ہوئے دندانِ رسولِ عربی
نعرہ یا ساقیِ کوثر کا جہاں سنتے ہیں | لوٹنے لگتے ہیں مستانِ رسولِ عربی
حشر میں نامۂ اعمال ہوں جس دم تقسیم | ہو مرے ہاتھ میں دامانِ رسولِ عربی

حلقے میں رسولوں کے وہ ماہِ مدنی ہے | کیا چاند کی تنویر ستاروں میں چھپی ہے

کہہ دے مرے عیسیٰ سے مدینے میں کوئی | اب جاں پہ بیمار محبت کی بنی ہے

محبوب کو لے دیکھے ہوئے لوٹ رہے ہیں | عشاق میں کیا رنگ اویس قرنی ہے

گھر سے کہیں اچھا ہے مدینے کا مسافر | یاں صبح وطن شام غریب الوطنی ہے

معراج میں حوروں نے جو دیکھا تو یہ بولیں | کس نوک پلک کا یہ جوان مدنی ہے

اک عمر سے جلتا ہے مگر جل نہیں چکتا | کس شمع کا پروانہ اویس قرنی ہے

عشاق سے پوچھے نہ گئے حشر میں اعمال | کیا بگڑی ہوئی بات محبت میں بنی ہے

یا واحمد مختار کی ہے کعبۂ دل میں | کعبے میں عیاں جلوہ ماہ مدنی ہے

کہتا ہے مسافر سے یہ ہر نخل مدینہ | آرام ذرا لیلو یہاں چھاؤں گھنی ہے

اللہ کے محبوب سے ہی عشق کا دعویٰ | بندوں کا بھی کیا حوصلہ اللہ غنی ہے

کیوں شمع نے روضے میں پتنگوں کو جلایا | گلگیر سے کہہ دو کہ یہ گردن زدنی ہے

جو داغ ہے دل میں وہ مدینے کا ہے اک پھول | جو سانس ہے میری وہ نسیم مدنی ہے

آنکھوں سے ٹپکتا ہے مری رنگ اویسی | جو لخت جگر ہے وہ عقیق یمنی ہے

ہیں اسکے غلاموں میں ہوں جو سب کا ہے آقا | سردار رسل سید مکی مدنی ہے

اعدا نے جہاں مانگی اماں رک گئی چل کر | شمشیر حسینی میں بھی خلق حسنی ہے

مقتل ہی چمن نعش پہ جو رونق کا ہے مجمع | کیا رنگ میں ڈوبی مری خونیں کفنی ہے

پہونچی ہیں کہاں آہیں اویس قرنی کی | باغوں میں مدینے کے ہوائے یمنی ہے

کچھ مدح پڑھوں روضۂ پر نور پہ چل کر | یہ بات امیرؔ اب تو مرے دل میں ٹھنی ہے

بدن پر خاک پا جب سے ملی ہے | مری رگ رگ مدینے کی گلی ہے

پسِ مُردن مدینے کو گئی روح — یہ ڈالی ٹوٹ کر پھولی پھلی ہے
وہ در پردہ مرادِ دل ہے نہیں شمع — ترے روضہ میں جو شب بھر جلی ہے
چمک دیکھی ہے جب سے درِّ دل کی — تو کیا کیا رشک سے بجلی جلی ہے
دلِ شیدائے احمدؐ ہی تو ہے دل — یہی تو اس چمن میں اک کلی ہے
پسند آنا خدا کو حسنِ احمدؐ — نہالِ عشق کی پہلی کلی ہے
جبینِ ماہ میں ہے یہ چمک کیوں — وہ خاکِ آستاں شاید ملی ہے
عجب معشوق ہے شمشیرِ حضرت — کہ مہندی خونِ اعدا کی ملی ہے
امیرؔ اشعارِ نعت اور ایسے رنگیں — غزل یہ خوب ہی پھولی پھلی ہے

مصور کو ترے ہزار آفریں ہے — کہ تصویر بھی تیری نازآفریں ہے
جو دنیا کے پردے پہ خلدِ بریں ہے — تو مکے مدینے کی وہ سرزمیں ہے
حرم میں ہوں یا دیر میں ہوں جہاں ہوں — اُسی آستانے پہ میری جبیں ہے
یہ کس کے درِ فیض پر جبہ سا ہوں — کہ اب لوحِ محفوظ میری جبیں ہے
زہے شانِ دیوانگانِ محمدؐ — گریباں سے ہے ٹکڑے پھٹی آستیں ہے
اِدھر رقص کرتا ہے اُس در پہ سجدہ — اِدھر اپنی قسمت پہ نازاں جبیں ہے
ستارے ہوئے نور سے جسکے پیدا — خدا جانے وہ ماہ کیسا حسیں ہے
خدا کی ہے قدرت مزارِ مقدس — اِسی گھر میں خورشید سایہ نشیں ہے
امیرؔ اب ہو ذکرِ خدا و محمدؐ — وہ کہفِ متیں ہے یہ حصنِ حصیں ہے

روشِ باغِ جناں کی کیا بھلی معلوم ہوتی ہے
مجھے تو یہ مدینے کی گلی معلوم ہوتی ہے

تصور میں وہ صورت کیا بھلی معلوم ہوتی ہے
کوئی تصویر سانچے کی ڈھلی معلوم ہوتی ہے

ملا کر دیکھتا ہوں جب تمہارے روئے روشن سے
تو صورت چاند کی بھی سانولی معلوم ہوتی ہے

جہاں دل ٹوٹتا ہے دردِ سر باقی نہیں رہتا
زمیں روضے کی ساری صندلی معلوم ہوتی ہے

مدینے کی فضا کے سامنے وسعت دو عالم کی
بہت ہی تنگ و تاریک اک گلی معلوم ہوتی ہے

مدینے کی پہونچنے پر بہارِ آرزو دیکھو
یہ ڈالی آج کیا پھولی پھلی معلوم ہوتی ہے

بہارِ ہر دو عالم اس گلِ رخسار کے آگے
مری آنکھوں میں چھوٹی سی کلی معلوم ہوتی ہے

دلا ایسی ہی غالب جب کسی کی بات سنتا ہوں
مرے کانوں کو آوازِ علی معلوم ہوتی ہے

زہے حبِ علی ہر باغ میں مجھکو ہر اک پتی
خطِ گلزار میں نادِ علی معلوم ہوتی ہے

امیر اس حسن کی کلیاں ہیں شاخِ نخلِ شیریں پا
گلے میں حور کے چمپا کلی معلوم ہوتی ہے

یہ دنیا میں غفلت ہوئی ہوتے ہوتے
کہ دن عمر کا ڈھل گیا سوتے سوتے

فنا نے بقا کا تماشہ دکھایا
اسے پا گئے آپکو کھوتے کھوتے

جگانے میں کی شورِ محشر نے جلدی
لگی تھی ذرا آنکھ ابھی روتے روتے

سیاہی گناہوں کی دل سے نہ چھوٹی
تھکے دیدۂ تر مرے دھوتے دھوتے

ریاضت کا ملتا ہے دنیا میں بھی پھل
یہ کھیتی ابھر آتی ہے بوتے بوتے

سلا دیتی ہے ہائے پھر مجھکو قسمت
امیر آنکھ کھلتی ہے جب سوتے سوتے

کشتی مری تباہ ہے پار اے خدا لگے
ایسی ہوا چلے کہ مدینے کو جا لگے

ہو نقشِ پا پہ داغ مری مشتِ خاک کا
دامن کی آپ کے جو ذرا بھی ہوا لگے

لیجا سلام امیر کا روضے پہ شاہ کے
لیکن زمیں پہ نہ قدم اے صبا لگے

حشر میں ڈر عمل کا مجھے کھٹکا کیا ہے
احمدِ پاک ہیں پلے پہ تو پروا کیا ہے

آنکھ جب عارضِ روشن کی تمنا کرتی ہے
دل یہ کہتا ہے کہ تو نے ابھی دیکھا کیا ہے

بے حجابانہ اٹھا دو رخِ روشن سے نقاب
دل میں جب آئے تو پھر آنکھ سے پردا کیا ہے

میں تو کہتا ہوں کہ پردہ میں ہے احمد کے احد
اور یہ بھی جو نہیں ہے تو پھر اچھا کیا ہے

ہند سے مجھکو مدینے میں بلالیں سرکار
پھر یہ میں عرض کرونگا کہ تمنا کیا ہے

وجد میں ہے کہ زیارت ہوئی روضے کی نصیب
لوٹتا ہے دلِ بیتاب تڑپتا کیا ہے

دیکھنے آتے ہیں روضہ کی جھلک حور و ملک
فرش پر عرش اتر آیا ہے نقشہ کیا ہے

دیر سے امتِ مرحومہ کھڑی روتی ہے
اب شفاعت میں توقف مرے مولا کیا ہے

گرمئ حسن سے رخسار کی پھیلی ہے مہک
عطر ہے خلد کے پھولوں کا پسینا کیا ہے

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل کو یہ سمجھاتا ہے
چل مدینے کو چلیں ہند میں رکھا کیا ہے

نقل اس مہرِ نبوت کی یہ ہاتھ آئی ہے
پوچھو موسیٰ سے حقیقت یدِ بیضا کیا ہے

دلِ حسرت زدہ کو ہے تو یہ حسرت باقی
پوچھ لیں آپ کبھی تیری تمنا کیا ہے

آپ عیسیٰ ہیں میں بیمار جو چاہیں سو کریں
میں سمجھتا نہیں حق میں مرے اچھا کیا ہے

خاص ملبوس اویس قرنی نے پایا
دین اللہ کی ہے اسمیں اجارا کیا ہے

نوکِ مژگانِ محمد کا اگر دھیان نہیں
پھر یہ رہ رہ کے کلیجے میں کھٹکتا کیا ہے

میری شہرت کا سبب نعتِ پیمبر ہے امیر
ورنہ اربابِ سخن میں مرا رتبا کیا ہے

دامن میں ترے گُل بھی ہیں جنت کے ثمر بھی
او مالکِ فردوسِ بریں کچھ تو ادھر بھی

ناسوت سے لاہوت تلک نور ہے تیرا
ہے ایک ہی جلوہ کہ ادھر بھی ہو ادھر بھی

آرام نہ گھر میں ہے نہ توشہ ہے سفر میں
دشوار اقامت بھی ہے مشکل ہے سفر بھی

ٹکراتا ہوں فرقت میں تری سر جو تڑپ کر
دیوار بھی روتی ہے مرے حال پہ در بھی

دنیا سے تعلق کو ترا شوق مٹا دے
یہ کیا ہے توجہ کہ ادھر بھی ہے ادھر بھی

نازک ہے بہت نزع کا وقت اے مرے مولا
ہے بیخبری لیجئے اب میری خبر بھی

دنیا سے جو میں جاؤں تو یارب صفتِ حور
کھولے ہوئے آغوش ہو فردوس کا در بھی

ترا کرم جو شہِ ذی وقار ہو جائے
گدائے خاک نشیں تاجدار ہو جائے

ہوائے عشق سے ذوقِ بہار ہو جائے
جگر بھی دل کی طرح داغدار ہو جائے

یہ آرزو ہے کہ ہر عضو عشقِ احمد میں
تڑپ تڑپ کے دلِ بیقرار ہو جائے

بہت ہی پیاری ہے نوک ان کی تیرِ مژگاں کی
خدا کرے یہ کلیجے کے پار ہو جائے

یہاں تک اس گلِ رخسار کا تصور ہو
ہر ایک سانس نسیمِ بہار ہو جائے

بڑھے جو رحم ترا سوئے امتِ عاصی
شریکِ رحمتِ پروردگار ہو جائے

پلا دو خواب ہی میں آ کے شربتِ دیدار
یونہی علاجِ دلِ بیقرار ہو جائے

جو دیکھ پائے گُلِ داغہائے عشقِ رسول
گلے کا ہار نسیمِ بہار ہو جائے

ادب جو روضۂ پرنور کا اجازت دے
اتر کے چاند چراغِ مزار ہو جائے

اٹھا دو محفلِ میلاد میں جو رخ سے نقاب
نثار شمع بھی پروانہ وار ہو جائے

غبار بھی جو مدینے کی راہ سے اٹھے
تو ابرِ رحمتِ پروردگار ہو جائے

ہوئے عشق نے رنگ لائے پیری میں کھلے یہ گل کہ خزاں میں بہار ہو جائے

یہ عشق حبیب میں ڈوبے ہوئے اشعار درحقیقت چمنستان فردوس کے پھول ہیں جن کے رنگ و بو پر انسان کیا فرشتے بھی وجد کرتے ہونگے۔ بلبل سدرہ سے ان گلہائے نعت کی قدر و منزلت پوچھنا چاہیے جو خود بھی مدح رسول میں امیرؔ کے ہم نوا ہیں

زبان اردو کا باکمال شاعر جو تغزل و قصاید وغیرہ میں علم استادی بلند کرے اور پھر نعت گوئی میں ایسا چمن بے نظیر کھلائے وہ سوا حضرت امیرؔ کے کوئی اور نظر نہیں آتا۔

اب غزلیات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ ہزارہا شعر انتخاب الانتخاب پیش کیے جا چکے ہیں ناظرین خود ہی اس کا اندازہ کر لیں گے کہ امیرؔ کی گویائی کس پایہ کی تھی۔

قصائد

تمام اصنافِ سخن میں قصیدے کا مرتبہ اعلیٰ مانا گیا ہے اس کے لئے بڑی قوت اور استعداد اور تخیل بلند درکار ہے۔ قصیدہ ہر شاعر نہیں کہہ سکتا۔ امیرؔ کی قصیدہ گوئی اور بھی حیرت انگیز ہے۔ جب ان کے تغزل کا رنگ پیش نظر ہوتا ہے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صرف غزل گوئی کے استادِ کامل ہیں اور جس وقت ان کے قصائد پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی صنف میں انھوں نے عمر بھر شاعری کی ہے اور کمال پیدا کیا ہے۔ فارسی میں خاقانیؔ اور عرفیؔ کے قصائد جو بلندی رکھتے ہیں اور اردو میں سوداؔ اور ذوقؔ کا جو پایہ ہے وہ سب اوصاف امیرؔ کے قصائد میں بالشیٔ زائد موجود ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ شوکت اور رفعت کے ساتھ نزاکت و لطافت اس غضب کی ہے کہ ایک ایک شعر پر دل لوٹ جاتا ہے۔ تغزل میں ایسی لذت کیا ہوگی اور یہ بالکل نرالی بات ہے۔ کیونکہ صنائع و بدائع و شوکت و رفعت کے ساتھ کلام کا لطیف و لذیذ ہونا بہت دشوار ہے۔ صرف ایک ہی قصیدے پر نظر ڈالنے سے امیرؔ کے پایہ اُستادی کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ انھوں نے دو چار قصیدوں پر اکتفا نہیں کی بلکہ بہت سے قصائد کہے ہیں۔ ایک سے ایک جید اور معرکہ آرا ہے اور اکثر کی زمینیں بہت سنگلاخ ہیں۔

میں پہلے نعتیہ قصائد کے اشعار پیش کرتا ہوں۔ نعت شریف و منقبت میں کئی قصائد کہے ہیں ہر ایک زبردست ہے اور ہر شعر دو دو پڑھنے کے قابل ہے۔ ”آمد کا خوشامد کا“ کی زمین میں سب سے پہلے شہیدیؔ نے قصیدہ کہا اور وہ بہت

مقبول ہوا۔ اس کے بعد جناب محسن کاکوری مرحوم نے بہت زور لگا کے نعت گوئی
کی۔ بعد ازاں امیر نے طبع آزمائی فرمائی۔ اگرچہ ان دو قصیدوں کے بعد اس زمین
میں گنجائش کہاں تھی مگر اس پر بھی امیر کی طبع غواص نے اپنے حصہ کے گوہر شہوار
نکال ہی لئے اور نہ صرف قصیدے پر اکتفا کی بلکہ ایک دو غزلہ بھی نہایت شاندار کہا جو دیوان
میں موجود ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب میں امیر نے اپنی قوت فکریہ کے جوہر دکھا دیے
ہیں۔ پوری تشبیب بوجہ طوالت اس جگہ نہیں لی گئی۔

قصیدہ نعتیہ

تفکرِ اتقیا زِ جانِ جاناں میں کیا حد کا
عروض اب تک نہ آیا ہاتھ اس بیتِ معقد کا

نفخت فیہ من روحی کے معنی سے ہوا ثابت
خزانہ ہے محیطِ اس چشمۂ روحِ مجرّد کا

گیا شبہہ سمجھ میں آیۂ حبل الورید آیا
رگِ گردن مقامِ خاص ہے محبوبِ سرمد کا

سمٹنا تھا جو بھنور کا تھا وہی تھا موج کا بڑھنا
کھلیں آنکھیں تو عالم ایک دیکھا جزر کا مد کا

سوا حیرت کے کیا ہے فکرتِ کنہِ حقیقت میں
یہ وہ گھر ہے کہ جس میں بند دروازہ ہی مقصد کا

کلیدِ فہم دندانِ طمع کیا تیز کرتی ہے
کبھی ممکن نہیں ہے کھولنا اس قفلِ ابجد کا

لحاظِ ضبطِ معنی چاہیے مشتاقِ معنی کو
جدا کرنا ہے بیجا لفظ میں حرفِ مشدّد کا

نہ کیوں سوئے مقدم ہو رجوعِ دلِ موخر کی
کہ مرکز ہے ہر اک مسند الیہ اسنادِ مسند کا

کہو عشاقِ احمد سے کہ آئیں اس کے سننے کو
قصیدہ اک بنا پڑھتا ہوں میں نعتِ محمد کا

مطلع

الف آدم میں ہے مد، دو احمد میں ہے بے مد کا
سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یاں سایہ نہ تھا قد کا

بلاؤں سے بچے جو نام لے دل سے محمدؐ کا — اثر میم مشدد میں ہے ذوالقرنین کی سد کا
جو آنکھیں ہوں تو نامِ پاک سے پیدا ہے یکتائی — کہ آغوشِ احد میں جلوہ گر ہے میم احمدؐ کا
شروعِ دفترِ امکاں ہیں بسم اللہ کے بدلے — قلم نے نام لکھا لوح پر پہلے محمدؐ کا
فلک پر ہوں نہ کیونکر دیدۂ شمس و قمر روشن — لگا یا کرتے ہیں آنکھوں میں سرمہ خاکِ مرقد کا
کمی اس سے نہیں کی ہیں نے بھی توصیفِ حضرت میں — شہیدی گو کہ موجد ہے اس آئینِ مجدد کا

مطلع

ظہور آخر ہے اول انبیا سے نورِ احمدؐ کا — بجا ہے گر لقب ہو اول و آخر محمدؐ کا
الٰہی آئے وہ جھونکا ہوائے شوقِ بے حد کا — اڑا لیجائے دکھلا دے مجھے روضہ محمدؐ کا
چلے جس سرزمیں پر اسکو کعبے کی بزرگی دی — شرف ہر سنگ کو ہے نقشِ پا سے سنگِ اسود کا
دوئی کیسی کہاں ثانی کہ یہ دونوں ہیں لاثانی — خدا کا دوسرا کوئی نہ سایہ آپ کے قد کا
وہی سایہ وہی قد تھا کہ تھے ظلِ خدا حضرت — جدا کرنا بہت دشوار تھا حرفِ مشدد کا
نبی سب مجمعِ اعجاز کب تھے مثل حضرت کے — ملا تھا ان کو تو ایک ایک پارہ اس مجلد کا
وہی تو چرخِ اخضر ہے جو روزِ خلقتِ آدم — گرا تھا تاجِ نورانی سے آویزہ زمرد کا
سکونت کی جگہ درکار نو محلوں کی تھی اُن کو — یہی باعث ہوا بنیادِ نہ طاقِ زبرجد کا
غش آجائے جو موسیٰ اس تجلی زار کو دیکھیں — چراغِ طور ہے رخشاں کلس روضے کے گنبد کا
ہوئے ہیں جمع امکان و قدم ذاتِ مقدس میں — محمدؐ میں یہی مطلب تو ہے میم مشدد کا
رہائی پائی قیدِ بطنِ ماہی سے جو یونس نے — اشارہ یہ بھی تھا اک نون ابروئے محمدؐ کا
اصولِ خمسۂ اسلام جو مشہور ہیں پانچوں — مخمس آپ کے دیوانِ ارشادِ مؤکد کا
شکم پر سنگِ اسود اور فاقے سے شکم خالی — ہوا ثابت کہ کعبہ بھی مقلد ہے محمدؐ کا

کہا جو کچھ کہ کہنا تھا سنا جو کچھ کہ سننا تھا
وہی قائل وہی سامع سماں آواز گنبد کا

گئے حضرت پھرے حضرت مٹی گرمی نہ بستر کی
قدم تھا ایک ہی گویا در آمد کا بر آمد کا

زیارت کو چلو یارو رٹ ہے یہ غل مچاتے ہیں
غلام آیا محمد کا غلام آیا محمد کا

اس قصیدے میں مع تشبیب (۱۲۸) شعر ہیں۔

قصیدہ نعتیہ دیگر

لائی ہے کیا چمن میں ہر اک شاخسار پھول
دکھلا رہے ہیں باغ جناں کی بہار پھول

کتنے ہیں سرخ و سبز تو کتنے سپید و زرد
ہر رنگ میں ہیں صنعت پروردگار پھول

انجم سے ہیں چمک میں سوا کچھ عجب نہیں
پھینکیں سپہر پر کلہ افتخار پھول

پائے جو اوج اپنے کرے زرگر فلک
سیم و طلائے شمس و قمر کے نثار پھول

آراستہ چمن میں ہے کیا لشکر بہار
کتنے پیادہ آئے ہیں کتنے سوار پھول

بخشی خدا نے جوش صفا سے وہ زرق برق
ایک ایک ملک حسن میں ہے تاجدار پھول

سیمیں تنان چرخ جو چاہیں معاوضہ
بدلیں کبھی نہ پیرہن زرنگار پھول

وہ نشۂ سرور کہ جمشید وقت ہیں
شبنم کو جانتے ہیں مے خوشگوار پھول

توڑے سے زر کے کم نہیں ہر گلبن چمن
اس میں درم ہزار تو اس میں ہزار پھول

نیرنگ حسن و عشق سے خالی نہیں ہے باغ
مجنوں ہے بید لیلیٰ محمل سوار پھول

صیاد کی طرح جو تنا ہے رگوں کا جال
کھیلیں گے عندلیب کا شاید شکار پھول

چھوڑیں شگوفے آپ ہی بلبل کے سامنے
پھر آپ ہی ہنسی سے ہوں بے اختیار پھول

کثرت ہے اس قدر کہ سخی باغباں ہوا
دیتا ہے مفت اہل تماشا کو ہار پھول

ہر گھر میں ہر مکاں میں صحرا میں کوہ میں
لیجاتی ہے اڑا کے نسیم بہار پھول

گلیوں میں کوچے کوچے میں پھولوں کا ہے فرش — اس درجہ بچھ گئے ہیں سر رہگذار پھول
بلبل ہو مردہ کنج قفس میں کہ دام میں — جز باغ ہوں نہ اور کہیں زینہار پھول
مَن کے خریدنے کو جو مالک کوئی کہے — لے آئیں مول مردم خدمتگذار پھول
آیا ہے خوب ہاتھ بہانہ بہار کا — بے خوف پی رہا ہے ہر اک بادہ خوار پھول
گلشن ہر ایک خانۂ قصاب بن گیا — ہر شاخ گاؤمیش میں پھولے ہزار پھول
پہونچے جو باغ میں نظر آئی عجیب سیر — یعنی ہیں ہر طرف ہمہ تن انتظار پھول
جتنے درخت ہیں وہ جمائے ہوئے ہیں صف — باندھے ہوئے کھڑے ہیں روش پر قطار پھول
پوچھی جو میں نے وجہ تو کہنے لگی نسیم — اس کا ہے انتظار ہیں جس پر نثار پھول
وہ لالہ رو کہ جس سے زمانے کی ہے بہار — جس کے عرق سے ایسے ہوئے عطربار پھول
دیکھا نہیں ہے بسکہ کئی دن سے روئے یار — بلبل کی طرح باغ میں ہیں بیقرار پھول
نزدیک ہے کہ درد جدائی سے ہو کے تنگ — پھاڑیں قبا لباس کریں تار تار پھول
آئے نظر جو چہرۂ حضرت تو عید ہو — پھولوں سے صحن باغ میں ہوں ہمکنار پھول

اس قصیدہ میں (۵۵) شعر ہیں۔

قصیدہ در منقبت

کیونکر نہ کروں ملک معانی کو میں تسخیر — خامہ ہے مرا دست یداللہ کی شمشیر
آئے جو تعلی پہ مری ہمت عالی — دشوار نہیں قلعۂ افلاک کی تسخیر
جو معنی روشن ہے وہ ہے غیرت خورشید — سودا نہیں مجکو جو کروں مہر کو تسخیر
سرکش مری نرمی سے کبھی بڑھ نہیں سکتے — لہر آب کے شعلے کے لئے بنتی ہے زنجیر
دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا — موتی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر

طائر اُتر آتے ہیں ٹھہر جاتی ہیں نہریں — داؤد صفت ہے وہ مرے سخن میں تاثیر

عکس آئینے میں میرے اشارے سے ہے گویا — لب میرے جو ہلتے ہیں تو بول اُٹھتی ہے تصویر

جاسکتے ہیں کب اُڑکے کہیں مرغِ مضامیں — وابستۂ فتراک ہیں سب صورتِ نخچیر

شعر اپنے بیاضِ دلِ غلماں پہ جو لکھوں — دے مردمکِ حور سیاہی پئے تحریر

ہو صاحبِ معنی تو معانی مرے سمجھے — ہو صاحبِ توقیر تو جانے مری توقیر

خضرِ رہِ باطن ہے مری غفلتِ ظاہر — یوسف کی زیارت ہے مرے خواب کی تعبیر

جو بات مرے مُنہ سے نکلجاے وہی ہو — گویا ہوں زبانِ قلمِ کاتبِ تقدیر

قُل نکلے زباں سے جو مری ہو تم عیسٰے — واں جی اُٹھے مردہ تو یہاں بول اُٹھے تصویر

ٹھہرے نہ قدم ایک کا میدانِ سخن میں — چلجاے اگر میری زباں صورتِ شمشیر

سُن سُن کے مجھے گرم طبیعت ہوے شاعر — ذروں نے جو پائی ہے تو خورشید سے تنویر

دیتے ہیں مزہ قدر شناسانِ سخن کو — یہ لفظ یہ معنی ہیں جو مثلِ شکر و شیر

کہتا ہوں وہ سنتا ہوں جو استادِ ازل سے — ہوں صورتِ طوطی پسِ آئینۂ تقدیر

تھے قبضۂ خسرو میں معانی کے جو کشور — سب میں نے کئے تیغِ زباں کھینچکے تسخیر

جب مصحفی و میر پئے تہنیت آے — تھوڑی سی زمیں دی انھیں اُس ملک میں جاگیر

بیچارہ ہوس کیا ہے کہیگا جو قصیدہ — ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن میں عصافیر

البتہ مقابل ہیں مرے عرفی و فیضی — پر فرق ہے اتنا میں جواں طبع ہوں وہ پیر

لطفِ سخنِ تازہ کہاں اُن کے سخن میں — کہنہ ہوں دوائیں تو بدل جاتی ہے تاثیر

روکیں جو علائق نہ رکے میری طبیعت — پڑتی ہے بھلا پاے نگہ میں کوئی زنجیر

میدانِ سخن جیت لیے میں نے ہزاروں — بازو ہے قوی جھولتی ہے عرش پہ شمشیر

یہ عز و شرف اُس کی غلامی سے ہے حاصل
جو صاحب قنبر ہے ولا جس کی ہے اکسیر

اس قصیدے میں (۸۲) شعر ہیں

ان کے علاوہ اور بھی قصائد نعت و منقبت ہیں جو دیوان نعتیہ میں درج ہیں

اب مدحیہ قصائد ملاحظہ ہوں

قصیدہ مدحیہ مشتمل بر مناظرہ دانش و وہم

تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشین شاہ قلم
دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکل علم

ہیں جو یہ عرصہ کاغذ پہ حروف و حرکات
یہی لشکر ہے یہی فوج یہی خیل و خدم

ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم
وزرا مرتبہ و دبدبہ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو مضامیں تو معانی ہیں لطیف
ہیں وہی گنج و خزائن وہی دینار و درم

اہل دفتر نے جو کی کھول کے بستوں کی نشست
گردن منشی گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم ہوئیں جاگیریں
شقے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم

وقت دربار ہوا جمع ہوئے مجرائی
عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم

سامنے آنے لگے بہر طلب بہر سلام
مردہا تھا جو ادب کا وہ پکارا پیہم

روبرو خسرو جمجاہ و فلک فر کی نگاہ
تا ابد سلطنت پشت و پناہ عالم

ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل
مسند حکم ہوئی مطلع انوار قدم

روبرو دستخط خاص کو لایا کاغذ
حکمت الدولہ جو تھا منشی یاقوت رقم

عرضیاں گذریں خلائق کی برائے مطلب
لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابواب کرم

بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی
نئے مضموں کا اک پرچہ ہوا پیش اُسدم

کہ ملازم ہیں جو سرکار کے دانش و وہم
در دولت پہ ہے ہنگامہ لڑے ہیں باہم

بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی — کہ بہم گتھ گئے ہیں صورتِ خطِ توام
حکمِ عالی یہ ہوا جلد کرو حاضرِ بزم — دیکھیں کیا کہتے ہیں جو دونوں ہیں ہم ہونگے حکم
حاضرِ بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایما — کیوں لڑے کیا سببِ جنگ ہے آگاہ ہوں ہم
عرضِ دانش نے کیا رو نما بدتک قائم — یہ حکومت یہ ایالت یہ شہامت یہ حشم
بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں — حکمرانانِ زمانہ رؤسائے عالم
ایک حاکم ہے فلک جاہ خرد مند ذکی — صاحبِ علم و ہنر معدنِ اخلاق و کرم
نام ہے کلب علی خانِ بہادر جمجاہ — جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم
علم میں ہیں جود و کرم و ہمت میں — ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم
جس میں جو بات ہو کیونکر اسے کوئی نہ کہے — پیشِ انصاف گزیں حق کا چھپانا ہے ستم
میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا — بلکہ بارادۂ انکار میں سکرتے قدم
کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن — کارخانہ ہے خدا کا نہیں خالی عالم
کیسے کیسے نہیں گزرے ہیں جہاں میں نامی — خواجگانِ عربستان و صنادیدِ عجم
سارے عالم میں ہے سحبان کی فصاحت مشہور — سارے آفاق میں کسریٰ کی عدالت ہے علم
کس کو معلوم فلاطون کی نہیں ہے حکمت — حکمِ نادر ہے عیاں جلوہ نما عشرتِ جم
چار سو ہمتِ حاتم کا ہے آوازہ بلند — شش جہت پر ہے عیاں سب سے جری ہے رستم
تو جو کہتا ہے کہ ان سب سے ہے بڑھ کر کوئی — زعمِ باطل ہے فقط مانتے ہیں کب اسے ہم
میں یہ کہتا ہوں میں دعوے میں ہوں اپنے صادق — ہیں دلائل جو ہو گوشِ شنوا گوشِ اصم
کچھ یہ سنتا نہیں انکار پہ باندھی ہے کمر — گفتگوئے طرفین آپ سنیں ہو کے حکم
ہو گیا حکم کہ ہاں محکمۂ بحث ہو گرم — ایک اک بات کا ہو فیصلہ لا ہو کہ نعم

وہم بولا کہ مجھے عدل میں پہلے ہے کلام — نام کسریٰ کا ہے انصاف و عدالت میں علم

فی البدیہہ اُسے دانش نے دیا تب یہ جواب — چاہِ بے آب بھی پاتا ہے کہیں رتبۂ یم

میرے ممدوح کا وہ عدل جو تھا عدلِ رسول — عدلِ کسریٰ میں ضلالت کے طریقے منضم

کفر و اسلام کے آئین میں ہے ظاہر تفریق — چشمِ بینا میں کبھی ایک نہیں نور و ظلم

چپ ہوا وہم کہا خیر یہ مانا ہم نے — کون حاتم سے زیادہ ہے یمِ جود و کرم

سن کے دانش نے کہا یہ بھی نہ سمجھا تو نے — بادشہ تھا نہ کسی ملک کا حاکم حاتم

وہ بھی دیتا تھا خلائق کو جو دیتا تھا خدا — اس میں جتنے ہوں میسر اُسے دینار و درم

بیش ازیں نیست کہ دعوت میں کیا کرتا تھا ذبح — گوسفند و بز و میش و شتر و اسپ و غنم

میرے ممدوح کے کشور نہ خزائن کی ہے حد — سب وہ حصہ ہے خلائق کا نہیں جود و کرم

اتنے سائل تھے قبیلے میں بنی طے کے کہاں — جمع اس کے درِ دولت پہ ہے سارا عالم

روز پاتے ہیں زر و گنج ہزاروں سائل — ہر تہیدست ہے اب مالکِ دینار و درم

کرتے ہیں صاحبِ زر ہو کے غنی زر بخشی — یہ وہ حاتم ہے کہ ہیں اس کے گدا بھی حاتم

بات معقول تھی کچھ وہم کو آیا نہ جواب — نطق ہو بند تو منہ کھول سکے کیا ابکم

بعد کچھ دیر کے بولا کہ رہا اب یہ کلام — کہ شجاعت میں یہ افضل ہے کہ افضل رستم

کس جوانمرد نے مانا نہیں لوہا اُس کا — قائلِ جرأتِ رستم ہے عرب تا بعجم

سن کے اس بات کو دانش کو ہوا کچھ جو سکوت — میں بھی موجود تھا بولا کہ خموشی ہے ستم

شاہنامہ نہیں کیا تیری نظر سے گزرا — آپ کہتا ہے یہ فردوسی اعجاز رقم

سیستاں میں تھا فقط ایک وہ گمنام سائل — شاہنامہ جو کہا میں نے بنایا رستم

میرے ممدوح کی جرأت تھی بھلا اُس میں کہاں — رعب سے اسکے صفیں ہوتی ہیں برہم درہم

اب جو ہیں اسلحۂ جنگ یہ آگے تھے کہاں
نہ یہ توپیں نہ یہ گولے تھے نہ یہ سیل نہ بم

اس پہ پڑ جائے صفِ فوجِ عدو میں بھاگڑ
یہ میدان جو ٹکا رہے صفتِ شیرِ اجم

اس میں بھی بند ہوا وہم تو لی اور ہی راہ
رزم سے پھر کے دھرا بزم میں ناچار قدم

کی یہ تقریر کہ اچھا نہ سہی ذکرِ نبرد
کس نے آراستہ کی بزمِ طرب صورتِ جم

جامِ جمشید کی پوشیدہ نہیں کیفیت
جس سے تھا پیشِ نظر آئینۂ حالِ عالم

سن کے دانش نے کہا خوب کہاں تجھ کو تمیز
مستِ مدہوش کو کیا ذائقۂ ناز و نعم

فرض کر دم کہ مہیا ہوں سب اسبابِ نشاط
مطرب و ساقی و نقل و مے و اصوات و نغم

آپ ہی ہیں جو نہ ہوا اُس کو ہو حاصل کیا خاک
لذتِ سامعہ و ذائقہ و قوتِ شم

اگلے لوگوں میں کہاں تھی یہ تراش و خراش
یہ نفاست یہ نزاکت یہ لطافت یہ شیم

پیرہن رشکِ چمن بو قلموں رنگ برنگ
زیوروں میں وہ چمک نور کا جن میں عالم

خوبصورت وہ حسیں ماہ جبیں پیشِ نظر
خم بخم زلف رسا آئینے زانو و شکم

کبک و طاؤس کی رفتار تو چیتے کی کمر
آنکھیں وہ شوخ کہ آہوئے غزالانِ حرم

رقص وہ جس سے سراسیمہ ہو ملائکِ فلک
کان زہرہ بھی پکڑ لے وہ مزامیر و نغم

جامِ جم سے اگر آئینہ تھا احوالِ جہاں
رازِ کونین سے آگاہ یہاں دل ہر دم

طرح میں وضع میں ترصیع میں ایجاد میں یا
متاخر ہیں سراسر قدمائے اقدم

نہ چلی وہم کی اس میں بھی تو بولا مجبور
غیر قائل ہوں پر اے فارقِ انوار و ظلم

حکمِ نادر کا فلاطوں کی ہے حکمت باقی
فرق ان کا بھی سنوں کون ہوا کون ہے کم

کہا دانش نے کہ یہ بات بھی دشوار نہیں
لائقِ مدح ہے ممدوح وہ ہیں قابلِ ذم

وجہ ترجیح کی نادر سے تو یہ حکم میں ہے
وہ ہمہ ظلم و ستم تھا یہ ہمہ عدل و کرم

آنکھیں کس کی نہیں نادر نے نکالی بے جرم
سرمۂ روشنی چشم ہے یاں خاکِ قدم

کس کی گردن پہ نہ نادر کی چلی تیغ جفا
گردنیں سیکڑوں احساں سے اسکے ہوئیں خم

اور حکمت میں فلاطوں کا ہے کیا ذکر کروں
بیٹھکر خُم میں ہوا راہی تسلیم قدم

یہ وہ دریا کہ خُم چرخ جہاں ایک حباب
پھیل کر قطرہ نہ دریا سے کبھی ہو اعظم

طرفہ حکمت کہ نبی کا بھی وہ قائل نہ ہوا
دل صفا سے ہے کہاں مطلعِ انوار قدم

کفر و ایماں میں بڑا فرق ہے لازم ہے تمیز
وہ اگر ہیزمِ دوزخ ہے تو یہ سروِ ارم

جب سنے ایسے براہیں یہ ہوا وہم کا حال
خم کیا سر کوئے دوڑ کے دانش کے قدم

چشم الطاف سے دانش نے بھی کی اُس پہ نظر
بہرِ تفہیم کہا سن کہ تو ہے نیک شیم

یہ تو تھے تیرے سوالات کے اچھے ہم جواب
وصفِ ممدوح جو ہیں اور وہ اب کہتے ہیں ہم

علم میں علم میں الطاف میں دانائی میں
ایک ہی فرد ہے یکتا ہے وہ فخرِ عالم

ہر سحر مشغلہ فریاد رسی دادرسی
یہاں سیکڑوں ہر شام سرِ خوانِ کرم

جتنے جس شہر سے آتے ہیں مسافر یہاں
کیمیا کرتی ہے اُن کو نظرِ فیض شیم

اِس قصیدے میں (۱۱۵) اشعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

تا کجا کوتہی اے دستِ ہوس کر جھوٹ
پردۂ شرم رخِ شاہدِ معنی سے اُلٹ

کھینچنا ہو جو سوارانِ سخن سے میداں
پھینکنا چاہیے رہوارِ قلم کو سرپٹ

یہی گو ہے یہی میداں یہی معنی یہی لفظ
اپنی اپنی ہے دمِ معرکہ پر ڈانٹ ڈپٹ

پی گئے گو کہ مئے صافِ سخن کو مے نوش
رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ

خم ہیں میخانے میں ایسے بھی کہ ٹوٹی نہیں مہر
کھول منہ بھر کے صراحی کو لے پیمانہ غٹ غٹ

دو قصیدے جو سنے مصحفی و انشا کے — واقعی سکہ رائج ہیں و لیکن سلپٹ

سعوت چھپر سے جو نچھے قافیہ نامانوس — کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں اُنکی اچپٹ

ذائقہ ہے تو فقط گرمی و بے باکی کا — پر فصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ چل دور ہٹ

ہمت فکر نے باندھی جو کمر بہر جواب — اول اول تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ

آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا — کر لیا تازہ مضامین کا علاقہ کورٹ

لو سنو گوشِ توجہ سے ذرا نظم فصیح — وہ مرے صاف نہیں نام کو جس میں الجھٹ

مطلع

شب و شنبہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ — آئی اک حور لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ

کچھ عجب فتنہ کہ اُسکی جو نظر جائے پلٹ — ساتھ ہی چرخ بھرے لے یہ زمانہ کروٹ

شعلہ رخسار جفا کار قیامت آفت — شوخ عیار غضب قہر چھلاوا نٹ کھٹ

رحم دکھلائے جو منہ دور سے پھر جائے نگاہ — شرم آجائے تو آنکھیں کہیں چل دور ہٹ

گر پڑے جان تو زیور کی جھلک سے بجلی — کھینچ لے دل کو وہ پوشاک میں خوشبو کی لپٹ

وہ نگاہیں غضب آلودہ وہ مژگاں کی صفیں — لشکر صبر جنھیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ

لیکے انجم کا جو لشکر اُتر آئے مریخ — کھینچکر تیغ ادا جیت لے میدان جھٹ پٹ

پختہ کلا اُسکو جو دیکھیں طمع خام کریں — ثمر پیش رس حسن ہیں وہ گدراہٹ

طرفہ چہرے کی لطافت وہ سنہری رنگت — دست افشار طلا سے بھی سوا نرماہٹ

آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر چڑ جائے — توسن ناز کو پوئی سے وہ بھنکے سرپٹ

مستی حسن سے گردن میں کبھی ڈالدے ہاتھ — بے چھوے گاہ چھالو کی طرح جائے سمٹ

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے میں — ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ

مانگ لے مانگ دکھا کر کبھی عشاق کے دل
باندھ لے گاہ گلا کھول کے وہ زلف کی لٹ

رخ و گیسو پہ مرے اتنے مسلماں ہندو
مقبرے ہو گئے تعمیر بھرے سب مرگھٹ

فتنہ حشر کو دیکھے تو کہے زلف سے آنکھ
لا جھپیٹے میں اسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ

طاق کاکل وہ جھلکتی ہیں کہ سر کی کوئی چوٹ
روک لے مڑ کے تو وہ جھانک کے لگائے پا لپٹ

ہاتھ چھو جائے جو گیسو کو تو کھائے یوں پیچ
جس طرح کاٹ کے کالا کوئی جاتا ہے پلٹ

دیکھکر ابروئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں
پہلوان دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غٹ پٹ

جلوہ گر مردم چشم وصف مژگاں سے یہ صاف
حور بیٹھی ہے در خلد پہ کھولے ہوئے پٹ

پھیر کر آنکھ کہے آنکھیں ہیں نرگس کی پھٹی
دہن تنگ شدے منہ کہ ہے غنچہ منہ پھٹ

چوری چوری چمن رخ میں جو آجائے نگاہ
زلف مشکیں کی رسن باندھ لے مشکیں جھٹ پٹ

وصف لکھے لب شیریں کا جو کوئی کاتب
صفحہ سے صفحہ عذوبت کے سبب جائے چمٹ

پڑھ کے گل برگ سے بھی وہ کف رنگیں نازک
غنچے لیں انگلیوں کی کیوں نہ بلائیں چٹ چٹ

آرزو مہر کو مشرق سے نکلکر ہر صبح
کہیں جو تن کی طرح جاؤں ہیں بازو سے لپٹ

استخواں تن میں نہیں ایک یہ ہوتا تھا گماں
گل مخمل کی طرح تن میں غضب نرماہٹ

کس طرح ہو نہ گلا کیف مے حسن سے مست
پی ہے نشے میں صراحی کی صراحی غٹ غٹ

سینہ آئینہ شفاف شکم چشمہ حسن
موج دریا ہے لطافت شکم صاف کی بٹ

شور خلخال سناتے جو رواں ہو دو گام
مڑ کے اٹھ بیٹھیں نہ خاک یہ ہو گھبراہٹ

غرض اس شکل کی معشوقہ کیا جس کا بیاں
نظر آئی تو عجب جی کو ہوئی للچاہٹ

شوق دل نے یہ کہا مست ہے یہ سر سے
عشق پیچے کی طرح چاہیے مستی میں لپٹ

ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سر کی
سر قدم تک تھد انہ ہو بچا کہ گئی دور وہ ہٹ

چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی
تازیانے سے نہیں کم وہ پڑے تیغ جو چٹ

ہنس کے ظاہر میں کہا واہ ری ٹھنڈی گرمی
آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ

چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد
تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھٹ پٹ

ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہے مزاج
خفقان سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ

میں وہ ہوں جسکی ہوس میں ہیں ہزاروں نامی
سیکڑوں مر گئے تھی جن کو مرے نام کی رٹ

زہرہ بالائے فلک کشتۂ شمشیر نگاہ
حلق مریخ کو پھانسی ہے مری زلف کی لٹ

مرغ دل سیکڑوں شہباز نظر کے ہیں شکار
خال وہ زاغ سیہ ہے کہ کلیجے گئے چٹ

ذوق وصلت میں ہوئے گور کنارے کتنے
شوق دیدار میں کتنوں کی گئی آنکھ الٹ

منہ تک دم سے جتنے کہ یہ ہیں شہزادے
صبح تا شام ہے انکا مرے در پر جمگھٹ

پاؤں کتنوں کے گھسے مثل سبو سر پھوڑے
بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ

ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا تام صفت
میں مکیں ہوں تو مکاں جائے زر و سیم سے پٹ

ملہم غیب نے بھیجا تو میں آئی ترے پاس
ہو گراں تجکو جو آنا ابھی جاؤں میں پلٹ

وصف تو کرتا ہے جس کا میں اسی کی ہوں صفت
دیکھ اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو الٹ

رائے انور سے اسی کی مرے آنکھوں میں ہے نور
خلق اس کا مرے گیسو میں ہے خوشبو کی لپٹ

صف مژگاں سے عیاں پنجۂ پرزور کی شکل
عزم اس کا مرے شاہین نگہ کی ہے جھپٹ

اسکی جو راستی طبع وہی قد میرا
دامن فیض کا لٹکا وہ مری زلف کی لٹ

مصحف رخ کو جو دیکھو تو نمایاں وہی شان
کعبہ دل کو جو دیکھو تو اسی کی چوکھٹ

کون وہ کلب علیخاں بہادر جمجاہ
دیتے ہیں جسکو ملک عالم بالا کی رٹ

اس قصیدے میں (۱۳۳) شعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

فصلِ گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں
بڑھ کے رضواں سے ہے اِن روزوں دماغِ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگارنگ گلشن میں کھلے
جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں

خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہے ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں

قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں

جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں
رقص میں ہے ہر روش طاؤس ہو کر شادماں

لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آ کر دیکھ لیں
صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں

جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں

لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیہ کی درست
نرگسِ شہلا نے رکھی سیم و شی کی دوکاں

داربستِ تاک میں خوشے نظر آنے لگے
جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں

سیمِ غنچہ کیوں نہ بیجا ہو زرِ گل بے شمار
رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں

ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرمی
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں

فیضِ شبنم نے دیئے اشجار کو آبی لباس
بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں

نو عروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق
بھیجنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں

یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں دامن کشاں

ہے مبارک فال کوئی ہونے والی ہے خوشی
ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گل فشاں

جان پھولوں میں پڑی زندہ ہوئی خاکِ چمن
ہے دمِ جاں بخشِ عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

قمریوں کا قول ہے ہم ہیں طیورِ باغِ خلد
سرو کہتا ہے کہ میں ہوں طوبیٔ باغِ جناں

صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ
مرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر گراں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں
ہے محیط مشرق و مغرب برنگِ کہکشاں

پائے گر سورج کبھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ
بھول جائے مہر جنبش مثلِ قطبِ آسماں

چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب ہے فرشِ فضائے بوستاں

سیر کو جو آئے اُس کا نافِ آہو ہو مشام
گیسوئے مشکیں سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں

دیدۂ بیدارِ نرگس کا تو کیا مذکور ہے
خواب میں کرتا ہے سبزہ سیرِ گلزارِ جناں

ہے تبسم غنچۂ گل کا کہ تیغِ آبدار
نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چھوتے ہیں سناں

جس طرف دیکھو زرِ گل باغ میں انبار ہے
شکلِ فوارہ اگلتی ہے زمیں گنجِ نہاں

غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکرِ احسانِ بہار
وہ زبان بے دہن ہے یہ دہانِ بے زباں

اس قدر جوشِ طراوت ہے عجب کیا ہے اگر
یاسمیں پیدا کریں گڑ کر زمیں میں استخواں

قطرۂ خوں کے عوض نکلیں گل و یاقوت و لعل
نشترِ فصاد اگر کھولے رگِ سنگِ گراں

ہے عجب فیضِ ہوا پیکاں کے غنچے کھل گئے
تر ہے چوبِ خشکِ ناوک بار ور شاخِ کماں

مصر کا بازار کہئے باغ کے بازار کو
گل ہے یوسف گرد اُس کے بلبلوں کا کارواں

مومن و کافر سے کہدو آئیں سب گلزار میں
عمر کرتے ہیں عبث دیر و حرم میں رائیگاں

جسکی کرتے ہیں پرستش جسکی رکھتے ہیں طلب
ان مکانوں میں ہے پوشیدہ یہاں ہر سو عیاں

آئینہ خانہ ہے گلشن آئینہ ہے برگ برگ
جلوہ گر ہے ہر طرف رنگِ بہارِ بے خزاں

گرچہ صحنِ باغ میں ہر سال آتی ہے بہار
پر ہے ابکی اور ہی رنگِ زمین و آسماں

ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہوا مسند نشیں
سروِ گلزارِ ریاست صاحبِ بخت جواں

منبعِ جود و سخاوت معدنِ لطف و کرم
ماہِ اوجِ چرخِ قدرت مہرِ اوجِ کن فکاں

انتخابِ صنعِ حق عالی نسب والا حسب
روحِ جسمِ انس و جاں فخرِ زمین و آسماں

نام نامی وہ کہ ہے سب کے نگیں دل پہ نقش ۔۔۔ نامور کلب علیخاں بہادر نوجواں

اس قصیدہ میں (۱۱۷) شعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

مشتمل بر مناظرہ شانہ و آئینہ

مژدہ اے اہلِ تماشہ کہ ہے ہنگامِ نظر ۔۔۔ بزمِ عشرت میں ہوئے جمع حسینِ رشکِ قمر

صرفِ آرائش و زینت ہیں حسینانِ جہاں ۔۔۔ بدلے جاتے ہیں لباس اور مرصع زیور

بدھیاں پھولوں کی ہیں زیب فزائے بر و دوش ۔۔۔ دست و پا میں ہے حنا سرمہ ہے منظورِ نظر

کرتیاں ہیں شکمِ صاف پر اونچی اونچی ۔۔۔ بند انگیا کے کسے زلفِ رسا تا بہ کمر

اس قدر مستیِ حسن کہ سر سے سر و دوش ۔۔۔ آرہا ڈھل کے دوپٹا نہیں اتنی بھی خبر

شانہ ہوتا ہے طلب آئنہ آتا ہے حضور ۔۔۔ بنتے ہیں گیسو و رخ کرتے ہیں جوبن پہ نظر

شانہ و آئنہ ہیں بسکہ مصاحب دونوں ۔۔۔ ایک سے ایک نے باندھی ہے رقابت پہ کمر

آئنہ شانہ سے کہتا ہے کہ سر چڑھ نہ بہت ۔۔۔ منہ کی کھائے نہ کہیں چاک نہ تیرا ہو جگر

دیکھ مجھ کو کہ جگہ گو کہ ہے زانوں پہ مری ۔۔۔ حیرتِ حسن سے پھرے کی طرح ہوں ششدر

مرتبہ جو ہے مرا تجکو وہ حاصل ہے کہاں ۔۔۔ صاف طینت ہوں صفائی کا ہے مجھ میں جوہر

کون سی بزم میں ہوتی نہیں حاجت میری ۔۔۔ خانہ بردوش ہوں پردیس امیروں کے ہے گھر

آبداری کا مرے سامنے دعویٰ جو کرے ۔۔۔ روبرو صاحبِ انصاف کے جھوٹا ہو گہر

یمن ہے اہلِ جہاں کو مرے نظارۂ رخ ۔۔۔ دیکھتے ہیں مجھے جب دیکھتے ہیں ماہِ صفر

صافیِ قلب سے پایا ہے یہ رتبہ میں نے ۔۔۔ چاندی سونے کا دیا ہے مجھے اللہ نے گھر

آب و تاب مجھکو نہیں ہے کسی مہماں سے عزیز ۔۔۔ دشمن و دوست کے منہ پر ہے کشادہ مرا در

نہیں لکھتا ہوں لگی حالِ بد و نیک میں کچھ — صاف کہدیتا ہوں آتا ہے جو کچھ پیشِ نظر

مجھ سے بھی عقدۂ نیرنگ جہاں کھلتا ہے — جم کو دیتا تھا اگر جام زمانے کی خبر

بزمِ عالم میں فقط وجہ سے میری اب تک — نام روشن ہے چراغ لحدِ اسکندر

مجلسِ خاصِ نبیؐ میں تھی رسائی میری — ابتدا سے مرے طالع کا ہے روشن اختر

وہ صفائی مجھے حاصل ہے کہ ہر دل ہوں عزیز — جتنے اصحاب تھے رکھتے تھے مجھے پیشِ نظر

ہاتھ سے دامنِ دولت نہ کسی دم چھوٹا — اہلِ دولت ہی کے رانوں پہ ہوئی عمر بسر

اہلِ تنجیم کی آنکھوں میں بھی ہے قدر مری — ہوں کبھی مشتری و زہرہ کبھی شمس و قمر

بولتا ہے مری تائید سے طوطی اُسکا — ورنہ طوطی میں کہاں ہے کوئی سرخاب کا پر

خاکساری ہے ان اوصاف پہ مجھ میں ایسی — غازۂ چہرہ نہیں اور بجز خاکستر

ایک تو ہے کہ نہیں تجھ میں ذرا نام کو نور — زحل آسا ترے طالع کا سیہ ہے اختر

پارہ چوب جگر چاک دنی بے قیمت — چار پیسے کو جسے مول نہ لیں اہلِ ہنر

بال بیکا ہو حسینوں کا تو توڑیں تیرے دانت — دانت دینے لگیں ایذا تو شکستہ بہتر

قاعدہ بزمِ ادب کا تجھے بھولے جو کوئی — پیش جائے نہ تری ایک کریں زیر و زبر

پنجۂ شل سے نکلتا نہیں ہرگز کوئی کام — خشک ہو شاخ تو اُس سے نہیں امیدِ ثمر

بال یوں منہ میں ترے ٹوٹ کے رہجاتا ہے — جس طرح شانۂ ضحاک میں تھا سانپ کا گھر

کرکری تیزیِ دندان سے ہوئی اور تری — جس میں دندانے پڑیں تیغ ہے وہ بے جوہر

کشمکش نے تری کانٹوں میں گھسیٹا ہے تجھے — پھلوؤں میں ہیں ترے خار ادھر اور ادھر

سوز بانیں ہیں ترے منہ میں تو حاصل کیا ہے — گنگ کی طرح سے خاموش ہے تو آٹھ پہر

اس لیاقت پہ یہ دعوے تجھے کیا مال ہے تو — کہ چڑھے لالہ رخانِ سمن اندام کے سر

کچھ بھی غیرت ہو تو پانی میں کہیں ڈوب مرے
ایسی ذلت سے تو ہے خاک میں ملنا بہتر

صاف صاف آئینے نے بڑھ کے کیا جب کلام
عیب سب غیر کے ظاہر کئے اور اپنے ہنر

کھپ گیا شانہ ملامت کا نشانہ ہو کر
موئے تن راست ہوئے تیر کی صورت یکسر

ہمہ تن ہو کے زباں کہنے لگا یوں سر دست
منہ بنا چاہئے عاقل کو تعلّی سے حذر

رتبہ میرا تجھے معلوم نہیں سن مجھ سے
منحصر ہے صفتِ عقدہ کشائی مجھ پر

ہے حسینوں میں رسائی تری گاہے گاہے
کوچۂ زلف میں میری ہے جگہ آٹھ پہر

رات دن خندۂ شادی سے عیاں ہیں مرے دانت
اپنی تقدیر کو روتا ہے تری آنکھ ہے تر

مری ہی شکل سے مقبولِ دلِ عالم ہے
پنجۂ مرجاں کا ہو یا پنجۂ خورشیدِ سحر

کہتے ہیں پنجۂ مژگاں کو جو شانہ شاعر
اس کو آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں اربابِ نظر

ہے جو لبریزِ عسل شانۂ زنبورِ عسل
اس عذوبت کا سبب نام کا میرے ہے اثر

کی ہے تشدید نے پیدا جو شباہت میری
لفظِ اللہ میں شامل ہے وہ کر خوب نظر

شانۂ عاج کبھی شانۂ شمشاد کبھی
شانے میں دیکھتے ہیں فال تو پاتے ہیں ظفر

صاحبِ ریش نہ جب تک کہ کرے شانہ کشی
ہو نہ حاصل شرفِ پیروی پیغمبر

اس میں بھی لفظ ہے شانہ کا نہ ہے عز و شرف
جل شانہ ہے جو توصیفِ خدائے اکبر

تو سنانے تو سنانے مجھے کیا پروا ہے
عیب میں جو ہے اسے کب نظر آتا ہے ہنر

سوچ تو دل میں ذرا عیب ہیں تجھ میں کتنے
سادہ و شوخ و دریدہ دہن و بدگوہر

سوجھتا خاک نہیں کور دلی سے تجھکو
سخت جاں تیرہ دروں اصل ہے تیری پتھر

رو برو اور ترا حال ہے غیبت میں کچھ اور
صافِ عالم کی دو رنگی کا ہے تجھ میں بھی اثر

چشمۂ آب تو ظاہر میں ہے باطن میں سراب
دھوکے پیاسوں کو دیا کرتا ہے تو شام و سحر

خود نمائی کے سوا تجھ میں نہیں کچھ بھی صفت — سادہ لوحی کے سوا تجھ میں نہیں کوئی ہنر

صاف آئین ہے من لا یمس کہ شب کو رہے تو — شب تیرہ میں تجھے کچھ نہیں آتا ہے نظر

ناچے پر نہ جسے شکل جو ہو ذہن نشین — نہ مٹے پر نہ مٹے بال پڑے دل میں اگر

قصہ کوتاہ زیادہ ہوئی دونوں میں جو بحث — تھے جوانِ دونوں کے حامی انہیں پہونچی یہ خبر

آئینے کا تو رخِ صاف طرفدار رہا — باندھ لی زلف نے شانے کی حمایت پہ کمر

لشکرِ روز تو زیرِ علمِ خسرو رخ — فوج شب با دشنۂ گیسوے پریں کی سپر

اک طرف ماہ ہوا ایک طرف پرتوِ مہر — اک طرف شام ہوئی ایک طرف نورِ سحر

سپہ سنبل و شبو طرفِ زلفِ سیاہ — لشکرِ لالہ و گل جانبِ روے انور

پیرِ گردوں نے کہا طرفہ قیامت آئی — اب کوئی آن میں ہوتا ہے جہاں زیر و زبر

بیچ میں پڑ کے کہا خوب نہیں ہے یہ فساد — صلح اس جنگ سے ہر ایک طرح ہے بہتر

حق میں دونوں کے یہ اولی ہے کہ پاس اس کے چلو — صاحب حکم جو ہے مہرِ عدالت گستر

کون وہ **کلب علیخاں** بہادر نامی — نبعِ جود و سخا زیب دہ علم و ہنر

اس قصیدہ میں (۱۱۴) شعر ہیں۔

قصیدۂ دیگر

ہوا جو شاہد ماہ آسماں پہ جلوہ فروش — عزیزِ ہالہ پھرا گرد کھول کر آغوش

سوادِ شب میں نظر آئے اس طرح انجم — آ ملے ہوں گرد میں جس طرح طفلِ بازیگوش

وہ چاندنی کہ ہوا قلزمِ ضیا مواج — یسانِ رعشۂ اندام رندِ ساغر نوش

نہ شورِ مردمِ بازار نہ بانگِ درا — کہیں کہیں جو رہا بھی تو پاسباں کا خروش

جوان و پیر و صغیر اپنے اپنے بستر پر — برنگِ صورتِ دیبا پڑے ہوئے خاموش

گلوئے ناطقہ میں مرسلہ سکوت کا طوق
غدارِ سامعہ نہاں زیرِ پردۂ گوش

نماز پڑھ کے عشا کی جو میں نے خواب کیا
تو پچھلی رات کو دیکھا کہ کوئی شخصِ سروش

جگا رہا ہے مجھے کہہ رہا ہے مجھ سے یہ بات
شتاب اٹھ کے روانہ ہو کھول دیدۂ ہوش

ہوئی ہے آج مرتب وہ بزمِ اہلِ کمال
کہ جس میں جمع ہیں سب تیغِ طبع دریا جوش

حکیم و شاعر و نثار و عالم و فاضل
صفیں درست ہیں بیٹھے ہوئے ہیں دوش بدوش

طلب ہے تیری بھی جلدی سے دیکھ سن چل کر
زہے رسائی تقدیر چشم و طالعِ گوش

یہ مژدہ سن کے میں خوش خوش اٹھا روانہ ہوا
قبا عمامہ عبا کر کے زینتِ سر و دوش

ہوا جو داخلِ محفل عجب سماں دیکھا
درِ مکاں تھا کہ کھولے ہوئے تھی حور آغوش

عجیب فرش عجب روشنی عجیب شب ماہ
ہر ایک جھاڑ سے فوارہ ہائے نور کا جوش

بزرگ ایک بعز و وقار صدر نشیں
ملک خصال فرشتہ جمال و خرقہ پوش

خدا شناس خدا رس ادھر ادھر کچھ لوگ
زباں پہ ذکرِ خدا دل میں معرفت کا جوش

جو لوگ سامنے بیٹھے تھے سب وہ صاحبِ علم
وحیدِ عصر فریدِ زمانہ صاحبِ ہوش

یہ رنگ دیکھ کے ایسا ہوا میں عیب سے زرد
کہ سمجھے سب کوئی وارد ہے زعفرانی پوش

سلام کر کے ہوا میں شریکِ صف لیکن
ہوئے حواس سراسیمہ صورتِ مدہوش

کمال مجھکو پریشاں و مضطرب پا کر
کہا یہ مجھ سے مرے ہمنشیں نے گوش بگوش

کہ ہے یہ صدر نشیں پیر و مرشدِ عالم
زمیں ہے تاجِ سرِ آسماں تہ پاپوش

فراخ حوصلہ عبد الرشید مولانا
تمام اہلِ معارف ہیں جس کے حلقہ بگوش

یہ راست و چپ جو ہیں بیٹھے ہوئے ملک خصلت
مرید خاص ہیں اس کے شرابِ عرفاں نوش

یہ روبرو جو ہے صف انہیں سب ہیں اہلِ کمال
بغور دیکھ ذرا ان میں کھول دیدۂ ہوش

یہ ہیں ظہوری و طغرا و عرفی و فیضی — یہ ہیں نظامی و جامی جو بیٹھے ہیں مدہوش
یہ شیخ سعدی ہے جس نے کہ چشم روشن کو — کیا ہے نظم گلستاں کی بیت بیں حق نیوش
نصیر و بیدل و آزاد و صائب و شوکت — غنی کلیم سوا ان کے اور بھی ذی ہوش
طلب ہوئے ہیں جو یہ لوگ اسکی وجہ یہ ہے — زر سخن کسی کامل کا ہوگا زیور گوش
مرید ایک ہے اس مقتدی کا خاص الخاص — وہ مست بادۂ عرفاں یہ پیر بادہ فروش
ہمیشہ تاجر شہر مصطفے آباد — مطیع شرع نبی متقی عبادت کوش
جناب **کلب علیخاں** بہادر ذیجاہ — جو آنکھ اسکی ہے حق بیں تو گوش عذر نیوش
سحاب فیض غبار قدم ہے ہاتھ تو کیا — جو کوہ فوج ظفر موج ہے وہ رعد خروش
صدائے ضرب شمشیر وہ کہ سن کے جسے — کھڑے ہوں کان ہر مرد کی صورت خرگوش
بلند مرتبہ ایسا کہ جس کے مطبخ میں — طبق زمیں کا ہے خوان آسماں سرپوش
چمن میں ہر گل تر اس کے فیض سے خنداں — فلک پہ ماہ ہے ہالے سے اس کا حلقہ بگوش
وہ نثر خدمت مرشد میں اس نے بھیجی ہے — کہ نیش اہل حسد کو ہے منصفوں کو ہے نوش
نہیں ہے دیر پڑھی جائیگی کوئی دم میں — سنیں گے کان جواہر دم سماعت گوش
سنا یہ حال تو تصویر وار بیٹھا میں — لگا کے تکیہ دیوار مطمئن خاموش
جوان فصیح بیاں ایک ناگہاں آیا — لیے ہوئے کئی اجزا ورق ورق گلپوش
ملا جو اذن تو کھولی زبان سحر بیان — پڑھی وہ نثر مقفے کہ سب کے اڑ گئے ہوش
نکل کے طفل مقال زبان قاری سے — در آئے دیدۂ حساد میں مع پاپوش
زباں کا قصد کہ جائے فلک پہ شور ثنا — پکارتا تھا یہ سینے میں دل بجوش بجوش
کہا کسی نے خوشی میں کسی سے لاتا ہاتھ — جو سر سے سر تو لڑے جھومتے ہیں دوش سے دوش

اچھالے دست زباں نے یہ اسکے وصف میں پھول
زمیں تو کیا فلک آسماں ہوا گلپوش

اچھل پڑے گل مضموں تو یہ فردوسی
اٹھا یہ لطف کہ جامی بھی گر پڑے مدہوش

کہیں وہ نثر نظامی کی نظم سے بہتر
بیاں کے نور نے کی شمع انوری خاموش

بھرے ہوئے تھے ہوا میں جو لوگ نخوت سے
یہ رشک سے ہوئے لاغر کہ گھٹ گیا تن و توش

وہ فربہی نہ رہی سن کے وہ سخن سرسبز
دو اورم کی ہے جیسے گیاہ مزر نجوش

خفا پسند ظہوری خطا مقر طغرا
وحید فرد غلط شوکت انکسار فروش

کہاں جلال چلا لا و شاں برخوردار
زباں گنگ تھی جو پائے گوش عذر نیوش

فتیل کس میں کہ کھینچے وہ اپنی تیغ زباں
کہ ہے سخن کے قلمرو میں ایک دست فروش

جو نثر ختم ہوئی خوش ہوا وہ صدر نشیں
ثنا و مدح میں گویا کیے لب خاموش

ہوا خوشی میں جو دریائے مرحمت مواج
منگائی کشتی خلعت جو تھی جواہر پوش

جو پارچے کوئی پوچھے تو ایک سو اڑتیس
کہیں قبول کے اعداد جن کو صاحب ہوش

زیادہ اس پہ کیا تحفہ دعا سر دست
زیادہ حامل خط کو کہ جائے مثل سروش

جو نثر کا ہے مصنف اسے کرے تفویض
کہ دولت ابدی پائے وہ نیاز فروش

اٹھا جو نامہ رساں بزم ہو گئی برخاست
یہ واقعہ ہے **امیر** اپنے شوق کا سرجوش

خدائے پاک رسول کریم کا صدقہ
صحابہ جس کے ہیں روح القدس سے دوش بدوش

جہاں ہمیشہ رہے اسکی ذات سے روشن
چراغ دولت علیا کبھی نہ ہو خاموش

رہوں گا اب سعادت میں میں بھی فارغ بال
مدام سر بکف دست و غاشیہ بر دوش

—— ( ) ——

قصیدہ دیگر

عالمِ خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل
شجرِ طور کو جس باغ کی کہیے کونپل

خواب میں سبزہ خوابیدہ جو واں کا دیکھے
خواب ہو طالعِ خوابیدہ کا خوابِ مخمل

سامنے اُس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر
گلشنِ خلد بھی مجھ کو نظر آیا جنگل

اک شگوفہ تھا اُسی باغ کا باغِ عشرت
ایک غنچہ اُسی گلزار کا گلزارِ امل

ساغرِ عشرت کونین وہیں کے دو پھول
میوۂ مقصدِ دارین وہیں کے دو پھل

واہ رے نقشِ گل و لالہ اگر عکس پڑے
خونِ لعل آئے رگِ کوہِ بدخشاں سے نکل

سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دوں کس سے مثال
کہوں آئینہ تو آئینہ میں اتنا نہیں دل

دستِ مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں
پھر بھی دیوار پہ جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل

لالہ آتا تھا نظر یوں پسِ دیوارِ چمن
جس طرح شیش محل میں کوئی روشن مشعل

خطِ گلزار سے ہر گل پہ یہ مصرع تحریر
نقشِ ثانی ہے یہ فردوس ہے نقشِ اول

طوبیٰ و سدرہ کی شاخیں پئے تسلیم ہیں خم
عرش تک فرش سے ہے بادِ بہاری کا عمل

ہے یہ تاثیرِ نمو ہاتھ جو مجرم کے کٹیں
صورتِ دستِ چنار آئیں نئے سر سے نکل

قطعہ

قوتِ نامیہ کا تھا یہ تعلّی سے کلام
طارمِ پست ہے اس باغ میں چرخِ اول

سبزہ کاہکشاں غنچۂ پروین کیا
خوشۂ تاک رگِ تاک سے آیا ہے نکل

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیضِ نمو
نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

خواب میں دیکھے اگر ترکِ فلک یاں کی بہار
شب ہی کو گلشنِ انجم کو کرے مستاصل

کچھ بھی دکھلائے اگر بادِ بہاری نیرنگ
گل ہوں گلدان میں انگارے درونِ منقل

ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہندوے سوسن کیلیے
بھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل

نوجوانانِ چمن دھوپ سے کیا کمھلائے ۔۔۔ چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پہ بادل
ہر روش سبزے پہ واں عکسِ گل و لالہ نہ تھا ۔۔۔ سبز تھی پھولوں کی بالائے بساطِ مخمل
مور تھے رقص میں مصروف برنگ رہامے ۔۔۔ جھومتے پھرتے تھے مستوں کی طرح سے بادل
سینے تانے ہوئے پھرتے تھے چمن میں طاؤس ۔۔۔ اس تمنا میں کہ لگ جائے گلے سے بادل
لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں بادِ نسیم ۔۔۔ غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل
چمنِ دل میں جو عارف کے چلی واں کی نسیم ۔۔۔ گلِ صدبرگ بنے غنچۂ اسرارِ ازل
سوئے بت خانہ جو پہنچی وہ ہوائے جاں بخش ۔۔۔ کلمہ توحید کا پڑھنے لگے عزّا و ہبل
کیا عجب دانۂ اسپند ہو چلکر پھر سبز ۔۔۔ کہ وہاں اُٹھتے ہی بنتا ہے ہوا پر بادل

اس قصیدے میں (۱۶۱) شعر ہیں۔

یہاں تک قصائد مطبوعہ کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اب غیر مطبوعہ قصائد لکھے جاتے ہیں

قصیدۂ غیر مطبوعہ

جب سے عالم میں ہے دورِ آسمانِ چنبری ۔۔۔ کب ہوا مجھ سا کوئی سلطانِ ملکِ شاعری
خوبصورت کس قدر میرے معانی کی ہے فوج ۔۔۔ ہے پھریرا ہر علم کا صورتِ بالِ پری
راہوارِ فکر سے میرے اگر ہو ہمعناں ۔۔۔ ابلقِ ایام کھائے ہر جگہ اسکندری
نعمتِ دنیا سے کیا مطلب مزہ ہے شعر کا ۔۔۔ جس طرح اہلِ ریاضت دشمنِ تن پروری
بے مشقت کب ہوئی حاصل مجھے مشقِ سخن ۔۔۔ سینہ کاوی سے ملی شکلِ نگیں نام آوری
ناتواں ہرچند ہوں لیکن وہی ہے زورِ طبع ۔۔۔ سست کب کرتی ہے چلنے کو کمر کی لاغری
ہفت کشور میں مری روشن بیانی ہے عیاں ۔۔۔ صورتِ خورشید ہے خلقت میں عالم پروری
کھینچتا ہوں خامۂ فکرت سے مضموں کی شبیہ ۔۔۔ ہے مری مضموں طرازی یا فنِ صورتگری

سحر ہے ہر ایک مصرع پھول ہے ہر ایک لفظ — قابلِ گلگشت ہے گلزارِ معنی پروری

فکرِ عالی کو ہمیشہ استعانت سے ہے ننگ — شعر کو کیونکر غزالوں سے ہو چشم یاوری

گر در رہتے ہیں سخنداں اُن میں ہے یوں میری جا — ہو نگیں جیسے میانِ حلقۂ انگشتری

لطفِ مضموں سے ہے خوب آگاہ میری چشمِ فہم — پیرتی ہے آب گوہر میں نگاہِ جوہری

میرے خامے نے کئے مضمونِ روشن مجتمع — شمع پر پروانوں کی کرتی ہے اگر گرد آوری

کون مضموں کا مرے آفاق میں خواہاں نہیں — اس مہِ کنعاں کا ہے سارا زمانہ مشتری

صحتِ الفاظ و معنی بندشِ اشعار چست — سُقم سے مضموں تو عیبوں سے قوافی ہیں بری

بزمِ معنی میں ہو روشن میری طبعِ گرم سے — وہ چراغِ نظم پروانہ ہے جس کا انوری

میرے آگے شرم سے ایسا ہلالی گھٹ گیا — ہے ہلال آسا گریباں گیر اُس کی لاغری

بے صدا ہے میرے آگے یوں فغانی رعب سے — تار کو آواز کے اس کا گلا ہے عنبری

کیا کرے پھر دعوی روشن کلامی شمس قیس — سامنے آتے ہوئے جب جسم میں ہو تھرتھری

میرے جامِ فکر کا جامی ہے ادنی جرعہ خوار — مجھ سے سیکھا ہے نظامی شیوۂ نظمِ دری

مکتبی کو طفلِ مکتب جانتی ہے میری فکر — کاتبی بھی میرے دفتر کا ہے ادنی دفتری

تب بر آئے عرفی و فیضی و حافظ کی مراد — بندۂ درگاہ بنکر جب چڑھائیں حاضری

کرکے وا دروازۂ تعلیم بیٹھوں میں اگر — ہے یقیں شاہی بھی آئے بہرِ دریوزہ گری

خسرو و سعدی کبھی ہوتے نہ مشہورِ جہاں — میں نہ کرتا فکرِ مضموں میں جو اُن کی یاوری

فکرِ صائب نے مری صائب کو شرمندہ کیا — روبرو میرے ہوئی فطرت کی گم دانشوری

پا گیا تھا بزمِ معنی میں مری جھوٹی شراب — ہے جو سرخوش خوشِ صہبائے معنی پروری

کیا نعت واتوں میں کوئی ہو سکے میرا حریف — ایک جوہر ہے مری تیغِ زباں کا جوہری

فارسی تو فارسی اردو میں بھی وہ بات ہے ہفت کشور میں واں ہے سکہ یا لا تری
سوز جرأت درد حسرت میر انشا مصحفی میرے باعث سے جہاں میں انکی ہے نام آوری
ہاتھ آیا ہے جو سرمایہ سخن کا ہے۔ بجا کی ہے سودا نے میرے بازار میں سوداگری
شعر کہتا ہوں نئے حاصل صلہ ہو یا نہ ہو طور کی چوٹی نہیں محتاجِ موباف زری
امتحاں کرے سخن کا جس کو ہو مدِ نظر خوف کیا اس کو کسوٹی کا جو چاندی ہے کھری
ہاں یہ کیا کہتا ہے روک اپنی زباں کو اے **امیر** تجکو استادوں سے بیجا ہے خیالِ ہمسری
فخر کرنے کی ترے البتہ اتنی بات ہے جس کا ہے مداح تو ہے ختم اُس پر سروری
نامور نواب **مشتاق علیخاں** جمِ وقار آسمانِ جاہ و تمکیں مہرِ عالم پروری

اس قصیدے میں (۸۵) شعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

شام ہوتے ہی جو نیند آگئی اندک اندک نظر آئی مجھے اک برقِ تجلی کی چمک
چونپ سی دیکھو ہوئی نیند اُڑی آنکھ کھلی ہوشیاری نے کہا خواب میں غفلت سے سرک
نیم باز آنکھوں سے اللہ کی قدرت دیکھی شمعِ رخ پر پرِ پروانہ ہوئے ہوئے پلک
سرمہ آنکھوں میں لبِ لعل پہ مسی کی دھڑی سرخیِ پان کو روا خونِ تمنائے ملک
ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ شوخی ہمہ ناز دل پکارا کہ یہ شکلیں نہیں دیکھیں اب تک
واہ کیا حسنِ خدا داد فریبندۂ دل جس کے نیرنگ سے نکلے یہ بہتر مسلک
ناز کا قول یہ دکھلا کے سرِ زلفِ دراز جانیوالو عدم آباد کی سیدھی ہے سڑک
چھین لینے کو اگر دل کے چلے کس کے کمر حسنِ خونریز کو دے اور وہ غمزہ پہ چپک
کھینچکر قاف میں نقشہ جو مصور لیجائے دل میں پریوں کے یقیں ہے کہ چھپے نوکِ پلک

سامنے عارض کے نور کے ذرہ خورشید
چاند بھی ماند وہ پیشانی انور میں چمک

نہ اٹھے شعلۂ رخ سے تو کرامت سمجھو
خال بارود کا دانہ ہے مسی ہے زنگ

لب نازک ہے جو گلبرگ تو غنچہ ہے دہن
آنکھ وہ شوخ کہ نرگس سے ہے اسکو چشمک

دانت موتی سے کہیں لعل سے بہتر لب لعل
پنجہ مرجاں کا تو یاقوت کی تختی وہ کفک

پھیر دے پنجۂ مژگاں سے کلیجے پہ چھری
نگہ تیر سے دیکھے تو لگائے ناوک

سپر آتا ہے نئی چوٹ وہ غمزہ کیا پھکیت
نہ تو مونڈھا نہ تمانچہ ہے نہ چاکی نہ کڑک

دل میں آتا ہے سراپا کے لکھوں کچھ مضموں
چھوٹ یاقوت کی ہو جسمیں تو ہیرے کی چمک

مطلع

مانگ بالوں میں دکھاتی تھی ہر بار جھلک
چشمۂ شیر یہ ظلمات میں جاتا ہے چھلک

عنبریں صفحے پہ لکھا ہے سفیدی سے الف
کاٹ کر نافے کو کافور بھرا ہے بے شک

کھینچ کر حسن نے رکھی ہے سپر پر شمشیر
عشق کہتا ہے دم قتل کہ النصرۃ لک

دیکھ کر مانگ کو اس کی حکما کہتے ہیں
نہ رہا معجزۂ شق قمر میں کچھ شک

زلف پر پیچ ستم حلقۂ گیسو آفت
طوق پہ حور کی گردن کا وہ زنجیر تلک

سایۂ رحمت حق دوش پہ دونوں گیسو
خوب واقف ہیں جو کاندھے پہ کچل ہیں لٹک

کیا صفائی ہے کہ اس جبہۂ نورانی پر
آنکھ پڑ جائے تو آنسو کی طرح آئے ڈھلک

خوشنما آنکھوں کے کینے ہیں یہ دونوں ابرو
سایہ افگن ہیں سر حور پہ دو بال ملک

گرمی الفت ابرو ہے عجب شعلۂ قہر
آنچ تلوار کی اچھی ہے بری اسکی لپک

چشم قتال اگر مائل خونریزی ہو
دے کے شمشیر کرے سرمہ کی تحریک کمک

صاف ہوتا ہے عیاں مردمک و مژگاں سے
جلوہ گر خط طلائی میں یہ بالائے محک

تیغ ابرو کی نہ بکتی ہے نہ مژگاں کی چھری
ورنہ سر بیچ کے کس شوق سے لینے گاہک

پتلیاں پڑھ کے دعا نور کی دم کرتی ہیں
دیتی ہیں دفع بلا کے لئے پلکیں دستک

رخ کی تعریف کا اک نقطہ بھی لکھے جو قلم
وصلی ہو کاغذ ابری کی چمک کر ابرک

نظر آتا ہے یہی چہرۂ خنداں شاید
خواب غفلت میں جو ہنس پڑتے ہیں اکثر کودک

اثر عشق اسی چہرۂ پر نور کا ہے
کیوں نہ درد دل عاشق میں ہو بجلی کی چمک

طور پر جا کے جو یہ برق درخشاں چمکے
ہے یقیں برق تجلی کی جھپک جائے پلک

کیا اسی چہرے کو دیکھا تھا کبھی ایک نظر
چشم آئینہ جو حیرت سے کھلی ہے اب تک

خال کا ذکر بھی ہے وصف سراپا میں ضرور
ذائقہ دے وہ سخن تا کہ ہو جس میں نمک

ہے عجب مصرع دلچسپ وہ قد موزوں
کہ کسی سے نہ لگا مصرع ثانی اب تک

سرکشی یہ کہ قیامت جو لگا دوٹ چاہے
دے صدا پانوں کی خلخال کہ چل دور سرک

دیکھ لیں اسکو اگر دور سے غش آنے لگے
تھام لیں قائمۂ عرش کو گھبرا کے ملک

قد الف ہے تو رخ صاف کا تل ہے نقطہ
حسن ان دو کے سبب ایک سے دس ہے بیشک

عقل گم ہے کہ کہوں میں دہن تنگ کو کیا
آج تک ہے کہ نہیں اس میں زمانے کو ہے شک

اس قدر اس دہن تنگ سے خجلت کھینچی
منہ چھپائے ہوئے ہے خلق سے عنقا اب تک

بات اتنی ہے کہ ہے ہونے نہ ہونے میں کلام
زیر لب اس لئے ہے خال سیہ نقطۂ شک

لب ہیں یا بادۂ گلگوں کی یہ دو موجیں ہیں
دو مہ نو ہیں کہ عالم کو دکھاتے ہیں چمک

دوں جو گل برگ سے تشبیہ گل ایسے پھولیں
سونگھ کے وہیں پیراہن گل جائے مسک

کیا مزہ ہے جو کبھی لب پہ تبسم آیا
بھر دیا کوٹ کے عشاق کے زخموں میں نمک

صفت سیب زنخداں میں ہے کیا حاجت فکر
پختہ میوے کی طرح پڑتے ہیں مضموں ٹپک

دیکھتے چاہ تو یوسف چہ کنعاں سمجھیں — چاہِ بابل کا گماں ہوا سے دیکھیں جو ملک
ہیں اسی چاہ میں ڈوبے ہوئے خورشید و قمر — اسی گرداب کی الفت سے ہیں چکر میں فلک
کان وہ کان کہ جس کی نہیں مدحت ممکن — اور تشبیہ غلط کان جواہر بیشک
ہے بجا سامنے اُن کے جو صبا گلشن میں — دیتی ہے کان پکڑنے کی گلوں کو پر چاک
قلمِ نور سے لکھی گئی گردن کی بیاض — سورۂ نور رقم جس میں ہے بے شبہہ و شک
آ رہا یا تھا کسی روز اسے بازو نے — کہ کمانِ مہِ نو سے نہیں جاتی ہے لچک
آستیں غیظ سے الٹی تو زمانہ الٹا — آگیا تیغِ دو دستی کے تلے متبارک
واہ کیا پنجۂ پر نور ہے سبحان اللہ — بارہا پھیر دیا پنجۂ خورشید فلک
دیکھ کر پنجۂ رنگیں یہ ہے رنگیں کا کلام — کبھی ایسا نہیں دیکھا ہے مخمس اب تک
ناخنوں سے ہے سرِ دست کرامت ظاہر — دیکھ لو مہ رو ہلال ایک جگہ زیرِ فلک
بال سے ٹھیک ہے باریک کمر کی تشبیہ — گرہِ موئے کمر ناف ہے بے شبہہ و شک
دیدۂ ناف میں پر بال کمر ہے لیکن — نہ کہیں درد نہ آشوب نہ سرخی نہ کھٹک
ناف تو نون میاں ہے الفِ ناف کمر — ترجمہ اسکا ہے لا نفی ہے ظاہر بیشک
ساقِ پا دستۂ بلور کہ شمعِ کافور — ران پر نرمی مخمل ہے تو سونے کی ڈلک
دیکھے اندھا جو خزانے ہیں نہاں زیرِ پا — آنکھ پر نقشِ قدم کی جو لگائے عینک
الغرض دیکھ کے یہ شکل ہوا میں بیتاب — پڑ گئی تیغ کلیجے پہ جگر پر ناوک
بول اٹھا کون ہے تو نام بتا دے مجکو — تیرے مقدم سے گیا اخترِ تقدیر چمک
ہنس کے شوخی سے کہا نام ہے میرا زہرہ — پہلے رہتی تھی یہیں اب ہوں میں بالائے فلک
کون آفاق میں ہے جو نہیں واقف مجھ سے — شہرۂ حسن سما سے ہے مرا تا بہ سمک

انزآئی جو زمیں پہ نہ سبب پوچھ اس کا — جائے حیرت ہے کہ غافل ہے تو اس سے اب تک

جشن ہیں خلعتِ نواب کے مہمان چمن میں — کون نوایف لہ جسپہ فلک نعش ہیں ملک

آج وہ دن ہے کہ خرم ہے ہر اک جن و بشر — آج وہ دن ہے کہ شاداں ہے ہر اک حور و ملک

اس قصیدے میں ایک سو انچاس شعر ہیں۔

قصیدہ مشتمل بر معرکہ پیکارِ خزاں و بہار

سلطانِ شرق نے جو بصد عز و افتخار — برجِ حمل کو آکے کیا تختِ زرنگار

پہنچے خطِ شعاع کہ سب مستعد رہیں — جتنے قواے نامیہ کے ہیں رسالہ دار

دربار گرم تھا کہ خبر دی یہ ناگہاں — ہرکارے نے صبا کے کہ اے شاہِ نامدار

غارتگرِ خزاں نے کیا ملک کو خراب — اڑتی ہے خاک باغ میں ویران ہے دیار

جمعیت کثیر سے آیا ہے لوٹنے — دیکھو جدھر علم ہیں بگولوں کے آشکار

اتنی سپاہ ہے کہ نہیں انتہا کہیں — ذرات کے پیادے ہیں خاشاک کے سوار

افسر ہیں فوجِ میمنہ و میسرہ کے دو — اس کا سموم نام ہے اس کا لقب غبار

اوراقِ خشک نوبت و نقارہ کی جگہ — گویا ہوا کے گھوڑے پہ ہیں نوبتی سوار

کالی ہیں وردیاں کہیں خاکی ہیں وردیاں — اک زاغ کا گروہ ہے اک بوم کی قطار

آندھی کا اس کے ساتھ ہے اک خیمہ سیاہ — صرصر رسن ستونِ شجرِ خشک خاردار

یہ سن کے غیظ خسروِ خاور کو آگیا — فرمان ہوا کہ جمع ہو سب لشکرِ بہار

گولے ڈلیں تگرگ کے کہہ دو سحاب سے — توپیں ہوں برق و رعد کی سر وقتِ کارزار

پھولوں کی پلٹنوں کو ملیں سرخ وردیاں — پہنیں لباس سبز جوانانِ شاخسار

موجوں کے ہر طرف سے زرہ پوش آئیں جلد — فوارہ ہاے آب کے حاضر ہوں نیزہ دار

قطروں کے یکہ تاز دکھائیں دلاوری — فوراً رواں ہوں تیغ گزارانِ جوئبار
رکھیں سروں پہ خود بہادر حباب کے — ترکش سجیں بدن پہ دلیرانِ آبشار
نامی جو ہوں سپاہ ہیں وہ انتخاب ہوں — لشکر کے افسروں کا الگ چاہیے شمار
شمشیر خاں بید سرافراز خاں سرو — آزاد بیگ سوسن و میر آتش چنار
خیرات بیگ خیری و گل بیگ جعفری — آقا بداغ لالہ خشن خاں کوکنار
شاداب بیگ سبزہ صفا بیگ نسترن — خواجہ ملیح زنبق و خواجہ بزرگ نار
تقسیم ہوں سلاح جوانانِ باغ کو — قتلِ عدو میں کام جو دیں وقتِ کارزار
صد برگ کی زرہ ہو تو سنبل کی ہو کمند — گل کی سپر ہو شاخ کی شمشیر آبدار
بید بنیں سپاہ ہیں غنچوں کی پیچکیں — سورج مکھی کے خود ہوں تقسیم بیشمار
چار آئنے سہ برگی کے تن پر کریں درست — کیلاوں کے نیزے پائیں جوانانِ نیزہ دار
اس فوج کے سوا بھی کچھ آئے کمک کو فوج — سو ایک سمت سے تو کسی سمت سے ہزار
شاہین و باز و جرہ کلنگ و خروس لجا — کبک و تدرو فاختہ و طوطی و ہزار
طاوس کی سپاہ بھی کنجشک کی بھی فوج — سرخاب کا بھی غول کبوتر بھی بیشمار
قازوں کا اک گروہ عقابوں کی ایک صف — ٹکڑی ہو کویلوں کی پپیہوں کی بھی قطار
فرمان شاہِ شرق سے پھر بعد جائزہ — لشکر ہوا روانہ پئے قصد کارزار
گھوڑے ہوا کے جھونکوں کے ملکوں کے فیل مست — لاکھوں گل پیادہ ہزاروں گل سوار
فوج خزاں ادھر بھی جمائے ہوئے پرے — آمادہ ہر گروہ ہر اک صف ہر اک قطار
آنکھوں پہ ایسے پڑ گئے پردے غرور کے — ذروں کی فوج لیکے بڑھا افسرِ غبار
سوجھا نہ کچھ کسی کو زمانہ ہوا سیاہ — آندھی کی طرح چھا گئی وہ فوج نابکار

ایسے ہوئے بلند علم گرد باد کے — چکر میں آ گئی خبر چرخ کج مدار

فوج بہار نے بھی کیا قصدِ کشت و خون — جنبش ہوئی بڑھے علم سرو جویبار

کیں افسر سحاب نے تیر دستیاں عیاں — کف تھا دہن میں ہاتھ میں تھی تیغ کوہسار

لکوں کے احدیوں نے اٹھائے جو بادپا — ترکانہ ترکتاز سے محشر تھا آشکار

توپیں ہزار ہا جو چلیں برق و رعد کی — تھا زلزلہ زمین کو ہوے کوہ رعشہ دار

سر اڑ گئے جدھر گئے گولے تگرگ کے — قطروں کی گولیاں ہوئیں آن کے جگر کے پار

پشت و پناہ اُس کی جو تھا افسر سموم — تھے گرم جست و خیز خس و خاک کے سوار

پھولوں کے سرخ پوشوں نے ایسی لگائی آگ — جل جل کے خاک ہو گئے وہ تیرہ روزگار

اشہب سوار سوسن و گلگوں سوار گل — ایسے بڑھے کہ گھٹ گئے خاشاک کے سوار

غربال چمن کے ہو گئے ان ناکسوں کے تن — غنچوں کے گل چلوں نے یہ دی گولیوں کی مار

جو جھاڑیاں تھیں جھاڑ کے مانند جل اٹھیں — اوراق خشک جل کے بنے پھلجھڑی انار

کیا وقت پر مدد کمکی فوج نے بھی کی — کیا کیا شکار گاہِ چمن میں ہوئے شکار

اُس فوج میں سپہ جو بگولوں کے تھے علم — طاؤس سب نگل گئے اُن کو سمجھ کے مار

طاقت تھی بوم کی کہ ہما سے ہو ہم نبرد — کیا زاغ عندلیب سے ہوتا بھلا دوچار

دم بھر میں صاف ہو گیا میدان اِدھر اُدھر — ذرے چھپے خاک کے ابر ہوا غبار

کیا افسر سموم کی چلتی کہ ابر نے — ٹھنڈا کیا لگا کے اُسے تیغ آبدار

گرجا جو ابر فتح کا نقارہ بج گیا — تھا شادیانہ زمزمہ قمری و ہزار

سامانِ بزم ہو گیا میدان رزم میں — کیا کیا مے طرب کے چلے جام خوشگوار

فرشِ زمردیں جو بچھا سبزہ زار میں — مسند لگائی برقِ شقائق نے بوٹے دار

افسر جو تھے سپاہ کے بیٹھے وہ صف بہ صف
گلگوں کسی کا رخت کسی کا تھا زرنگار

ٹھاٹھر تھے روشنی کے کہ مہندی کی ٹٹیاں
ہر سرو شکل سرو چراغاں تھا نوربار

مطرب تھی عندلیب تو قوال فاختہ
طاؤس رقص کرتے تھے محفل میں بار بار

غنچے سبو تھے لالہ و گل ساغرِ شراب
مینائے سبز فام ہر اک سروِ جویبار

جنبش میں باد تند سے آتے نہ تھے درخت
مے پی کے جھومتے تھے وہ مستانِ بادہ خوار

مہتابی ماہتاب تو ہر پھول پھلجھڑی
بن کر انار چھوٹ گئے ہر طرف انار

شبنم نے پائے گوہرِ غلطاں گلوں نے زر
جاری ہوا یہ فیض سے شہ ابرِ نوبہار

رومال سرخ دوش شقایق پہ چار باغ
شبنم سے پھول بچھتے ہوئے موتیوں کے ہار

پھولا کھیں درمنہ کہیں اشرفی کے پھول
لاکھوں درم تو اشرفیاں بٹ گئیں ہزار

دیکھا یہ رنگ میں نے پہنچکر جو باغ میں
اور پوچھی وجہ جشن تو یہ بول اٹھی ہزار

یہ جشن اس کی فتح کا ہے جو سپاہ ہے
زیرِ لوائے حضرت نواب نامدار

حامد علی خاں بہادر فلک شکوہ
زیبا ہے جس کی شان میں مطلع یہ آبدار

اس قصیدے میں ایکسو انہتر ۱۶۹ شعر ہیں۔

قصیدہ درتہنیت عیدِ اضحیٰ

بارک اللہ عجب نور کی ساعت آئی
عید کے پردے میں اللہ کی رحمت آئی

رنگ اسلام کا تقدیر کی صورت چمکا
ہر مسلماں سے گلے ملنے سعادت آئی

چار سو عید مبارک کا ہوا شور بلند
سال بھر کی تھی جو حسرت پئے رخصت آئی

دل ہوا شاد ہر ایک چہرے پہ سرخی دوڑی
رنگ اڑاتی ہوئی احباب میں فرحت آئی

لے اڑے پھول لہا خون جو قربانی کا
لالے کی طرح چنبیلی میں بھی حمرت آئی

سرخ پوشاک ہوئی زیبِ تن مثلِ چمن
گوشے دامن کے سنبھالے ہوئے زینت آئی

پیشوائی کے لئے رونقِ ایماں دوڑی
تہنیت کے لیے اسلام کی شوکت آئی

کھل گئے دولت و اقبال کے سب دروازے
عید کیا آئی کلیدِ درِ جنت آئی

ہوئی سو جان سے قربان بہارِ گلشن
پھولوں میں عشق کی بو خون کی رنگت آئی

لب پہ تکبیر کی آواز نے باندھا احرام
دلمیں کہتی ہوئی لبیک مسرت آئی

راحت و فرحت و بہجت نے کیا دل کا طواف
حج ادا کرنے جماعت کی جماعت آئی

نامِ حج کا جو سنا ہو گئی خلقت بے چین
عید کی طرح خوشی کو بھی یہ حسرت آئی

حج کی مشتاق ہوئی طاق ہوئی طاقتِ صبر
لیکے قسمت اُسے سوئے درِ دولت آئی

راستے بند تھے کعبے کو وہ جاتی کیونکر
اِس طرف ساتھ لئے شوکت و حشمت آئی

درِ دولت پہ جو پہنچی ہوئی پھر پھر کے نثار
ملگیا حج کا ثواب اوج پہ قسمت آئی

ہے وہ کس کا درِ دولت جو ہے دارا دربار
جس کے طالع پہ سکندر کو بھی حسرت آئی

جس کی توصیف سے گویا ہے ملایک کی زباں
جس کی تائید کو اللہ کی رحمت آئی

جس کے صدقے میں سلاطین کو ملا تاجِ وقار
جس کے حصے میں سلیماں کی دولت آئی

جس کی قسمت میں فریدوں کا لکھا تھا اجلال
جس کی فطرت میں فلاطوں کی فطانت آئی

سن کے یہ بین نے وہ برجستہ لکھا اک مطلع
صدقے ہونے کے لئے جس پہ بلاغت آئی

مطلع

اے خوشا ذات کہ سرمایۂ رحمت آئی
دولتِ عز و شرف جس کی بدولت آئی

پاؤں رکھا جو رہِ سلطنت آرائی میں
دین رہبر ہوا دنیا پے خدمت آئی

سایہ بنکر لگے قدموں سے کمال و اقبال
چتر بنکر سرِ پر نور پہ رحمت آئی

دلنوازی ہوئی ہمدم کہ بھلا رہتی تھی ۔۔۔ خیر خواہی کے لئے خیر کی نیت آئی
دستگیری کا جو تھا شوق ازل سے اسکو ۔۔۔ اسکی مٹھی میں زمانے کی حکومت آئی
ایسی سرکار کہاں اسکو میسر آئی ۔۔۔ عقل ہشیار تھی جو بہر وزارت آئی

اس قصیدے میں (۶۷) شعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

واہ کیا اختر اقبال ریاست چمکا ۔۔۔ کہ انا الشمس کی ہر ذرے سے آتی ہے صدا
مشفقت دربام در و دیوار ہیں سب پر تنویر ۔۔۔ مطلع مہر درخشاں کی ہے ہر گھر میں ضیا
ہے زمیں رشک فلک ذرے ہیں رشک انجم ۔۔۔ تابش نور سے ہے برج قمر ہر کمرا
نور ہی نور برستا ہے جہاں جہاں ہم ہیں ہر سو ۔۔۔ ہر زمیں شادی اسی سے چمک میں سیکھا
غیرت عارض خورشید ہے رخسار زحل ۔۔۔ ابر ہے برق درخشاں تو زمیں رشک سما
اٹھ نہیں سکتی ہے اوپر کو چکا چوند سے آنکھ ۔۔۔ لگ اب یہ ہوتا ہے گماں بجلی کا
شمعیں ہوتی ہیں جو روشن تو نظر آتا ہے ۔۔۔ غرہ تابش شمس و قمر کا جلوا
روشنی کا ہے یہ عالم یہ مٹی ہے ظلمت ۔۔۔ آئینہ دیکھ کے آتی نہیں زنگی کو حیا
اس تجلی کا سبب یہ ہے کہ ہے صدر نشین ۔۔۔ ذات پاک اسکی جو ہے مظہر انوار خدا
جس کے چہرے پہ پڑے آنکھ تو دل ہو روشن ۔۔۔ جس کی تصویر تصور سے بصیرت ہو سوا
جس کے اخلاق کی خود خلق ثنا کرتا ہے ۔۔۔ جس کے الطاف کے ہیں لطف و کرم مدح سرا
یہیں آکر تو روا ہوتی ہے حاجت سبکی ۔۔۔ یہیں آکر تو ہوا کرتی ہے تقدیر رسا
آستانہ ہے اسی کا تو در دولت خلق ۔۔۔ در دولت ہے اسی کا تو در فیض و عطا
بڑھ کے سائل کو لیا کرتا ہے وہ دست کرم ۔۔۔ ہمہ تن خلق ہے ہر عضو بدن بھی اس کا

اسم پاک اس کا میں اس بحر میں لاؤں کیونکر / نارسا ہے مری قسمت کی طرح فکر رسا

لفظ حامد جو علیخان بہادر سے ملے / نام نامی مرے ممدوح کا ہو جلوہ نما

جسپہ سو دل سے ہو مداح دم مدح نثار / جسپہ سو جان سے قربان ہو ہر مدح سرا

حکم جاری ہو اگر لطف و عطا کا اُس کے / نہ رہے چین جبیں کا کہیں دنیا میں پتا

ہے یقیں گوشۂ دامن کو یہ دریا جھٹکے / چین موج آب سے ہو گرد کے مانند ہوا

روح افزا ہے ہوا مہر کی اُس کے ایسی — قطعہ — زندہ ہے جس کے سبب نام دم عیسیٰ کا

سر قلم ہو جو کسی تن سے تو مثل سر شمع / دو سرا سر ہو نئے سر سے اُسی دم پیدا

گر خرابات میں جا پہنچے کہیں قہر کی آگ — قطعہ — ہوش ہو جائیں خراباتیوں کے ایسے ہوا

طاق سے اُترے تو پھر سنگ میں شیشہ ہو نہاں / شیشے سے نکلے تو پھر تاک میں پہنچے صہبا

ہے عجب دور کہ دارا کا ہے دوراپہ نثار / ہے عجب عہد سکندر کا ہے عہداپہ فدا

مٹ گیا ہے یہ سعادت سے نحوست کا اثر / بیضۂ زاغ سے کیا دور جو پیدا ہو ہما

دئے اللہ نے ارکان ریاست ایسے / ایک سے ایک جو ہے عقل و فراست میں سوا

مہر کی آنکھ سے صحرا پہ جو ڈالیں وہ نگاہ / ہے یقیں پھول کے میداں ہو ذرا ذرا

قہر کی آنکھ سے گر جانب ساحل دیکھیں / ایک قطرے میں سما جائے سمٹ کر دریا

انتظام ایسا ہے اس دور میں بیٹھا ہے یہ رعب / اپنے عاشق کا چراتا نہیں دل دزد حنا

ہاتھ کھینچا ہے حسینوں نے بھی آرائش سے / تاکہ زیور سے نزاکت کو نہ پہنچے ایذا

موجیں ڈرتی ہیں کہیں پانوں میں آجائے نہ پیچ / بوجہ گرداب کی چھاگل کا نہیں اٹھ سکتا

جس طرح شاہ ہے اوصاف میں اپنے بے مثل / بے نظیر ایسے ہی اُس شہ کو ملے ہیں وزرا

معدن جود و کرم مخزن الطاف و ہمم / عدل میں فرد تو ہیں نظم و نسق میں یکتا

سب کو ہے مدِ نظر خلق کو راحت پہنچے — رہیں تکلیف میں خود ہو نہ کسی کو ایذا

ہے اسی سے تو ہر اک کام میں ہر دم رونق — کارخانوں میں اسی سے تو ترقی ہے سوا

کتنی باتیں ہوئیں اس دور میں ایسی جن سے — بڑھ گیا مرتبہ جود و کرم بذل و عطا

جس طرف جائیے خیر و برکت کا ہے ظہور — جس طرف دیکھیے ہے نورِ خدا کا جلوہ

ایک بات ان میں سے مذکور یہاں ہوتی ہے — جس کو سنتے ہی کہے خلقِ خدا صلِّ علیٰ

کہ بنائی گئی ہے ایسی جگہ اک مسجد — جس جگہ فرض تھا واجب تھا کہ ہو ایسی بنا

پاس اسی کے وہ بنایا ہے مسافر خانہ — جس میں ہر وارد و صادر کو ملے گھر کا مزا

کیمپ فوجی ہے قریب اس کے بڑا ہے یہ لطف — کہ حفاظت کے لئے رعب ہے اس کا پہرا

تھی جو منظور غریب الوطنوں کی راحت — اک نیا گانوں بھی پاس اس کے بسایا ایسا

کہ ضرورت کی ہر اک چیز وہاں ملتی ہے — جس مسافر کو جو حاجت ہو وہ ہوتی ہے روا

واہ کیا مسجدِ پر نور ہے اللہ اللہ — نور ہی نور برستا ہے جہاں سر تا پا

طرفہ مسجد کہ جہاں صدق و صفا آئینے — طرفہ مسجد کہ جہاں فرش ہے تسلیم و رضا

طرفہ مسجد کہ اگر خواب میں آجائے نظر — رقص کرنے لگے مومن کی جبیں پر سجدا

نور کے قمقمے ہیں نور کی قندیلیں ہیں — یا عیاں طور پہ ہے برقِ تجلی کی ضیا

سرنگوں سجدۂ طاعت میں مصلی ہیں جہاں — شورِ تکبیر کہیں ہے کہیں تسبیحِ خدا

اک حکایت نئی لکھتا ہوں میں اس مسجد کی — سامعیں اس کو سنیں گوشِ توجہ سے ذرا

ابھی تعمیر ہی ہوتی تھی کہ برسات آئی — اور ہوئی بارشِ بارانِ کرم حد سے سوا

تھی جو دریا کے کنارے تو خبر سنتے ہی — جوش میں شوقِ قدمبوس کے پانی دوڑا

چاہتا تھا اسے آغوش میں ایسا کھینچے — کہ جو دیکھیں تو کریں مردمِ آبی سجدا

موجیں دیں بوسے تو گرداب کریں اُس کا طواف | پتلی آنکھوں کی بنائے اُسے قطرہ قطرہ
اِس طرف مردمِ آبی تھے اُدھر تھے خاکی | ساری برسات ادھر اور اُدھر زور رہا
اُس طرف آئیں پہاڑوں سے کمک کو موجیں | اِس طرف موج حمایت نے خدا کی روکا
بسکہ ہے آدمِ خاکی کو شرف آبی پر | غرق آ آگیا دریا کو مگر کچھ نہ ہوا
پھر گیا خاک بسر تر عرقِ خجلت سے | پانی پانی ہوا پانی کہ نہ کچھ زور چلا
خاکساروں کو ہوئی فتح نصیب آخرِ کار | شکر ہے خاکیوں کے ہاتھ یہ میدان رہا
اللہ اللہ عجب شان ہے اِس مسجد کی | جس کو لڑ بھڑ کے بڑے معرکے سے جیت لیا
مومنو تم کو مبارک یہ ظفرمندی ہو | فتح اسلام مبارک ہو بجا دو ڈنکا
جلوہ فرما ہے یہاں آج تمہارا سردار | رونق افزا ہے یہاں آج تمہارا مولا
جس کی پیشانی پر نور ہے اک آیۂ نور | ورقِ مصحفِ رب ہے رخِ انور جس کا
اس تجلی کدۂ خاص میں اُس کا ہے نزول | برق سے بڑھ کے تجلی میں ہے جس کا سایا
اور ہی نور کا عالم ہے اب اِس مسجد کا | برج آتے ہیں نظر صورتِ طورِ سینا
دیکھ کر اِس کے مناروں کو خیال آتا ہے | کہ فرشتے یہ اٹھائے ہوئے ہیں دستِ دعا
ہوئے جمعے کی جماعت میں جو سرکار شریک | رونق اسلام کی دہ چند ہوئی شکرِ خدا
میں نے خوش ہو کے کہا سالِ نزولِ اجلال | کعبے میں قبلۂ حاجات ہیں مصروفِ دعا
چاہئے سب کو زیارت سے مشرف ہو کر | ہر زباں ہو سے کہیں صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ
ہے نمائش کی نمود اس کی نموداری سے | جشنِ جمشید کے مانند جما ہے میلا
صاحبِ جشن سے ہے جشن کی ساری رونق | ہے یہ میلا تو برات اور وہ اِس میں دولھا
طول اچھا نہیں نازک ہے دماغِ ممدوح | چاہئے تجھکو امیر اب کہ اٹھا دستِ دعا

جب تلک خانۂ کعبہ کی بنا ہے باقی
جب تلک مرجع اسلام رہے بیت خدا

یہ ریاست رہے سرسبز رعایا آباد
نخل دولت شجرِ شوکت و اقبال ہرا

جس قدر جس سے ہو اس عہد میں دولت خواہی
بڑھ کے دنیا سے ملے اس کو جزا روز جزا

قصیدہ دیگر

عید اضحیٰ نے کھلایا ہے وہ لالے کا چمن
کہ شفق لوٹتی ہے دیکھ کے اُس کا جوبن

عید ہے عید جوانان چمن کو ہے نصیب
غسل کرتے ہیں بدلتے ہیں نئے پیراہن

رختِ گل کے لئے ہے مخملِ رنگینِ شفق
اطلس چرخ بریں بہر لباس سوسن

غنچے کی طرح معطر ہے فلک کا بھی دماغ
عطر افشاں ہے ہوا بادبہاری کا چلن

عرقِ شرم میں آخر کو ستارے ڈوبے
اس قدر پھول چنبیلی کے ہوئے چشمک زن

جا بجا ابر کے لکے نہیں بالائے فلک
سبزہ زاروں میں یہ چرتے ہوئے پھرتے ہیں ہرن

طوطیِ سبزۂ نوخیز بھی ہے زمزمہ سنج
جب سے آئینہ دکھاتی ہے اُسے نہرِ چمن

لیکے اُٹھتے ہیں بگولے زرِ گل کے توڑے
کوڑیالے سے ہے ایسا متمول ہر بن

سبزہ بالائے زمیں روئے فلک ابر سیاہ
سبزہ زار ایک طرف ایک طرف بجلی بن

یوں چمکتی ہے کبھی ابر سیہ میں بجلی
جس طرح منہ سے اگل دیتا ہے کالا کوئی من

قافلے بوئے گلِ تر کے ہیں راتوں کو رواں
کیا عجب چاندنی کے فرش میں پڑ جائے شکن

موج آواز میں ہے قوسِ قزح کی رنگت
رنگ جمجائے جو بے فصل بھی گائیں ساون

سبزہ آسا ہیں دلِ اہلِ تماشا پامال
کبک کہسار کا سیلاب نے سیکھا ہے چلن

نظرِ بد نہ کریں سوئے چمن مردمِ چشم
اس لئے تنگی ہے ہر صفِ مژگان چلمن

آنکھ حوش چشم لڑاتے نہیں ہیں دہشت سے
اس قدر دیدۂ نرگس کی ہے تیکھی چتون

چاندنی میں جو پریزاد کدارا گائیں — شاخ آواز سے پھوٹیں گل نسرین و سمن

بانٹی یہ چمپے کے پھولوں نے سنہری رنگت — نگئیے سونے کے پتلے صنم سیم بدن

باغ عالم میں ہے یہ نشو و نما ان روزوں — منہ سے ہوتے ہی جدا پھولتا پھلتا ہے سخن

کثرت گل سے یہ ہموار ہوئے پست و بلند — کہیں رکتی نہیں چلنے میں زبان الکن

سبزہ رنگان چمن آنکھ چرا جاتے ہیں — سبزے پر نام خدا ایک ہے ایسا جوبن

کوچۂ گیسوئے سنبل میں یہ شبنم کا ہے رنگ — بھرتی ہے موتیوں سے مانگ کو جس طرح دلہن

مسی سوسن کی جو پھیلی صفت ابر سیاہ — نالہ کش صورت طاؤس ہوا چرخ کہن

رنگ لے لیکے اڑی لالہ و گل کا جو نسیم — ہو گیا ابر سیہ کا شفقی پیراہن

شوق سے ہاتھ بڑھاتی ہے زلیخائے بہار — یوسف گل کا کہیں چاک نہ ہو پیراہن

ایسے موسم میں جو گزرا میں گلستاں کی طرف — بلبلیں بولیں کہ اے طوطی بستان سخن

فصل گل میں تو خموشی نہیں زیبا تجھکو — کہ امنگوں سے نوا سنج ہیں مرغان چمن

عید کا دن ہے مناسب ہے کہ ہو زمزمہ سنج — مدح میں اُس کی جو ہے فخر سلاطین زمن

اس قصیدے میں چونسٹھ ۶۴ شعر ہیں۔

قصیدہ دیگر

ہوئی بہار کے پردے میں عید جلوہ نما — ہزار گل ہوئے ایک ایک شاخ سے پیدا

تمام تاج محل تختۂ زمرد ہے — نمو سے سبزۂ تر ہے عجب نشاط افزا

جو گل ہے لعل ہے یاقوت اور در شبنم — چمن دکان جواہر فروش ہے گویا

کمند گیسوئے سنبل کی دوش پر رکھکر — شکار کھیل رہی ہے دلوں کا باد صبا

جو عندلیب ہے اسیر ہے شبہہ طاؤس — کلی کلی سے ہزاروں ہوئے ہیں گل پیدا

نہیں مقامِ تعجب جو صورتِ گلچیں — چمن میں پھولے پھلے بلبلوں کی شاخ سدا

یقیں ہے آتشِ گل کی لپک سے جل جائے — چلے اٹھا کے نہ دامن اگر روش پہ صبا

ادائیں ہیں یہ جو انانِ باغ کی دلکش — کہ بوئے گل ہے رگِ گل سے مرغِ رشتہ بپا

عجب طرح کا نمک ہے تبسمِ گل میں — کہ زخمِ سینۂ بلبل کو دے رہا ہے مزا

وہ نور ہے وہ ضیا چاندنی کے پھولوں میں — کہ اسکی شرم سے ہے آفتاب دَر بہ قفا

کفارِ نہر خطِ سبزہ گیسوئے سنبل — دکھائی دیتے ہیں ظلمات و خضر و آبِ بقا

ہوا مسیح نفس آبِ نہر آبِ حیات — شفا یہ کہتی ہے دار الشفا کہاں ایسا

جو چاق ہوتا ہو بیمار کو یہاں آئے — اشارے کرتی ہے یہ چشمِ نرگسِ شہلا

جو حوریں سیر کو آجائیں چھپ کے رضواں سے — چھپیں وہ مہندی کی ٹٹی میں شکلِ برگِ حنا

عصا بدست جو آئیں یہاں کلیم اللہ — تو لائے شاخ ادا سوگلِ یدِ بیضا

بہ دعا کو ہاتھ اٹھائے کوئی تو واہ رے فیض — وہیں ہو رنگِ اجابت حنائے دستِ دعا

یہاں پہنچ کے طبیعت جو رنگ پر آئی — اک اور مطلعِ رنگیں زباں پہ آیا

مطلع

ریاضِ دہر میں اللہ رے جوشِ نشو و نما — درِ قبول کا بازو بنا ہے دستِ دعا

جو لیکے سبحہ کرے کوئی ذکرِ یا رزاق — تو دانے دانے سے نخلِ مراد ہو پیدا

زباں پر آتے ہی ہوتا ہے ہر سخن سرسبز — زمیں کی طرح ہے اک سبزہ زار سطحِ ہوا

بہا ہے ایک جوشِ رطوبت سے آب و خاک کا رنگ — نہیں ہے فرق تیمم میں اور وضو میں ذرا

جما ہے گلشنِ آفاق میں یہ رنگِ نشاط — کہ ہاتھ سرخ حسینوں کے ہیں برنگِ حنا

پہن کے آئیں جو گلشن میں جامہ آبی — بنائے ان کو گلابی کہ رنگریز ہے صبا

انگوٹھیوں میں اگر ہوں نگینۂ الماس | بنیں وہ غیرتِ یاقوت و لعلِ بیش بہا

بدل گئی ہے ضیا سے جو ظلمتِ عارض | نہیں رہی کسی زنگی کو آئینے سے حیا

چمن گلوں سے بہبو کا ہے ابر سے یہ کہو | لگا کے آگ یہ پانی کو ڈورنا کیسا

وہ رنگِ لالہ کہ اللہ رے تری قدرت | وہ موجِ نکہتِ گل کی مہک کہ صلِّ علیٰ

ہر ایک قطرۂ شبنم ہے دیدۂ حق بیں | ہر ایک سبزہ ہے رطب اللسانِ شکرِ خدا

جو شاخِ گل ہے وہ ہے شمعِ بزمِ حسن و جمال | جو برگِ گل ہے وہ آئینہ دارِ صدق و صفا

درخت کیوں نہ ہوں گلزار میں مرقع پوش | کہ قطرہ قطرۂ باراں ہے گوہرِ یکتا

حباب ہیں گلِ رنگیں تو موجِ گل موجیں | برنگِ دستِ حنا بستہ ہے کفِ دریا

مزہ ہے ایسے میں ساقی پلائے بادۂ عیش | کہ سوجھیں نشے میں مضمونِ تازہ روح فزا

کہوں قصیدہ کوئی مدحِ شاہِ عادل میں | کہ جس کا ہند سے ہو جائے تا عجم شہرا

اس قصیدے میں اٹھاون شعر ہیں

قصیدہ دیگر

چاندنی رات ہے اور ابر ہے تھوڑا تھوڑا | ساقیا آج کی شب مے کا غضب ہے توڑا

عید ہے توڑ کے مہرِ سرِ خم سامنے آ | اور انعام میں لے اشرفیوں کا توڑا

کھول شیشے کا دہن لب سے ملا دے لبِ جام | ہے ستم تو نے اگر آج کہیں منہ موڑا

تو بھی چمکا دے ذرا نشۂ مے کا رہوار | رعد نے برق کے توسن پہ لگایا کوڑا

نشۂ مے میں وہ دریائے سخاوت کا ہو جوش | کہ ہر اک جام پہ دوں میں تجھے زر کا توڑا

ڈال دوں گردنِ مینا میں طلائی کوئی طوق | دخترِ زر کو پنہا دوں کوئی بھاری جوڑا

عذر دینے میں نہیں ہو تجھے جس شے کی طلب | کچھ نہیں مال مرے سامنے ہاتھی گھوڑا

سیر فردوس کی آئی مجھے مستی میں ترنگ
واہ کیا قلقل مینا نے شگوفہ چھوڑا

کیا تعلّی ہے ہوئی مجکو جو درکار گزک
نقل طوبیٰ سے ثمر ہاتھ بڑھا کر توڑا

اڑ گڑا چرخ کا پھاندے مرے نشے کا سمند
ہاتھ آ جائے جو سلفے کا بھی کوئی کوڑا

چاہیے نشے میں کچھ اُس کی کروں میں تعریف
فیل جس کا ہے فلک برق ہے جس کا گھوڑا

کون وہ شاہ جہاں بیگم دارا سطوت
لعل جس کے در دولت کا ہے ہر اک روڑا

کیا شجاعت ہے کہ جب معرکہ درپیش ہوا
رعب نے بڑھ کے وہیں قلعۂ خیبر توڑا

شوق سے آڑ کے نشانہ ہوئے نسرین فلک
تیر جس وقت دم صید کماں سے چھوڑا

کیا سخاوت ہے کہ سائل کو دیا وقت سوال
عوض ریزۂ زر اشرفیوں کا توڑا

رات دن دست کرم رہتے ہیں گوہر افشاں
گھر میں فوّاروں کے پانی کا نہیں ہے توڑا

کیا شریعت ہے کہ ہر ایک چمن میں ڈر کر
رقص طاؤس نے بلبل نے ترانہ چھوڑا

داغ دے آتش مے ہاتھ میں لے گر کوئی جام
شیشۂ بادہ پرستوں کی بغل میں پھوڑا

کیا عدالت ہے کہ پاتے ہیں سزا اہل فریب
منہ بگڑ جائے جو ہوس جو بنائے جوڑا

بجھ گئی آگ شرر نے جو جلایا پنبہ
ہل گیا کوہ اگر سنگ نے شیشہ توڑا

شل گیا جس کی بندھی دست درازی پہ کمر
پانوں جس کا کہ ذرا حد سے بڑھا سر پھوڑا

کیا مروت ہے کہ ہر تشنہ دہن ہے سیراب
خشک سالی میں بھی پانی کا نہیں ہے توڑا

شان جتنی ہے ریاست کی وہ سب آپ میں ہے
پھر بھی لطف کے ہمراہ ہے تھوڑا تھوڑا

سو شرف نعت و مکاں ہے کہ کرے کیا کوئی وصف
قائمہ عرش کا چھجے کا ہے جن کے توڑا

اس قدر صاحب اقبال توکل نے کیا
تنگیے کام کہ ہر کام خدا پر چھوڑا

دین اللہ کی خواہاں مشقت کب ہے
چاندنی کا نہ کبھی کھیت کسی نے گوڑا

تیغ وہ تیغ کہ عالم میں نہیں جس کی پناہ
چھکّے چھوٹے جو کبھی ہاتھ کسی پر چھوڑا

فیل وہ فیل کہ ہے فیلِ فلک پست اُس سے
تیز تر ابلقِ ایام سے بھی ہے گھوڑا

کر سکا آپ کی تعریف کا شمہ نہ رقم
بند پر بند محرر نے مکرر جوڑا

ختم کر ختم قصیدے کو نہ دے طول امیرؔ
سامعین سنتے ہیں دل سے جو سخن ہو تھوڑا

نظرِ لطف ہو سرکار کی مداحوں پر
قسمت ایک کو ہو ایک سے بہاری جوڑا

رہے محرومِ عطا سے نہ عروسِ مضموں
پائے انگشتریِ یاقوتِ طلائی توڑا

جاہ و اقبال بڑھے ملک بڑھے مال بڑھے
دل ترقی طلبوں کا نہ کبھی ہو تھوڑا

شہسواروں میں الٰہی مرے ممدوح کی جیت
میرے سرکار کا آگے رہے سب سے گھوڑا

یوں نہ سرکار کے اعدا کو زمانہ چھوڑے
جس طرح قافیہ میں نے نہیں کوئی چھوڑا

قصیدہ دیگر

اللہ اللہ رے بہارِ چمنستانِ دکن
حور پر ہے نہ یہ جوبن نہ پری پر یہ پھبن

صفتِ روئے حسیں صاف ہے ہر ایک زمیں
اوڑھنی گھاس کی دکھلاتی ہے تازہ جوبن

ہر طرف جھومتے ہیں نشۂ شادی سے درخت
ہر قدم باغ میں مستانہ صبا کا ہے چلن

قہقہے پھولوں کے سنتے ہیں تو خوش ہو ہو کر
چہچہے کرتے ہیں مرغانِ خوش الحانِ چمن

چھوڑتی ہے کوئی نہروں میں شگوفہ جو صبا
دیکھنے لگتے ہیں فوارے اٹھا کر گردن

شاخِ گلبن پہ ہیں اس طرح شگفتہ غنچے
جیسے کھل جائیں جماہی میں حسینوں کے دہن

چشمِ بد دور عجب اوج پہ ہے حسنِ بہار
کہ رخِ ماہ کا غازہ ہے غبارِ گلشن

رنگِ اعجازِ مسیحا ہے نمو سے پیدا
کیا عجب پھولوں کی کلیاں میں جو مرغانِ چمن

جیب میں گل کے لگا ہے مہِ نو کا کنٹھا
دامنِ لالہ کی اک بیل ہے سورج کی کرن

اشرفی کی ہے وہ رنگت کہ جو اس کی تھی
چھوڑے تانبے پہ مہوش تو بنائے کندن

لعل و یاقوت ہیں یہ پھولوں کی بدولت حاصل
گل فروشوں کی دکانیں ہیں بدخشاں میں

جوہری ریزۂ الماس سمجھتے ہیں اُسے
ٹوٹ کر خاک پہ گرتا ہے اگر برگِ سمن

اودے پھولوں کی اوداہٹ ہے یہ نظر وہمی کبھی
دیکھنے والوں کی آنکھوں کی ہے پتلی سوسن

تختۂ ریحاں کا دکھاتا ہے بہارِ شبِ وصل
پوست پھولا ہوا دیکھو تو کہو صبحِ وطن

زلفِ سنبل پہ اگر چشمِ تماشا پڑ جائے
پتلیاں آنکھوں میں ہوں نافۂ آہوئے ختن

آتی ہے گریۂ بلبل پہ ہنسی پھولوں کو
نرگسِ باغ ہے گلچیں کی طرف چشمک زن

گردنِ گل میں ہیں ہاتھ کبھی شاخوں کے
چوم لیتا ہے لبِ جو کبھی غنچے کا دہن

باغباں دولتِ گلزار جو خیرات کرے
ٹوکری حور کی ہو آنکھ تو پلکیں دامن

نونہالانِ گلستاں کا جو عالم دیکھے
کھول کر آنکھ نہ دیکھے کبھی دولھا کو دلہن

شب کو ہوتا ہے جو مذکورِ گل و بلبل کا
شمع و پروانہ میں رہتی ہے سحر تک اَن بَن

جام پھولوں کو تکا کرتے ہیں آنکھیں کھولے
تاک شیشے بھی لگاتے ہیں اٹھا کر گردن

خوش لباسی کی ہے زینت تو گلِ رعنا میں
کج کلاہی کی جو پوچھو تو ہے غنچے میں پھبن

نالۂ بلبل کے لئے جامۂ زیبائی گل
طوقِ قمری کے لئے سرو کا بیساختہ پن

کیوں نہ طاؤس کریں رقص خوشی کے مارے
باغ میں ابرِ بہاری سے جو برسے کنچن

ارغواں رنگے ہیں گال سمن بویوں کے
آم کی طرح رسیلے ہوئے ہیں سیبِ ذقن

مشعل افروزِ گلستاں ہے نسیمِ سحری
غیرتِ شمع گلِ سرخ ہیں تھالے ہیں لگن

سیکڑے پھول سے گلزار ہیں سبزہ زار نہال
جامِ مے خندہ زناں شیشۂ مے قہقہہ زن

ایک ایامِ بہاری میں ہے ایسی تاثیر
پھول کا نام جو لے کوئی تو خنداں ہو دہن

دست انداز جو معشوق ہو گل بازی میں
ہاتھ میں پھول کا گجرا ہو چھڑا او کنگن

رات کو شمع اگر بادِ بہاری سے بجھے
عشق پیچاں ہو دھواں اور گلِ آتش سوسن

مثلِ طوطی چمنستاں میں جو پرواز کرے
زاغ ہر بل ہو ہوا لگتے ہی سبزک ہو غن

شاخِ شمشیر میں پابندِ سپر پھول کھلیں
نہرِ گلشن میں جو حداد بجھائے آہن

جوشِ روئیدگی ایسا ہے کہ ہوتا ہے گماں
سنگ دانے سے عنادل کے ہرا ہو گلشن

چاٹیں شبنم جو گزندے تو ہو ماہیتِ قلب
غنچہ ہو عقربِ جرارہ تو سنبل ناگن

عطر مٹی کا رضائی میں ملے کوئی اگر
دانۂ پنبہ سے پیدا ہو گلِ نسترن

پھولوں میں فصلِ بہاری کے یہ عطریت ہے
کوئی پھلکاری جو پہنے تو معطر ہو بدن

دشت میں قدرتِ خیاطِ بہاری دیکھو
پھولوں سے دامنِ صحرا پہ بنائی ہے چکن

جنبشِ برگِ گلِ تر میں ہے دف کی آواز
بالِ پروازِ عنادل میں صدائے ارغن

جو نہ کھٹے تھے کبھی سیر و تماشہ سے غرض
ہیں وہ نرگس کی طرح محوِ تماشا ہمہ تن

اے خوشا چشم میسر ہے جسے لذتِ دید
سبز اشجار میں ہے سبز خطوں کا جوبن

باغ میں سیر کو آئے ہیں وہ نازک اندام
ہیں جو شمشاد قد و لالہ رخ و غنچہ دہن

چال آفت کی قیامت کی ادا ظلم کی آن
نیزہ خولی کا نگہ شمر کا خنجر جوبن

چشمِ فتاں کو اگر غور سے دیکھو تو وہ ترک
جس کا ہر موئے مژہ ناوکِ فولاد شکن

رخِ شاداب ہے یا لالۂ احمر گلِ سرخ
زلفِ پرپیچ ہے یا سنبلِ تر مشکِ ختن

گردن و چشم کا عالم اگر آجائے نظر
جامِ مے آنکھ جھکا لے تو صراحی گردن

تذکرہ گوہرِ دنداں کا نہ لائے لب تک
آبِ گوہر سے صدف دھوئے نہ جب تک کہ دہن

اودے اودے وہ دوپٹے کہ جو دیکھے بجلی
نکل آئے ابھی بادل کی اٹھا کر چلمن

غش کرے کا ہکشاں دیکھ لے گر تی کی بنت ۔ باندھ لے گر دنِ خورشید کو انگیا کی کرن
کوئی چوٹی ہیں یہ چھٹے کا نہ سمجھے سوباف ۔ زلفِ سنبل سے ہیں لپٹے ہوئے اوراقِ سمن
بزم آراستہ وہ گانے بجانے کا سماں ۔ زاہدِ گوشہ نشین آئے تو ہو توبہ شکن
وقت عشرت کا ہے کر دے کوئی ساقی کو خبر ۔ کبک کے ساتھ مناسب ہے بطِ مے کا چلن

مطلع

کان ہیں منتظرِ قلقلِ مینائے سخن ۔ ساقیا شیشے سے کہدے نہ رہے بند دہن
جام پر جام چلے دورِ مے سرخ کا ہو ۔ موسمِ گل ہے گلِ عیش سے بھر لیں دامن
ہو جہد ا قلقلِ مینا کی یہ گلشن میں بلند ۔ مے کے پرہیز ہے جن کو وہ ہوں پرہیز شکن
بحرِ مے میں یہ تلاطم ہو کہ مانندِ حباب ۔ مے میں ڈوبے ہوئے میخوار رہیں تا گردن
پر پرواز لگا دے جو اُٹھے موجِ شراب ۔ اُڑ چلے ہر بطِ مے ہمرہِ مرغانِ چمن
دف و طنبور کی ہو چھیڑ بجیں بربط و نے ۔ سُر وہ دیپک کا لگے جس سے کہ پیدا ہو جلن
لطف تب ہے کہ چھڑے آج حسینی کا مقام ۔ کان مشتاق ہیں سب کے کہ سنیں صوتِ حسن
جمع ہیں مستِ قدح نوش خرابات نشیں ۔ جلوہ ساغر و مینا و سبو توبہ شکن
وہ مے تلخ کہ شیریں سے ہے جسکو شکر آب ۔ بوتلیں ایسی کہ لیلیٰ کا تصدق جوبن
قول شیشے کا ہے مستوں سے کہ پی لو پی لو ۔ کرمِ قلب اس اکسیر سے ہوگا کندن
بطِ مے جلوہ طاؤس دکھاتی ہے کہیں ۔ کبک کی طرح صراحی ہے کہیں قہقہہ زن
سرد ہے صورت مینا تو صراحی غنچے ۔ بادہ شبنم ہے تو ساغر گلِ نسرین و سمن
ہر رگِ گل کو اگر مست خطِ جام کہیں ۔ موجِ جامی کی کہے اسمیں نہیں چلے سخن
خبر اس بزم کی پہنچائے اگر پیکِ نسیم ۔ قبر سے پھاڑ کے نکلے ابھی جمشید کفن

خار کھاتے جو بہجت کہیں رضواں دیکھے — حور سے بڑھ کے ہے شیشے کی پری کا جوبن

اثرِ بادِ بہاری نہیں یہ جوشِ بہار — بلکہ ہے بارشِ ابرِ کرمِ فخرِ زمن

مطلع

کون وہ فخرِ زمن بادشہ ملکِ دکن — نام نامی صفتِ مہر ہے جن کا روشن

میر محبوب علیخانِ بہادر جمجاہ — جن کے دربار میں جمشید کی خم ہے گردن

اس قصیدے میں (۱۵۸) شعر ہیں۔

واسوخت

واسوخت لکھنؤ کے مرغوبات میں سے ہے اور دلچسپ چیز ہے وہاں ابتدا اسکی اَمانت نے کی اور اچھا واسوخت کہا۔ پھر سحر شاگردِ ناسخ نے آفتابِ سخن کو چمکایا اِن واسوختوں کی شہرت نے شعرا کے دل میں آگ لگا دی قریب قریب ہر ایک گرم طبع نے واسوخت کہا۔ اَمیر نے جب یہ گرما گرمی دیکھی وہ بھی متوجہ ہو گئے اور چھ واسوخت علی الاتصال تصنیف فرمائے۔ ہر ایک واسوخت ایک خصوصیت جداگانہ رکھتا ہے۔ اور اعلیٰ شاعری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اَمیر نے ہر واسوخت کا نام تاریخی رکھا ہے۔

پہلا واسوخت۔ واسوخت اردو ۔ دوسرا۔ شکایتِ رنجش ۱۲۸۴ ۔ تیسرا۔ عیارِ طبع ۱۲۸۴ ۔ چوتھا حسدِ اغیار ۱۲۸۴ ۔ پانچواں صفیرِ آتشبار ۱۲۸۴ ۔ چھٹا بانگِ اضطرار ہے ۱۲۸۴ ۔ یہ سب ایک ہی سال کی گویائی ہے۔ اور زورِ طبع کا گویا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہر واسوخت میں پر زور مضامین کے دریا لہراتے نظر آتے ہیں اور اُن میں سراپا کے تشبیہات و استعارات سحر و اعجاز کا ثبوت دیتے ہیں۔

سب واسوختوں میں (۴۹۷) بند ہیں یعنی (۱۴۹۱) شعر ہیں کہیں کہیں سے تھوڑے تھوڑے بند نقل کئے جاتے ہیں۔

عشق کے فتوحات

دھوم ہے خسروِ اقلیم جنوں آتا ہے
فوج غم ساتھ لیے آمادۂ خوں آتا ہے

خلل اندازِ صفِ صبر و سکوں آتا ہے
صاحبِ لشکرِ نیرنگ و فسوں آتا ہے

قابلِ دید تماشا حشم و جاہ کا ہے
داخلہ تختگہِ دل میں شہنشاہ کا ہے

وہ فلک قدر شہنشاہِ زمن کون کہ عشق
تیغ زن شیر فگن قلعہ شکن کون کہ عشق

رستمِ معرکۂ رنج و محن کون کہ عشق
مالکِ ملکِ دل و جان و بدن کون کہ عشق

گرد میں ہے روشِ بادِ بہاری دیکھو
حضرتِ عشق کی آتی ہے سواری دیکھو

لو وہ آتا ہے جو ہے موجدِ نیرنگ و فسوں
تشنہ کامِ محبت کا جو ہے تشنۂ خوں

جس کے آگے سرِ تسلیم دو عالم ہے نگوں
سر جھکائے ہے قدمبوس کو جس کے گردوں

جب یہ شمشیرِ دو دم غیظ علم کرتا ہے
سر جلادِ فلک کو بھی قلم کرتا ہے

اُس کی آمد ہے جسے کہتے ہیں قتالِ جہاں
اُس کی آمد ہے جو مشہور ہے چنگیزِ زماں

اُس کی آمد ہے جو کرتا ہے گلِ عیش خزاں
اُسکی آمد ہے جو ہے سر شکنِ تاب و تواں

تیغ کھینچے ہوے سرگرمِ عتاب آتا ہے
ملک الموت بھی ہمراہِ رکاب آتا ہے

کیا جلوس اسکی سواری کا دکھاتا ہے بہار
فیلِ آفت کے جلو میں ہیں ستم کے رہوار

آگے آگے علمِ نالۂ خورشید نثار
زر فشاں اُسکا پھریرا کہ دھواں آتشبار

دل جو ٹوٹے ہیں نقیب آہ کے للکارے ہیں

آبلے سینۂ عشاق کے نقارے ہیں

حشر میں کشتہ ہیں جس کی وہ ستمگر ہے یہی — پہلواں جس نے پچھاڑے وہ دلاور ہے یہی
ڈوبتے جس نے نکالے وہ شناور ہے یہی — کشتیاں جس نے ڈبوئیں وہ سمندر ہے یہی

خضر کا غرق ہے یاں آج نہیں کل بیڑا
نوح لائیں جو سفینہ نہ لگے تھل بیڑا

کہو آراستہ بازارِ محبت ہو جائے — چمکیں آنکھوں کی دوکانیں نئی صورت ہو جائے
وحشت آبادِ غم و درد کی زینت ہو جائے — خانۂ خانہ خرابی کی مرمت ہو جائے

صاف ہو دل کا مکاں جشن کی تیاری ہو
کمرے کمرے میں گلِ داغ کی گلکاری ہو

چشمِ تر اشک کا چھڑکاؤ کرے بر سرِ راہ — صرف جاروب کشی زلف سے ہو بختِ سیاہ
غم و اندوہ کی استادہ دو رویہ ہو سپاہ — دوڑ کر لائے خبر جلد کہو پیکِ نگاہ

ہے ابھی دور کہ پہونچی ہے سواری نزدیک
کس قدر باغ سے ہے بادِ بہاری نزدیک

چاہیے آتے ہی یہ جشن کا ساماں ہو جائے — جس کو جمشید بھی دیکھے تو پشیماں ہو جائے
دلِ صد چاک سے آراستہ ایواں ہو جائے — فرش زخمِ تنِ مجروح کا داماں ہو جائے

بجتے تھے جو کنارو نیہ گڑیں نالوں کے
جھاڑ فانوس کنول بزم میں ہوں چھالوں کے

دو یہ پریوں کے صدا قاف سے اڑ کر آئیں — ساتھ دیوانوں کو سازندوں کے بدلے لائیں
بجلیاں لینے لگیں سب وہ ترانے گائیں — رقص پر آئیں تو انداز نئے دکھلائیں

پھڑکے ہر عضوِ بدن طائرِ بسمل کی طرح
کاٹتے راہ چلیں خنجرِ قاتل کی طرح

تہنیت کی یہ ہر اک ساز سے نکلے آواز — تم سلامت رہو تابع ہوں عراق اور حجاز
وہ بھی قائم رہیں شہزادے جو ہیں سوز و گداز — حسن جو آپ کی معشوقہ ہے عمر اسکی دراز
آپ کو وصلتِ جانانہ مبارک شاہا
خلق کو عرسِ جوانانہ مبارک شاہا

مے کشی کا جو خیال آئے تو ہے خونِ جگر — دورِ پیمانہ دکھائے کوئی پھر جائے جو سر
جام وہ جنکو کہیں غیرتِ خورشید و قمر — ساغرِ جم کی طرح آئینہ عالم کی خبر
وسعتِ ظرف سے دریا کہیں امید کے ہوں
چرخ کا خُم ہو پیالے مہ و خورشید کے ہوں

جوششِ مستی میں جو ہو فیض رساں طبعِ غیور — منہ خزانے کا کھلے نورِ کرم کا ہو ظہور
پائیں انعام ہوا خواہ ہوں نزدیک کہ دور — بہرہ ور ہوں دُرِ مقصود سے خدام ضرور
داغِ حسرت عوضِ درہم و دینار بٹیں
ڈھیر یوں آنسوؤں کے گوہرِ شہوار بٹیں

جامہ زیبوں کو ملیں خلعتِ عریانیِ تن — اطلسِ گرد ہو کمخواب کی جا زیبِ بدن
زخم پر زخم دو شالہ ہو برائے گردن — مدح گو کا دُرِ تحسین سے بھر جائے دہن
داغ کی سب کو سپر آہ کی شمشیر ملے
وحشت آبادِ جنوں خیز میں جاگیر ملے

ہار زخموں کے بٹیں باغِ طرب ہو شاداب — تیغ کے نالے ہوں تقسیم کھلے فیض کا باب

خاص لوگوں کے بڑھیں تب عنایت ہوں خطاب   ہوں خطاب ایسے کہ جو ایک کا ہو ایک جواب

میرزا یاس مخاطب بہ جلیس الدولہ

میر حرمان ہوں مخاطب بہ انیس الدولہ

ہو چکے جشن تو خاصے کا بھی ہو پھر ساماں   ہاں چنے جائیں وہ خاصے جو ہوں نایاب جہاں

میز پر ظرف ہوں انجم کی طرح نور فشاں   لائیں حوروں سے کہو مائدۂ باغِ جناں

چرخ کے خواں سے بھی نعمتِ الوان آئے

نانِ خورشید پنیرِ مہِ تاباں آئے

مرغِ جاں آتشِ حسرت سے ہو جل بھن کے کباب   شلغمِ آبلۂ دل من و سلویٰ کا جواب

خشک مغزی کا وہ خشکہ نہ رہے دیکھ کے تاب   لختِ دل خونِ جگر کی ہو نہاری نایاب

تافتانوں کی جگہ داغِ زبوں حالوں کے

کوفتے لختِ جگر خواہ پچے پتھالوں کے

آتشِ خوں وہ کہ نہ ہو سیر کسی کی نیت   سیر چشموں کو ملے لقمۂ غم کی لذت

زخم پر چھڑکے نمک جو نمکیں ہو نعمت   لب نان وہ کہ لبِ تیغ کی ہو جس میں صفت

کارِ حلوا اثرِ زہرِ ہلاہل ہو یہاں

شوربا آبِ دمِ خنجرِ قاتل ہو یہاں

بعد خاصے کے لگے چھٹنے وہ آتشبازی   آگ اٹھے اگل کرے چرخ بھی برق اندازی

ہو تماشا کہیں فیلوں کی وغا پردازی   جل کے طاؤس کریں چار طرف طنازی

چرخی نالے کی ملے گنبدِ دولابی سے

رات ہو روز رخِ زرد کی مہتابی سے

قلعے کاغذ کے جہاں نصب ہیں ہوں آتشبار — آگ کرلے کرۂ ارض کو دم بھر میں حصار
صفتِ سروِ چراغاں ہوں شرربار انار — جیسے پرواز کریں نالۂ عاشق کے شرار

چمکیں چھپالوں کے تناسے کہیں خنجر کی طرح
چادرِ اشک لگے چھوٹنے چادر کی طرح

ہوئی القصہ جو دعوت سے فراغت حاصل — سارے اسبابِ ضیافت سے فراغت حاصل
شرطِ مہمانی و خدمت سے فراغت حاصل — عطر سے پان سے شربت سے فراغت حاصل

عیش و عشرت کا غرض سب سر و ساماں آیا
بعدِ دعوت کے دمِ رخصتِ مہماں آیا

کشتیاں پیش جواہر کی ہوئیں بوقلموں — جس پہ قرباں کرے گوہر انجم گردوں
سرخ یاقوت ہزاروں صفتِ قطرۂ خوں — چہرۂ زرد کے پکھراج بھی گنتی سے فزوں

لختِ دل لعل تھے نیلم تھے کہ تبخالے تھے
تارِ اشکوں کے نہ تھے موتیوں کے مالے تھے

خسروِ عشق کو آیا دمِ رخصت یہ خیال — دل کی اقلیم حقیقت میں ہے زرریز کمال
معتدل آب و ہوا جس سے طبیعت ہے نہال — چھوڑ دے کیوں اسے دولت سے یہ ہے مالامال

قطعے قطعے میں طرب خیزی گلشن ہے یہاں
گوشے گوشے میں زرِ داغ کا مخزن ہے یہاں

صبر نامی ہے جو اس کشور آباد کا شاہ — کیجئے قید کسی طرح اسے رکھکے گناہ
اسکو پوشیدہ خبر اسکی جو پہونچی ناگاہ — نہ تھمے پانوں کہا دل میں کہ انا للہ

رعبِ غالب یہ ہوا ڈر کے وطن چھوڑ دیا

خوفِ صیاد سے بلبل نے چمن چھوڑ دیا

کشورِ دل میں جہاندار ہوا خسروِ عشق — مالکِ دولتِ بیدار ہوا خسروِ عشق
رونق افزا سرِ دربار ہوا خسروِ عشق — تاج کا تخت کا مختار ہوا خسروِ عشق
نام خطبے میں کیا شاہ نے اپنا جاری
کشورِ دل میں ہوا داغ کا سکّا جاری

ظلم و بیداد پہ جب نیتِ شاہی آئی — لٹ گیا ملک رعایا پہ تباہی آئی
آخرا تدبیر ہوا یہ کہ بلا ہی آئی — خون سے سرخی ہوئی موقوف سیاہی آئی
داغِ وحشت کی نظر جلوہ گری آنے لگی
پاس دیوانے کے خلوت میں پری آنے لگی

مائلِ دید ہوئے دیدۂ دیدار طلب — دل تماشائے سراپردۂ اسرار طلب
لب ہوئے ذائقۂ بوسۂ رخسار طلب — مرغِ جاں کشمکشِ طرۂ طرار طلب
دفعتاً سر میں بھری سارے زمانے کی ہوا
دشتِ وحشت میں ہوئی خاک اڑانے کی ہوا

خواہشِ جلوۂ محبوب ہوئی پہلو کو — حسرتِ زانوئے محبوب ہوئی زانو کو
دھیان آیا دلِ سودا زدۂ گیسو کو — سو بکھیڑے چل کے کسی کاکلِ عنبر بو کو
عمر بے صحبتِ محبوب کٹے خوب نہیں
زیست کا لطف بجز صحبتِ محبوب نہیں

عشق کے صفات

عشق عشاق کو رسوائے جہاں کرتا ہے — صاحبِ ضبط کو سرگرمِ فغاں کرتا ہے

چشمۂ چشم سے سیلاب رواں کرتا ہے زرد چہرہ صفتِ برگِ خزاں کرتا ہے

نوجواں خم صفتِ پیرِ کہن سال ہوئے
سیکڑوں باغِ جوانی تھے کہ پامال ہوئے

اس خزاں نے کئے پامال گلستاں کیا کیا ہوئے برباد گل و لالہ و ریحاں کیا کیا
جسم داغوں سے بنے سرو چراغاں کیا کیا اٹھواں جل کے ہوئے مشعلِ سوزاں کیا کیا

پھونک دیتا ہے دو عالم کو شرارہ اسکا
سات دوزخ نہیں ہے ایک شرارہ اسکا

یہ وہ ہے آگ پڑے اس پہ تو پتھر جلجائے طور کی طرح تر و خشک برابر جلجائے
دامنِ موج تو کیا پانی کی چادر جلجائے پر پروانہ صفت بالِ سمندر جلجائے

شعلہ افگن ہو یہ بجلی تو کرے خاک سیاہ
جل کے اکدم میں ہوں نہ خرمنِ افلاک سیاہ

صفتِ دیوانہ نہ ہو عقل جو رکھتا ہو بشر تا بمقدور کرے سائے سے پریوں کے حذر
پوچھے حق تو پریخواں کے یہاں جلتے ہیں پر کیا کرے جب نہ دوا میں نہ دعا میں ہو اثر

نقش و تعویذ سے یہ جن نہ اترتے دیکھا
ہو گیا جس کو یہ آسیب اُسے مرتے دیکھا

دل لگاتے ہی ہزاروں کو پڑی جانوں کی سیکڑوں چھان چکے خاک بیابانوں کی
دھجیاں اڑ گئیں کیا کیا نہ گریبانوں کی جس جگہ دیکھئے ٹکڑی ہے پریشانوں کی

کچھ عجب بزم ہے یہ لوگ جہاں ہوتے ہیں
چار سر پھوڑتے ہیں چار کھڑے روتے ہیں

پھاڑ کر کپڑے ہوئے جامے سے باہر کتنے　　چھان کر خاک ہوئے خاک برابر کتنے
تشنہ لب ڈوب مرے چاہ میں گر گر کتنے　　غرقِ دریا ہوئے تھک تھک کے شناور کتنے

دب رہا کوئی سیہ خانۂ زنداں کے تلے
کوئی روتا ہے کسی نخلِ بیاباں کے تلے

تنگ دستوں کے فقط ہاتھ نہیں ہیں تہ سنگ　　صاحبِ دولت و اقبال بھی جینے سے ہیں تنگ
چادر بالش کی نہ رونق ہے نہ زیبِ اورنگ　　جان پر تنگی ہے، ہیں تیغِ ادا کے جو زنگ

دشت پیما ہیں کسی طرح کا وسواس نہیں
پانوں میں آبلے ہیں گنجِ گہر پاس نہیں

حال انسان کا اسی غم سے زبوں ہوتا ہے　　یہی صدمہ سببِ جوشِ جنوں ہوتا ہے
سر اسی بارِ مشقت سے نگوں ہوتا ہے　　آب زہرہ تو جگر چشمۂ خوں ہوتا ہے

ٹوٹ جاتی ہے کمر صبر و شکیبائی کی
راہ لیتے ہیں قدم کوچۂ رسوائی کی۔

پاسِ ناموس کا رہتا ہے نہ غیرت کا خیال　　دل سے اٹھ جاتا ہے بدنامی و ذلت کا خیال
پندِ ناصح کا نہ واعظ کی مذمت کا خیال　　دشتِ پرخار کا یا وادیِ وحشت کا خیال

جوش کم سنگِ ملامت کا کہاں ہوتا ہے
تیغِ وحشت کو یہی سنگ فساں ہوتا ہے

بیگناہوں کی اسی کوچے میں مٹی ہے خراب　　دادخواہوں کو یہاں پست سے ملتا ہے جواب
آگ جو جن کے جلاتی ہے کلیجا یہ شراب　　ہر نفس سیخ تو ہر لختِ جگر شکلِ کباب

حال ہوتا ہے زبوں ہوش پریشاں اس میں

آدمیت سے گزر جاتا ہے انساں اس میں

عاشق کی حالت

الحذر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں پھر ہے
الاماں خاطرِ ناشاد پریشاں پھر ہے

دامنِ وادیٔ وحشت مرا داماں پھر ہے
جادۂ دشت مرا چاکِ گریباں پھر ہے

موجِ اشکوں کی نظر آتی ہے زنجیر مجھے
پیچ تقدیر کا ہے طوقِ گلوگیر مجھے

تنگ ہوں شہر سے الفت ہے بیاباں سے مجھے
خفقان ہوتا ہے گلگشت گلستاں سے مجھے

اپنے کپڑے نہیں کم خانۂ زنداں سے مجھے
طوقِ وحشت نے پنہایا ہے گریباں سے مجھے

حلقے آنکھوں کے نہیں ضعف کی تصویریں ہیں
جسمِ لاغر میں رگیں جتنی ہیں زنجیریں ہیں

شدتِ گریہ ہے اشکوں کی فراوانی ہے
کشتیٔ چرخ تلک کشتیٔ طوفانی ہے

شوقِ دل معتقدِ سلسلہ جنبانی ہے
آہِ پر دود کہ زنجیرِ پریشانی ہے

تیغِ افغاں جو کھنچے شرم سے بجلی کٹ جائے
شورِ نالوں کا سنے رعد کلیجا پھٹ جائے

دل کی وحشت سے یہاں تک کہ ہے صحرا معمور
روحِ مجنوں کی گریزاں ہے مرے سائے سے دور

شورِ زنجیر سے ہے چار طرف شورِ نشور
نالہ کش دل نہیں پھونکتا ہے سرافیل نے صور

لب پہ آہ آئی اگر خلق پہ آفت آئی
مُردے قبروں میں یہ چلائے قیامت آئی

اننو چہرے سے نمایاں ہیں یہ وحشت کے اثر
ڈر کے اُڑ جاتے ہیں طائر بھی ہیں جاتا ہوں جدھر

تھیں غزالیں مری صورت سے فقط جن و بشر — راہ سے غار تلک اڑ گئے ناگن بنکر

دیکھے وحشت تو رسیدہ ابھی آہو ہو جائے

پڑھ کے نام اپنا جدھر چھو میں کروں ہو ہو جائے

معشوق سے شکایت

یاد ایام کہ شوخی کا یہ انداز نہ تھا — جلوۂ حسن ادا حوصلہ پرواز نہ تھا

شمع فانوس بیاں شعلۂ آواز نہ تھا — اک جہاں کشتۂ تیغ نگہ ناز نہ تھا

آنکھیں خونریز نہ تھیں خنجر قاتل کی طرح

لوٹتے تھے دل عشاق نہ بسمل کی طرح

پانوں پردے سے نہ نکلا تھا تمہارا باہر — صورت آئنہ تھے خانہ نشیں شام و سحر

صحن تک بھی تمہیں دالان سے آنا تھا سفر — ڈرتے ڈرتے کبھی جاتے تھے اگر جانب در

دیدۂ نقش قدم سے تمہیں تک جاتے تھے

دیکھکر سایے کو ہمراہ جھجک جاتے تھے

آگہی زیب سے تھی تم کو نہ زینت سے خبر — مسی ملنے کا نہ لپکا تھا نہ سرمے پہ نظر

ہاتھ مہندی سے نہ تھے پنجۂ مرجاں اکثر — آتش رنگ حنا سے نہ جلاتے تھے جگر

دامن زلف تلک دسترس شانہ نہ تھا

آئینہ پرتو عارض سے پری خانہ نہ تھا

سیکڑوں آئنہ حسن کے حیران کب تھے — لاکھوں گیسو سے پریشاں کے پریشاں کب تھے

اتنے وحشت زدہ نرگس فتاں کب تھے — اس قدر مشتری سیب زنخداں کب تھے

کوچہ یوں آٹھ پہر مصر کا بازار نہ تھا

تم تو یوسف تھے مگر کوئی خریدار نہ تھا

کون تھا میرے سوا چاہنے والا صاحب　　یگانگی ماہ تھے تم اور میں ہالا صاحب
میری چاہت سے ہوا رتبہ دوبالا صاحب　　میری بدنامیوں سے نام نکالا صاحب

فکر کی میں نے بہت حسن میں تب طاق ہوئے
نئے مضموں کی طرح شہرۂ آفاق ہوئے

سیر پر تم کو نظر تھی نہ تماشے پہ نگاہ　　مثلِ یوسف کبھی دیکھی تھی نہ بازار کی راہ
ماہتابی پہ نہ چڑھتے تھے کبھی شام و پگاہ　　بلکہ خورشید نے دیکھا تھا نہ سایہ اے ماہ

شوقِ خیال طبعِ مبارک میں زنہار نہ تھیں
کھڑکیاں گھر کی کبھی جانبِ بازار نہ تھیں

اب جو ہر بات میں یکتا ہوئے ماشاء اللہ　　عربدہ جو ستم آرا ہوئے ماشاء اللہ
مائلِ سیر و تماشا ہوئے ماشاء اللہ　　غیر ہم غیر احبا ہوئے ماشاء اللہ

جمگھٹے آپ کی محفل میں پڑے رہتے ہیں
منتظر ہم پسِ دیوار کھڑے رہتے ہیں

دل میں سوچو کہ طرحدار بنایا کس نے　　دلربا دیکھے دل لے یار بنایا کس نے
اس طرح کا تمھیں عیار بنایا کس نے　　سارے معشوقوں کا سردار بنایا کس نے

کب سلیقہ تھا تمھیں زینت و زیبائی کا
کس کے صدقے میں یہ شہرہ ہوا رعنائی کا

سارے احسان مرے تا بہ خدا بھول گئے　　بے وفائی پہ چلے راہِ وفا بھول گئے
ذائقہ مہر کا الفت کا مزا بھول گئے　　پچھلی باتوں کو تم اے [illegible] بھول گئے

ان کو دل اور دماغ اور ہے شان اور ہی ہے
آن بان اور زبان اور بیان اور ہی ہے

رات دن صحبتِ اغیار ہے اللہ اللہ
گھر میں ہنگامۂ بازار ہے اللہ اللہ
دل ہیں پامال وہ رفتار ہے اللہ اللہ
دم نکلتے ہیں وہ گفتار ہے اللہ اللہ

آئیں احباب تو کبھی یہ اجازت ہی نہیں
کنگھی چوٹی سے کسی دم تمھیں فرصت ہی نہیں

عام چاہت ہوئی اب عشق کے بیمار ہیں سب
دردِ دل دردِ جگر سوزِ دروں خشکیٔ لب
گرم بازارِ ادا ایسے طبیبوں کے مطب
آنکھیں بیماروں کی ہیں شربتِ دیدار طلب

خوش ادا ساز ہیں بن آئی ہے عطاروں کی
ڈولیاں روز چلی آتی ہیں بیماروں کی

روز چھپ چھپ کے چلے آتے ہیں غیر دیکھے بام
کٹنیاں بھیس بدل کر تمھیں کرتی ہیں سلام
اُن سے ہوتے ہیں اشارے نہیں لگاوٹ کے کلام
حال آئینہ ہے چاہوں تو کہوں نام بنام

خط پہ خط آتے ہیں پوشیدہ نہیں یاروں پر
بیٹھے رہتے ہیں کبوتر تری دیواروں پر

رات دن صحبتِ اغیار رہا کرتی ہے
بزم انھیں لوگوں سے بازار رہا کرتی ہے
طبع تم سے مری بیزار رہا کرتی ہے
گردِ غم بیچ میں دیوار رہا کرتی ہے

خیر کیا واسطہ بہتر ہوا گر چھوٹے تم
ناز اٹھوا کے یہ بیچا کسی مزدور سے تم

ہم سے الجھی ہوئی گفتار ذرا اور سنو
ہم رکاوٹ کے سزاوار ذرا اور سنو

دور غمزے میں یہ سرکار کی دانائی ہے
ایسی چالیں رہیں صاحب کسی ہرجائی ہے

خیر ہمکو جو نہیں پاس ہمارا صاحب
بحرِ الفت سے کیا ہم نے کنارا صاحب
کہیں وابستہ اگر دل ہے تمہارا صاحب
سلسلہ قطع ہے۔ کب ہے یہ گوارا صاحب

آپ کے دل میں محبت کا اگر نام نہیں
خوش رہیں خوش رہو شیدے کو بھی کچھ کام نہیں

بد بلا تم ہو تو ہیں ایک بلاکش ہم بھی
برق وش تم ہو تو پرکالۂ آتش ہم بھی
تم کو پروا نہیں تو تم پہ نہیں غش ہم بھی
ڈھونڈھ لینگے کوئی محبوب پری وش ہم بھی

دل ہے بلبل تو کہاں چہرہ گل رنگ نہیں
پانوں میں لنگ نہیں تنگیِ خد آہنگ نہیں

بہرِ غواص عدن میں دُرِ غلطاں لاکھوں
پھول گلشن میں ہیں جنت قاف میں پریاں لاکھوں
دل ہی دینا ہے جو منظور تو خواہاں لاکھوں
ماہرو زہرہ جبیں مہرِ درخشاں لاکھوں

جمگھٹا کون سی جا ماہ جبینوں کا نہیں
شہر آباد ہے کچھ کال حسینوں کا نہیں

ڈھونڈھ کر کوئی طرحدار نکالوں ایسا
تم بھی دیکھ تو کہو صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ
ذرہ تم سامنے اس کے ہو وہ خورشید لقا
کم نما جیسے بہ خورشید کے پہلو میں سہا

فخرِ خوبانِ جہاں حسن بھی چالاک بھی ہو
اپنے غمزے کی طرح قاتلِ بیباک بھی ہو

سراپا

شعرا کہتے ہیں وہ مانگ ہے سلکِ گوہر — یا کھنچا ہے تہِ شب حسن پہ کوئی خطِ زر
یا یہ ظلمات میں جاری ہوئی نہرِ کوثر — کہکشاں یا شبِ دیجور میں آئی ہے نظر

شانہ کہتا ہے زباں سے یہ نیا پہلو ہے
اُسی کے سر کی قسم صبحِ شبِ گیسو ہے

آفتِ جاں ہیں جو دو گیسوئے رسا ہیں دونوں — دل پھنسانے کے لئے دامِ بلا ہیں دونوں
دیکھ لو سلسلۂ جور و جفا ہیں دونوں — ایک صیاد ہیں ہر چند دوتا ہیں دونوں

دامِ الفت کے ہیں تار انھیں دونوں میں
دونوں عالم ہیں گرفتار انھیں دونوں میں

اس کے بالوں میں ہیں اس طرح پروئے گوہر — نکل آتے ہیں شبِ تار میں جیسے اختر
رہ گئی یا شبِ گیسو تبسم ہو کر — سنبلِ گلشنِ خوبی پہ ہے یا شبنمِ تر

چوٹی میں نقرئی موباف عجب زیبا ہے
دامنِ شب سے گریبانِ سحر ٹانکا ہے

تو ذرا پہلے کرو چہرۂ روشن پہ نظر — بدلے خورشید کے مہتاب سے پیدا ہے سحر
کیا صفائی ہے کہ پانی ہے خجالت سے گہر — معجزِ حسنِ عیاں ہے اتر آیا ہے قمر

لوحِ سیمیں تو اسے کیا۔ یدِ بیضا کہئے
غش نہ آجائے اگر برقِ تجلی کہئے

مطلعِ مہرِ تجلی ہے جبیں پُر نور — کور ہے دیدۂ خورشیدِ فلک جس کے حضور
زرد ہے مارے خجالت کے رخِ شعلۂ طور — دیکھے گر شمعِ رخِ حور و پری ہو کافور

گل خورشید گلستان ضیا ہے وہ جبیں

آبشار عرق شرم و حیا ہے وہ جبیں

ذرے افشاں کے درخشاں نہیں پیشانی پر | شعلہ آتش عارض سے اڑے ہیں یہ شرر
الف آسا جو کشیدہ ہے خط قشقۂ زر | خط ردیہ یہ پئے وصف خورشید و قمر

ذرے افشاں کے جبیں پہ جو دمکتے دیکھے

اختر طالع خورشید چمکتے دیکھے

ساغر بادۂ گلنار ہے آنکھوں پہ نثار | مستی حسن سے سرمست ہوئے ہیں سرشار
ڈورے آنکھوں میں نہیں جمع ہوئے ہیں مے خوار | صاف ہے چہرہ رنگیں پہ گلستاں کی بہار

مست سمجھیں جو وہ آنکھیں نظر آئیں کالی

گھر کے آئی ہیں گلستاں میں گھٹائیں کالی

انکھیں آنکھوں کی تو ہے نرگس شہلا بیمار | انکھیں آنکھوں پہ تو بادام ہے سو جان سے نثار
جام کہہ کہکے ہوئے مست ہزاروں ہشیار | جام مے زہر ہلاہل سے ہیں دونوں سرشار

زیست سے ہاتھ وہ دھوئے جو یہ ساغر پائے

ساغر عمر ہو لبریز ابھی بھر جائے

خضر دیکھے تو کہے ہیں قدح آب حیات | بہر عاشق ہیں مگر ساغر سم جام ممات
کہے کالی جو گھٹا صاف ہے یہ نقص صفات | چہرۂ خورشید ہے اظہر من الشمس یہ بات

دیدۂ شوخ سیہ مست نشہ متوالے ہیں

کھل گیا دھوپ کی گرمی میں یہ کالے ہیں

توسن طبع ہمارا ابھی ہے کیا زور آور | چشم وحشی کی صفت میں نہیں کرتا د

گردشِ چشمِ سیاہ و مژہ جاناں پر — پھبتی اک ور سناتا ہے یہ نیروں اُڑ کر

کسی صیاد نے برچھوں میں ہرن گھیرے ہیں

جو کڑی پھرنے پہ آمادہ ہیں رخ پھیرے ہیں

طرفہ آفت ہے بلا ہے نگہِ افسوں ساز — غیرِ اعجاز نہیں ہے کوئی اس کا ہمراز

وقتِ نظارہ بھی باقی ہے حیا کا انداز — آنکھ اُٹھا کر کبھی دیکھا تو کئے سیکڑوں ناز

واہ کیا سرمے کے دنبالے سے بھی کام لیا

چشمِ بیمار جو اُٹھی تو عصا تھام لیا

وصف وہ کیجئے چشم و مژہ و ابرو کا — جو سنے صاف کہے صلِ علی صلِ علی

موئے مژگاں نہیں آنکھوں پہ یہ ہیں دستِ دعا — زیرِ محراب اُٹھائے ہیں بامیدِ شفا

جنبشِ ہر مژہ آفت ہے خدا خیر کرے

نبضِ بیمار کو سرعت ہے خدا خیر کرے

تیزیِ موئے مژہ میں ہے بھلا کس کو کلام — پردۂ دیدہ یا دامِ مشبک ہے تمام

کبھی فصّاد اگر خواب میں لے اس کا نام — ہر رگ جو ہر نشتر سے لہو آئے مدام

عاشقِ سوزنِ مژگاں جو کوئی ہوتا ہے

سفتہ آتے ہیں دُرِ اشک اگر روتا ہے

واہ کیا ابروئے خمدار ہے سبحان اللہ — قدرتی حسن کی تلوار ہے سبحان اللہ

عید کا چاند نمودار ہے سبحان اللہ — یہ کمان طرفہ دو ہواں دھار ہے سبحان اللہ

گر مرقع میں بھی اس تیغ کی تصویر کھنچے

شر بڑھے مانی و بہزاد میں شمشیر کھنچے

ایسا مضموں نہ بندھے کہ ابروئے ہیں کاکہ واہ | نوبتیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
چاندنی رات ہے افشاں ہے وہ گیسوئے سیاہ | دیکھتے ہوں جیسے تارے وہ کرے خوب نگاہ

واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویروں کے
دیکھو نکلی ہے زرہ سائے ہیں شمشیروں کے

عارض صاف نہیں شمس و قمر ہیں دونوں | صاف آئینے سے بھی پیش نظر ہیں دونوں
رنگ ہیں لعل صفائی میں گہر ہیں دونوں | دو ہیں شمعیں کہ ادھر اور ادھر ہیں دونوں

عکس اگر آئنے میں نور فشاں ہو جائے
دیکھنے والوں کو چومک کا گماں ہو جائے

واہ کیا پنجۂ پر نور ہے سبحان اللہ | پنجۂ شانے سے تو تشبیہ نہیں ہے دلخواہ
دیکھو تو پنجۂ خورشید ہے یہ پیش نگاہ | انگلیاں خط شعاعی سے بھی باریک ہیں واہ

دور ادب سے ہے جو پنجہ آیت اقدس کہیے
انگلی اٹھے تو ہلالی کا مخمس کہیے

حلقۂ ناف نہیں ہے گرہ موئے کمر | دل عاشق کے ڈبونے کے لئے ہے یہ بھنور
ذرہ کیا حلقہ بگوش اس کے ہیں خورشید و قمر | دل کو تشبیہ نئی اور ہے منظور نظر

صاف آئینہ ہے اس کا شکم صاف نہیں
عکس ہے چاہ زنخدان کا پڑا ناف نہیں

ران کے وصف میں ہر چند ہے شفاف بیاں | صفائی ہے یہاں تک کہ پھسلتی ہے زباں
ساق یا شمع ہے ایسی نہیں جسمیں ہو دھواں | شمع مہتاب میں اس طرح کی تنویر کہاں

مثل پروانہ وہ ہے کون جو مشتاق نہیں

شمع فانوس میں ہے پائنچے میں ساق نہیں

ہاے نازک ہے وہ نازک صفت پا ہے خیال
سجدہ کرتے ہیں جسے دیکھ کے زہرہ تمثال

کف پا صورت عناب ہیں ناخن ہیں ہلال
نقش پا طرفہ دکھاتے ہیں سراپا کمال

خوبصورت یہ دم جلوہ گری بنتے ہیں
دیدہ حور کبھی چشم پری بنتے ہیں

راست ہے مثل الف بسکہ وہ قدِ بالا
دال میں جیسے الف دل میں ہے یوں اسکی جا

دل بنا دال تو ہے دال کہو جان فدا
شک نہیں ثابت اسے تل کے تصور نے کیا

تل سویدا ہے تو پھر رنگ نرالا کچھ ہے
جان کی خیر نہیں دال میں کالا کچھ ہے

واسوخت کے یہ اشعار جو نقل کئے گئے ہیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں اسی شان اور اسی رفعت کے صدہا بند اور صدہا مضامین تازہ بخوف طوالت چھوڑ دئیے گئے ہیں۔ بالخصوص متعدد سراپا ہیں وہ وہ جدت طرازیاں ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گویا ایک بحر ذخار ہے جس سے گوناگون موجیں اٹھ رہی ہیں جو دیکھنے والوں کو غرق حیرت کر دیتی ہیں۔

اب میں اس حصۂ کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ ابھی حضرت امیرؔ کے بہت سے تصانیف ہیں جن کا ذکر کرنا اور جن کے نمونے ناظرین کے سامنے لانا باقی ہے۔ انشاء اللہ اُس حصے کو بھی جلد مرتب و مکمل کر کے شائع کر دونگا تاکہ مزید وضاحت ہو جائے کہ حضرت امیرؔ نے اپنی زندگی میں کیا کیا کام کئے ہیں اور اُن کی ذات ملک کے لئے کس درجہ فیض رساں تھی۔ علاوہ بریں بعض سربرآوردہ شاگردوں کا ذکر بھی ضرور ہے تاکہ یہ بات بھی روشن ہو جائے کہ حضرت امیرؔ کے پرتو فیض نے کیسے کیسے خورشید و ماہ چمکائے ہیں۔

اِس کتاب میں اب تک صرف سات تصانیف پر ریویو کیا گیا ہے۔

دیوان مراۃ الغیب — گوہر انتخاب (بیاض مفردات) — دیوان صنمخانۂ عشق

جوہر انتخاب (بیاض مفردات) — محامد خاتم النبیین (دیوان نعت) — قصائد

مجموعۂ واسوخت۔

باقی جن پر ریویو نہیں ہوا وہ تصانیف حسب ذیل ہیں۔

صبحِ ازل — شامِ ابد — لیلۃ القدر — ذکر شاہِ انبیا

مثنوی نور تجلی — مثنوی ابرِ کرم — مثنوی قصۂ اویس قرنی — مثنوی قصۂ شہدائے رسول

مسدسات مدحیہ — مخمسات نعتیہ وغیرہ — ترجیع بند نعتیہ وغیرہ — تاریخی قطعات

رباعیات — سہرے — ہدایۃ السلطان — ارشاد السلطان

نغمۂ قدسی شرح صلوٰۃ المبارک — خیابانِ آفرینش (رسالۂ میلاد شریف) — سرمۂ بصیرت — نماز کے اسرار

زاد الامیر — وظیفۂ علیلہ — رمز الغیب (جفر) — رموز غیبیہ (جفر)

امیر اللغات — جانِ تاریخ — محاورات مصادر اردو — بہارِ ہند (لغت اردو زبانِ فارسی)

تذکرہ انتخاب یادگار　　خطوط　　ست سیا بہاری (ہفت سو ہندی اشعار کا ترجمہ)

دیوانِ فارسی۔

اس جگہ اتنا ذکر کر دینا مناسب ہے کہ حضرت امیر جس طرح اردو میں لطیف و بلیغ شعر کہتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی کہتے تھے۔ خاتمہ پر بغرض اختتامیہ اردو و فارسی کی ایک ایک غیر مطبوعہ غزل درج کی جاتی ہے۔

غزل اردو

تو جہاں بن ٹھن کے نکلا خلق دیوانی ہوئی　　جامہ زیبی سے تری کس کس کی عریانی ہوئی

کب نگاہوں سے تری ظاہر پشیمانی ہوئی　　ہیں یہ سب گلیاں مری دیکھی ہوئی چھانی ہوئی

پاکدامن ہو گئے آنسو سے تر دامن ترے　　اس نمک کی کنکری سے ساری جو پانی ہوئی

جب ہوئی وحشت ترے کوچے ہی میں تنکے چنے　　خاک بھی سر پر وہی ڈالی جو تھی چھانی ہوئی

اللہ اللہ کس قدر ہے اتحادِ حسن و عشق　　بال ادھر بکھرے ادھر دل کو پریشانی ہوئی

رات بھر شبنم سے ہم آغوش رہ کر کیا ملا　　مفت گل پر تہمت آلودہ دامانی ہوئی

عصمتِ یوسف نے اچھا گل کھلایا مصر میں　　پاکدامانی سے پیدا چاک دامانی ہوئی

حالِ دشمن پر بھی دل دکھتا ہے اہلِ درد کا　　زخم رو دے تیغ قاتل کی جو عریانی ہوئی

مجرموں کو دیکھکر آغوشِ رحمت میں امیر　　بیگناہوں کو قیامت کی پشیمانی ہوئی

غزل فارسی

خنجرِ ناز نیاید جگرے بہتر ازیں　　اے بقربانِ تو ظالم نظرے بہتر ازیں

سرِ پائے تو ہم نیست سرے بہتر ازین
روم از خویش نباشد سفرے بہتر ازین

بوسہ دادی و لبِ خویش مکیدی از ناز
اے شکر لب بواسے دگرے بہتر ازین

در چمن رفتی و ہر گل بگلِ دیگر گفت
کہ ندیدم گلِ نازک کمرے بہتر ازین

ہر چہ از بسمل تو در روزِ جزا پرسیدند
او ہمان گفت کہ زخمے دگرے بہتر ازین

بر درِ دل بنشین پائے منہ بر درِ کس
دولت ار میطلبی نیست درے بہتر ازین

یار سرمست و ہوا سرد و مے ناب بجوش
ساقیا باز نیابی سحرے بہتر ازین

نگہے کردی و دل بردی و جانم باقیست
جانِ من گردِ تو گردم نظرے بہتر ازین

بیخودی برد بسر منزلِ مقصود امیر
نیست در راہِ جنون راہبرے بہتر ازین

تمام شد

۲۲ شعبان المعظم ۱۳۴۷ھ